www.facebook.com/kurf.ku
1
www.kurfku.blogspot.com
آگ کا دریا
جلد دوئم
قرۃ العین حیدر
KURF
جامعہ کراچی دارُالتحقیق برائے علم دانش
KURF: Karachi University Research Forum

جامعہ کراچی دارالتحقیق برائے علم و دانش



ناول

# آگ کا دریا

از

## قرۃ العین حیدر

بشکریہ

اقبال سائبر لائبریری

تعارف،سرورق،ترتیب و پیشکش

**محمد علی جنید**

www.facebook.com/kurf.ku
www.kurfku.blogspot.com

جامعہ کراچی دارالُتحقیق برائے علم و دانش

Karachi University Research Forum

# تعارف

از:محمد علی جنیدَ:ریسرچ اسکالر،شعبہ سیاسیات،جامعہ کراچی۔

قرۃ العین حیدر کا نام اردو ناول نگاری میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے لکھنوی تہذیب کے ضمن میں انکی تحریریں لکھنو کی اگر چہ یادیں اور تاریخ تو ضرور یاد دلاتی نظر آتی ہیں ، مگر ان میں جو امر انھیں منفرد بناتا محسوس ہوتا ہے وہ انکا سلیس ،آسان اور عام فہم انداذ ہے جس میں لکھنوی ادب و طرز کلام کے برخلاف سلاست،روانی،ربط و ضبط کا پایا جانا ہے،لکھنوی میں نے اس لئے کہا کہ انکی تحریروں میں لکھنو ،اسکے نوابوں انکی تشیعت کی بابت اشارے وہ گفتگو اکثر چھلکتی نظر آتی ہے ،اور خصوصاً آگ کا دریا میں ایسا اکثر نظر آتا ہے،اور خود انکی بھی اہل تشیع حضرات سے وابستگی کا اتا پتا معلوم ہوتا ہے،مگر کہیں بھی وہ عقائیدی تعصب کی خبر لگنے نہیں دیتی ہیں ہاں جدید نسائیت ،لبرل فکر کی طرف انکا جھکاو واضح لگتا ہے۔

اس پیرائے میں انکی بھلے لکھنو سے انسیت رہی ہو مگر انکا طرز کلام جدید دھلوی انداز کا طرزِ کالم نظر آتا ہے،مگر بحر حال وہ مولد کے لحاظ سے یو۔پین و علیگڑھی ہیں اور فکری لحاظ سے لکھنوی۔

انکا تعارف کرانا میں ضروری جانتا ہوں کیونکہ اس سے انکے پس منظر کا اندازہ قایم کرنا آسان محسوس ہوگا،جہاں تک خاندان کا تعلق ہے تو واضح رہے کہ انکا خاندان اردو ادب میں ایک معروف خاندان تھا بلخصوص افسانے اور مختصر کہانی نویسی میں جانا مانا جاتا تھا ۔

حیدر، مرحوم سجاد حیدر یلدرم (۱۸۸۰ تا ۱۹۴۳) کی دختر تھیں ،جنکا شمار برصغیر کے اولیں ،افسانہ اور مختصر کہانی نویسوں میں کیا جاتا ہے،خود سجاد حیدر کی زوجہ اور قرۃ العین کی والدہ محترمہ بھی اول اول بنتِ نظرالباقر اور نظر سجاد ظہیر (۱۸۹۵ تا ۱۹۶۷ ) کے قلمی نام سے لکھا کرتی تھیں ،اس ضمن میں وہ ناول نگاری میں محمدی بیگم اور ممتاز علی کے زیر تربیت بیان کی جاتی ہیں۔

قرۃالعین حیدر (۱۹۲۷ تا ۲۰۰۷) بمقام علیگڑھ،اتر پردیش (یو ۔پی) میں پیدا ہوئیں اور بمقام نوئڈا انکا ارتحال ہوا،اندر پرستھ ،کالج اور جامعہ الہٰ آباد کو انکے مادر علمی ہونے کا شرف حاصل ہے،انھونے مختصر کہانی نویسی اور ناول نگاری میں اردو ادب میں اپنا لوہا منوایا،انھونے قریباً بارہ کے قریب ناول و ناولٹ تحریر فرمائے جبکہ چار مختصر کہانی کے مجموعے بھی انکے طبع ہوئے انکا سب سے عظیم شاہکار آگ کادریا نامی ناول ہے جو تین جلدوں میں طبع ہوا:

**انکی خاص الخاص تحریریں درج ذیل بیان کی جاتی ہیں :**

| عدد | ادبی کارنامے | سنہ |
|---|---|---|
| ۱ | آگ کا دریا | |
| ۲ | میری بھی صنم کہانی | ۱۹۴۹ |
| ۳ | سفینا ئے غمِ دل | ۱۹۵۲ |
| ۴ | پتجھڑ کی آواز | ۱۹٦۵ |
| ۵ | روشنی کی رفتار | ۱۹۸۲ |
| ٦ | مختصر ناول :چائے کا باغ | ۱۹٦۵ |
| ۷ | exploring gender injustice ،دلربا، سیتا ہرن، اگلے جنم موہے بیتیا نا کیجیو: نامی ناولٹ وغیرہ | |
| ۸ | خاندنی تاریخوار آب یتی:جہاں دراز ہے، | |
| ۹ | ۱۸۵۷ کے پس منظر میں شرفا کے خاندانوں کے عورتوں کی حالتِ ذار پر ایک ضخیم دستاویزی ناول بنام :کارِ جہاں دراز ہے | |
| ۱۰ | آخری شب کے ہمسفر:جسمیں بنگال اور نکسال بغاوتی نما تحریکِ آزادی کو بیان کرتی منظر کشی عیاں کرتا ناول | |
| ۱۱ | چاندنی بیگم :تقسیم کے چالیس سالوں کے نسائی پسِ منظر کو عیاں کرتا ناول | |
| ۱۲ | میرے بھی صنم خانے :اولیں ناول | |
| ۱۳ | انھونے کم عمری میں بچوں کے ادب کے ضمن میں بی چوہیا نام ایک کہانی بھی رقم بند فرمائی تھی | |

**انھیں انکی خدمات کے ضمن میں جن اعزازات سے نوازا گیا ان میں خاص الخاص درج ذیل ہیں :**

| عدد | ایوارڈ | سنہ |
|---|---|---|
| ۱ | جنپتھ ایوارڈ برائے آخری شب کا ہمسفر | ۱۹۸۹ |
| ۲ | ستھیا اکیڈمی ایوارڈ | ۱۹٦۷ |
| ۳ | سویت :نہرو ایوارڈ: | ۱۹٦۹ |

| ۴ | غالب ایوارڈ | ۱۹۸۵ |
|---|---|---|
| ۵ | ستھیا اکیڈمی ایوارڈ:برائے :پتجھڑ کی آواز:ضمن :مختصر مجموعہ کہانی نویسی | ۱۹٦۷ |
| ٦ | اردو اکیڈمی:بہادر شاہ ظفر ایوارڈ | ۲۰۰۰ |
| ۷ | بھارتی حکومتی:پدما شری ایوارڈ | ۱۹۸۴ |
| ۸ | بھارت کے تیسرے سب سے بڑے سول اعزاز:پدما بھوشن | ۲۰۰۵ |
| | | |

**انکی پیشہ وارانہ خدمات ادب،تعلیم اور صحافت تک محیط نظر آتی ہیں :**

| | خدمات | سنہ |
|---|---|---|
| | انتظامی ایڈیٹر :رسالہ :امپرنٹ [1] :بمبئی | ۱۹۶۴..۱۹٦۸ |
| | رکن مجلس ایڈیٹوریل :السچریٹیٹ ویکلی آف انڈیا[2] | ۱۹٦۸..۱۹۷۵ |
| | تعلیم: | |
| | جزوقتی مہمان لیکچرار[3]: جامعات:جامعہ کیلیفورنا،جامعہ شکاگو،جامعہ وسکونسن ،اور جامعہ ایریزونا | |
| | دورہ جاتی پروفیسر [4]برائے شعبہ اردو،جامعہ علیگڑھ ۔بھارت | |
| | پروفیسر ایمرٹس [5] :خان عبدالغفار چییر :جامعہ ملیہ،نئی دھلی | |
| | بین الاقوامی تحریری پروگرام:ریزیڈنٹس[6] | ۱۹۷۹ |

انھونے اگر چہ اپنے خاندان کے ساتھ پاکستان ہجرت کی تھی اور اسکے لئے دلایل بھی دئے تھے جیسا کے آگ کا دریا میں انھونے آخری صفحات میں اس امر کی تصویر کشی بھی کی ہے ،اور وہاں پر رہ جانے والوں کی مالی و سماجی حالتِ زار پر بھی روشنی ڈالی ہے مگر لگتا ہے پاکستان مین چلتی تعصبانہ ،لسانیت،و صوبائیت ،ذہنی

[1] **Imprint.**
[2] **Illustrated weekly of India.**
[3] **Visiting Lecturer**
[4] **Visiting professor**
[5] **Professor Emeritus**.
[6] **Resident.**

صـــــورتحال و جمود کے ســـــبب انھونے واپس بھارت جانے کو ترجیع دی،کچھ انک دلی وابستگی بھی اجداد کی سرزمیں سے تھی۔

کچھ عرصہ انگلستان میں بھی رہایش پزیر رہھیں جیسا کہ انکا کردار روپا بھی انگلستان کی فضـاوں میں بسلسلہ تعلیم اور فکری غذا کے لئے سـرگرداں نظر آتی ہے ،کچھ انکی طبیعت کی تیزی،انا پرستی،یا اصول پسندی کی روش کے سبب ان میں خاص حریت نمایاں رہی ہے جســـکا ایک اثر روپا کے کردار میں نظر آتا ہے جو چار اہم کرداروں میں ســـــے واحد مگر اہم نسائی کردار ہے جو آگ کا دریا میں نظر آتا ہے۔

یہ ناول ایک دیو مالائی ناول ہے جسکا آغاذ قبل تاریخ چوتھویں یا پانچویں قبل مسیح کے ہندوستان سے ہوتا ،جہاں وہ چندرگپت موریا،اور چانکیہ کا ضمناً تذکرہ کرکے کرداروں کو ارتقائی طور پر تقسیم پاکستان تک چار کرداروں کے ضـمن میں دکھاتی نظر آتی ہیں ،اور یہ چار کردار،کمال الدین،روپا،سیرل صاحب،اور گوتھم کے ہیں اس ناول میں جا بجا ہندو دیومالائی رنگ،ہندوی فسلفہ،واحدۃ الوجود،تصوف،تاریخ کو اپنے پلاٹ کے ضـمن میں پیش کرکے اپنے کرداروں کا مختلیف وقتوں میں ارتقا کرتا دکھایا گیا ہے یہاں تکہ تقسیم ہوکر ہندوستان، پاکستان و ہندوستان میں منقسم ہوجاتا ہے ہر کوئی اپنی اپنی دنیا میں مست زمانے میں ضم ہوجاتا ہے سوائے ان چار کرداروں کے۔

روپا اور اسکے کرداروں کےضمن میں لگتا ہے روپا کے کردار کی اصل قرۃ العین حیدر ا پنے کسی کزن سے عشق تھا جس سے وہ ذہنی ہم آہنگی کا نا ہوسکی یا انکو غالبا انا کی روپائی فکر، انکی کچھ مجبوریوں کے سبب وہ شادی نا کرسکیں اور کنواری رہ گئیں مگر ،ہمیں اسکے حقیقی ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا بس اتنا ہے کے خاندانی خود نوشـتوں اور کرداروں کی کچھ اصـل پر شــک بھی ہوتا ہے ،ظاہر ہے تخیلی کرداروں کی کچھ نا کچھ اصل موضوعیت کے ضمن میں خالق تحریر کے اذہان میں پس پشت کرداروں کاتعین کرتی رہتی ہے ۔

میں یقین سے تو دعوئٰ نہیں کرسکتا نا میں کوئی ادیب یا اردو ادب کا ناقد ہوں اور نا میرا اس قسم کا سرے سے دعوئٰ ہے مگر آج جو اردو پاکستانی ادب جسکا چلن یہاں عام ہے وہ تاریخی و دیومالائی ناول ہیں جن میں ایک عجب سا سحر ،جاذبیت،پرسرارئیت

ارتقا ملتا ہے جس کی ایک پوری ادبی فصل یہاں تاریخی و دیومالائی ناول نگاری کے ضمن میں انوار صدیقی، قمر اجنالوی، اسلم راہی، ایم۔ آصف،ایم۔اے۔راحت جیسوں کی صورت میں نظر آتی ہے اسکی اصل روح کہیں نا کہیں آگ کا دریا سے اخذ کردہ ہے۔

خود میں نے آگ کا دریا کچھ سال قبل اس تجسس کے ساتھ پڑھا تھا کہ اس میں ایسا آخر کیا ہے کہ اتنی واہ واہ کی جاتی ہے،جبکہ مذکورہ بالا ناول نگاروں کو میں اپنی کم عمری میں پڑھ چکا تھا۔

مگر آگ کے دریا کا تقدم زمانی اور انداز بیان مجھ کو یہ ادراک کرواگیا کہ ان سب کی ممکن ہے کہ اصل حیدر صاحبہ کی ہو ،کرف کے تحت اگر چہ ہم نے جدیدیت،فلسفہ،علم کلام،معاشرتی علوم ،معاشیات و سیاسیات کے میں ۲۰۱۶ میں کئی برقی مطبوعات پیش کیں تھیں ،مگر میں اپنے مزاج ،مذہبیت،اور علمی تحقحقات کے ساتھ ساتھ اردو ادب کے فروغ میں بھی دلچسپی کو بھی پس پشت نہیں ڈال سکتا تھا ۔

جبھی فکر ساز ادبی کتب و تراجم کو بھی پیش کرنے کا سلسلہ قایم کیا اور ۲۰۱۷ میں قرۃ العین حیدر کی یہ کتاب مذہبی،فکری،اختلاف جدیدیت،الحادیت ،مغربیت کے خلاف ہمارے جہاد کے باوجود نسائیت ،جدید دور کی عورت کی فکر ،ذہنی پرواز،قدامت سے جدیدیت کی طرف سفر اور ماضی سے عشق کو عیاں کرتی ہے جبھی اس ضمن میں ادب کو پڑھنا لازمی ہے ،لکھنے،پڑھنے،بولنے ،تہذیب کے سیکھنے اور تخیل کی پرواز کا اندازہ کرنے کے لئے ادب کا مطالعہ لازماً کرنا چاہئے یہ کوئی مذہبی صحیفہ نہیں ہے جبھی اس سے مذہبی مواد و عقاید کی توقع بھی وابستہ نا کی جائے،اسے ادب ہی کی طرح لیا جائے اور ادب کی طرح پڑھا جائے۔

مجھے کئی اہل علم نے بتایا ہے کہ خود عربی و فارسی قدیم ادب میں بھی عشق و محبت ،رزم و بزم ،فطرت کی تصویر کشی کے ضمن میں ایسی ایسی تحریریں ملتی ہیں جنکو شاید کوئی مذہبی پیرائے میں انھیں فحاشی و عریانی،اور جزبات کو برانگیختہ کرنےوالا گردانے ، مگر انکا ادبی مقام مسل ہے اور علما بھی اکثر صرف و نحو،اشعار ونثر کے ضمن میں ان سے دلایل لیتے ہیں ،امرا و لقیس یا لیلی و مجنوں ،یا سبعہ معلقات میں بھی ڈھونڈنے کو بہت کچھ مل جاتا ہے۔

متبنی کا کلام بھی ایسے اشارے دے جاتا ہے باقی،حافظ،خیام،رومی سے بھی یہ سب ڈھونڈنھے سے مل جائیگا بس فکر و نظر کا اختلاف ان میں اپنا اپنا مطلوب ڈھونڈھنتا ہے۔

قرۃ العین حیدر کی یہ تحریر تین جلدوں میں پیش کی جارہی ہے ،اور میں دقیق و مشکل ،بے کیف فلسفیانہ فکر کے ساتھ ساتھ ادب کو بھی ذہنی سکون کے لئے ایک ذہنی دوا و طریقہ گردانتا ہوں ۔

اس تحریر سے خیر مصنفہ کی نسائیت سے وابستگی کے ساتھ ساتھ اجداد و اکابر کی فکر سے عشق و وابستگی بھی چھلکتی نظر آتی ہے ،اس میں جو آواگون کے تحت چار کردار دکھائے گئے ہیں، انھیں تخیل کی پرواز تک ہی محدود کرکے مذہبی عقائید کی فکر و نقد سے دور رکھیں تو بہتر ہوگا۔

اور بستـــر پر دراز خود کو بس گنگا جمنا کے دیس میں ملاح کے چلتے چپووں کے زیر سـایہ کشـتی پر دراز دیکھیں اور پانی کی چھینٹوں سـے دامن بچائیں رکھیں اور اسـکی چاشنی و شیرنی کے ساتھ ساتھ ہلکا ہلکا غم اسکے کرداروں کی صورت میں محسوس کریں۔

قرۃ العین حیدر کو سب پیار سے عینی آپا کہتے تھے،وہ ۲۰۰۷ مین بمقام نوئیڈا بعارضہ مرض جگر انتقال فرماگئیں اور انھیں جامعہ ملیہ دھلی کے قبرسـتان میں سـپرد خاک فر مایا گیا:

ذیل کے کچھ نمونے انکے اس شـاہکار آگ کا دریا کے کرداروں کے مختصـر پہلووں کے ساتھ ساتھ انکے طرز کلام کی عکاسی کرتے نظر آئینگے :

## جلد اول: آغاز:

گوتم نیلمبر نے چلتے چلتے پیچھے ٹھٹھک کر دیکھا، راستے کی دھول بارش کی وجہ

سے کم ہوگئی تھی، گو کہ اس کے اپنے پاوں مٹی سے اٹے ہوئے تھے..برسات کی وجہ سے گھاس اور درخت زمرد کے رنگ کے دکھلائی پڑ رہے تھے، اسوک کے نارنجی اور سرخ پھول گہری ہریالی میں تیزی سے جھلملاتے تھے اور ہیرے کے ایسی جگمگاتی پانی کی لڑیاں گھاس پر ٹوٹ کر بکھر گئی تھیں..ندی کے پار پہنچتے پہنچتے بہت رات ہو جائے گی..گوتم کو خیال آیا گھاٹ پر کشتیاں کھڑی تھیں..اور برگد کے نیچے کسی من چلے ملاحنے زورزور سے ساون الاپنا شروع کردیا تھا، آگے جھرمٹ میں ایک اکیلا مور پر پھیلائے کھڑا تھا، شراوتی یہاں سے پورے پچیس کوس دور تھا اور گوتم نیلمبر کو ندی تیر کر پر کرنی تھی گھاٹ پر تین لڑکیاں ایک طرف بیٹھی باتیں کررہی تھیں، ان کے ہنسنے کی آوازیں یہاں تک آرہی تھیں، لڑکیاں کتنی باتونی ہو تی ہیں، گوتم نے سوچا، انہیں بھلا کونسے مسئلے حل کرنے ہیں، اس کا دل چاہا کہ نظر بھر کرانہیں دیکھ لے....خصوصا اس کیسری ساڑھی والی کو جس نے بالوں میں چمپا کا پھول اڑس رکھا تھا..اسکے ساتھ نچلی سیڑھی پر جو لڑکی آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی ..اسکے گھنگھریالے بال تھے اور کتابی چہرہ اور جڑی ہوئی سیاہ بھنویں..قریب پہنچکر گوتم نے ان دونوں کو لحظہ بھر کے لیے دھیان سے دیکھا اور پھر جلدی سے نظریں جھکا لیں گھاٹ کی آخری سیڑھی پر پہنچ کر اس نے تیزی سے چھلانگ لگا دی اور دوسرے کنارے کی طرف تیرنے میں مصروف ہوگیا

لڑکیوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا کوئی ودیارتی تھا جان پڑتا ہے، ان میں سے ایک نے کہا..ملاح اپنی اپنی ڈونگیوں میں بیٹھے ہوئے مسافروں کا انتظار کرتے رہے، کشتیاں جو برگد کے سائے میں بندھی تھیں ان میں چولہے روشن کیے جا چکے

تھے اور رات کا کھانا بننا شروع ہو چکا تھا

ٹپ سے بارش کا ایک قطرہ چمپا کے بالوں پر آن کر گرا، اس نے ندی کی اور دیکھا جدھر وہ اجنبی طالب علم نہروں کے خلاف ہاتھ پاؤں مارتا کسی انجانی سمت جا رہا تھا

**ایک جگہ لکھتی ہیں کہ :**

لیکن گوتم اپنے گرو کا نہایت فرمانبردار اور عقیدت مند چیلا تھا اور گرو کے احکام کی تعمیل کرنا اس کا ایمان تھا لہٰذا جب کبھی وہ شراوستی کے ناچ گھر یا قمار خانے کی عالی شان عمارت کے سامنے سے گزرتا تو اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا کرتا

**دوسری جگہ رقمطراز ہیں کہ :اور بدھا کے طرف اشارہ دیتی ہیں؛**

سارے ملک میں مختلف حیثیتوں کی حکومتیں موجود تھیں..جنوب کے راجہ بھوج کہلاتے تھے...شمال کے وِراٹ اور مغرب کے سوراٹ لیکن سامراجیہ کی داغ بیل مگدھ میں پڑنی شروع ہو چکی تھی..یہاں کے بادشاہ مدتوں سے سمراٹ کہلا رہے تھے..جس عالمگیر قومیت اور شہنشاہی کے تصور کا ذکر نیتی شاستروں میں کیا جا رہا تھا ..اس کو قائم کرنے کے لیے کوئی ایکرٹ بادشاہ جو کہ سارے ملک کا بادشاہ ہو ابھی تک پیدا نہیں ہوا تھا..چکرورتی بادشاہ....جس کی مملکت کے ساتھ رتھ کا پہیہ بغیر کسی رکاوٹ کے چلتا رہے

اور شاکیہ منی نے کہا تھا...میں شہنشاہ ہوں اے سیلا...میں نے اچھائی کے رتھ کا چکر چلایا ہے....

**<u>بعد ازاں وہ ایران کی تاریخی حقیقت و قدامت کا حال بیان کرتی ہیں :</u>**

ایرانی سلطنت بہت زبردست تھی...اتنی زبردست کے ایک لمحے کے لیے بھی اسے احاطہ تصور میں نہ لایا جا سکتا تھا...اس سامراج میں مصر اور بابل اور شام اور ایشیائے کوچک اور یونان کے شہر اور جزیرے اور سپت سندھو کے اترا پتھ صوبے سبھی شامل تھے اور سر یوش کے بعد دارا نے کہا تھا..میں دارایوش ہوں..شہنشاہ..شاہوں کا شاہ..ملکوں کا بادشاہ جن میں بھانت بھانت کے انسان بستے ہیں...اس وسیع و عریض زمین کا حاکم...گشتاسپ اک بیٹا..ایرانی...ایرانی کا بیٹا..آریہ...آریہ گھرانے کا فرزند...اور اس کے جہازوں کے بیڑے مقدس سندھو کی لہروں پہ تیرتے تھے...

اور دارایوش اول کے بیٹے ارتخشیر نے اترا پتھ کی ان مقبوضات کے متعلق فخریہ اعلان کیا تھا....یہ علاقے جہاں دیو پوجے جاتے تھے...اہورمزدہ کی خواہش کے مطابق میں نے ان دیوں کے مندروں کی بنیادیں ہلا دیں...

**اب اچانک سے تاریخی جست لگا کر وہ کمال الدین کے کردار کے ساتھ چپما کو دکھاتی نظر آتی ہیں ؛**

''جانتی ہوں مگر پھر یہ تلوار کیوں باندھتے ہو۔۔یہ بڑی خوفناک چیز ہے۔''

''چمپا رانی اسے مردوں کا زیور کہتے ہیں۔اس کے اور پگڑی کے بغیر لباس مکمل نہیں ہوتا۔تم اودھ والوں نے افسوس کہ چتوڑ اور قنوج اور مالوے اور بندھیل کھنڈ کے راجپوت نہیں دیکھے۔دیکھے ہیں کبھی! ایک مرا یار ہے اودے سنگھ راٹھور۔قنوج کا راجپوت ہے۔کیا بانکا آدمی ہے۔آج کل جانے کہاں ہوگا۔سنا تھا گوالیر کے کرت سنگھ کی فوج میں ہے۔پتا نہیں شاید مالوے میں کہیں لڑ بھڑ رہا ہوگا۔'' کمال الدین چند لمحوں کے لیے اپنے میدان جنگ کے ساتھیوں کی یاد میں ڈوب گیا۔''تم پورب والوں کا اس کے سوا اور کوئی مشغلہ نہیں کہ بس گائیں بجائیں گے، پوجا پاٹ میں لگے رہیں گے۔ارے لڑکی زندگی کا اصل لطف تو میدان جنگ میں آتا ہے۔''

''ابھی تو تم کہتے تھے کہ مارنا مرنا خالی افغانوں کا کام ہے۔تم کو پتا لکھتے ہو۔''

وہ جھنجھلا گیا:''تم عورتوں سے بحث کون کرے۔'' اس نے امرتیل کا ایک پتا اور توڑا۔

''دیکھو'' لڑکی گھاٹ پر سے اٹھی اور اپنے سیاہ لمبے بالوں میں سے پانی جھٹک کر ان کا جوڑا بناتے ہوئے بولی۔''جنگ کی باتیں مت کیا کرو۔میں جب تم کو دیکھتی ہوں اور یہ تلوار دیکھتی ہوں تو مجھے بڑا وہم آتا ہے۔''

وہم۔۔وہ کیا چیز ہے؟''

**<u>کمال الدین کے کردار کو گنگا جمنا کی سرزمین میں عربی مولد سے دور یوں بیان کرتی ہیں :</u>**

ابوالمنصور کمال الدین، جو پہلی دفعہ بہرائچ آیا تھا، سالار مسعود کی زیارت گاہ کی دیوار سے لگ کر درخت کے سائے میں بیٹھ گیا اور اچنبھے سے عورتوں کی ایک ٹولی کو دیکھنے لگا جو ہاتھوں میں پیتل کی تھالیاں سنبھالے سامنے مزار پہ چڑھاوا چڑھانے کے لیے آ رہی تھیں۔ یہ ہندو عورتیں تھیں۔

اور گوتا لندہ اور وکرم شیلا اور راجین اور امراوتی کے عظیم الشان بین الاقوامی دارالعلوم اب اجڑ چکے تھے اور شراوستی کے پرانے آشرم سنسان پڑے تھے اور ان پوتھی پتروں کو سمجھنے والا اب کوئی نہ تھا جو عجیب وغریب زبانوں میں لکھے گئے تھے اور عجیب وغریب باتیں ان میں لکھی تھیں، ناقابل فہم فلسفے اور عقل سے بالاتر الہیات۔

**<u>سرل کے کردار کے متعلق کچھ ایسے تصویر کشی کرتی ہیں کہ :</u>**

جب سرل ہاورڈ اشلے نے کوئنز کالج کیمبرج سے بی۔اے کیا اس وقت اس کی عمر صرف بیس سال کی تھی، اس کا باپ ایک بہت مفلوک الحال پادری تھا اور سرل بڑی مشکلوں سے اپنے قصبے کے زمیندار کی مدد حاصل کر کے کیمبرج تک پہنچ پایا تھا۔ ڈگری حاصل کرنے کے بعد لندن آ کر اس نے مڈل ٹمپل میں داخلہ لیا۔ یہاں پڑوس میں فلیٹ اسٹریٹ تھی جس کے قہوہ خانوں میں لکھنے والے اور اخبار نویس جمع ہو کر دنیا جہاں کی باتیں کیا کرتے۔ اکثر سرل بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ ان کی محفلوں میں شریک ہوتا تھیں ایک روز ایک شراب خانے میں سرل کی ملاقات پیٹر جیکسن سے ہوئی جو ہندوستان میں تجارت کرتا تھا اور ان دنوں وطن آیا ہوا تھا، وہ اسے موٹی آواز میں تفصیل سے بتاتا رہا کہ بنگال میں اسے نیل کی کاشت میں کتنے ہزار پاؤنڈ کا نفع ہوا۔ نیٹو کس قدر بے وقوف ہوتے ہیں۔ ان کے امراء کتنے دولت مند ہیں۔ کلکتہ کس قدر دلچسپ شہر ہے۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ ہندوستان چلو۔ تم سمجھدار آدمی معلوم ہوتے ہو، اگر عقل سے کام لیا تو چار روز

**<u>پھر اس دور کے انگریزوں کو ہندوستانیوں پر یوں تبصرہ کرتا دکھاتی ہیں :</u>**

پیٹر جیکسن نے سرل کو فیض آباد اور لکھنؤ کی الف لیلوی داستانیں سنانا شروع کیں، پھر میسور والوں کا اور ارکاٹ کا تذکرہ کیا۔ بمبئی پہنچتے پہنچتے سرل پچھلے دو سو سال کے واقعات سے واقف اور ہندوستان کی پوری تاریخ کا ماہر ہو چکا تھا۔ ہندوؤں کی بربریت۔ ایک سرخ زبان والی مورتی کو پوجتے ہیں۔ بیواؤں کو آگ میں زندہ جلاتے ہیں۔ ننگے پیر گھومتے ہیں۔ گائے اور بندر اور سانپ کو خدا سمجھتے ہیں۔ مسلمانوں کے مظالم۔ عورتوں کو پردے میں گھونٹ کر رکھتے ہیں۔ پندرہ پندرہ شادیاں کرتے ہیں۔ غرضیکہ پیٹر جیکسن نے جو کچھ اسے بتایا وہ خاصا پریشان کن تھا مگر بہر حال حقائق سے کون چشم پوشی کر سکتا ہے اور یہ سب تاریخی حقائق تھے جن پر پیٹر جیکسن نے روشنی ڈالی تھی۔ یہ طے شدہ بات تھی کہ نیٹو بلحاظ نسل کمتر تھے۔ ایشیائی سارے اور ہندوستانی بالخصوص گھٹیا درجے کے انسان تھے۔ عثمانی ترکوں سے بھی بدتر کیونکہ عثمانی ترک کم از کم سفید فام تو تھے۔ "نیٹو چونکہ نسلاً گھٹیا ہیں۔ لہٰذا ان کے دماغ بھی بے حد پست ہیں۔ بنگال میں ایک رائل ایشیاٹک سوسائٹی قائم کی گئی ہے جو کھود کھود کر جانے کس زمانے کی بکواس نکال رہی ہے۔ سنسکرت اور فارسی اور ڈھاکا۔ مردہ زبانیں جن میں جادو ٹونے کے نسخے لکھے ہیں۔ اس پر ہمارے چند محققوں نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ ہندوستانی بھی ایک زمانے میں مہذب تھے۔" پیٹر نے بات ختم کی۔

کئی سال گزر گئے۔ سرل اب کلکتے کی اعلیٰ سوسائٹی میں رل مل چکا تھا اور اسی اسٹائل سے رہتا تھا جو اس سوسائٹی کی خاصیت تھی۔ اس کے پالکی بردار ہر وقت سرخ وردی میں ملبوس رہتے۔ سونٹا بردار چاندی کے موٹھ کی چھڑیاں لے کر چلتے۔ رات کو مشعلچی اس کی فینٹس کے آگے آگے دوڑتے۔ خانساماں اور خدمت گار اس کے مطبخ اور کھانے کے کمرے کے نگران تھے۔ حقّہ بردار اس کا حقہ بھرتا تھا۔ دفتر میں اس کا کلرک یوریشین تھا جس کا نام رالف تھا۔ سرل کو اس کی موجودگی میں بڑی بے آرامی سی محسوس ہوتی۔ رالف، بلیک ٹاؤن کا باسی، بڑی وفاداری سے سرل کی خوشامد میں لگا رہتا۔ دفتر کے انتظام کے لیے بنگالی سرکار موجود تھا اور ان گنت ہرکارے اور پیادے اور چپراسی۔ ایک تن تنہا سرل ایشلے اور اس کے ذاتی عملے میں چالیس پچاس آدمی شامل تھے۔ ان کے علاوہ اس کا مالی تھا اور گر اس کٹ اور سائیس اور چابک سوار اور بہشتی دربان، چوکیدار، پھر اس کا بجرہ تھا جس کے مانجھی اس کے ملازم تھے۔ درزی، دھوبی اور نائی ان سب سے علیحدہ۔ اس سلطنت کا، جو اس کی سفید رنگ کی کوٹھی میں قائم تھی، سرل ایشلے باشرکت غیرے مالک و مختار تھا، وہ چاہتا تو ان سب کو الٹا لٹکا کر پٹوا سکتا تھا اور ایسا اس نے اکثر کیا، وہی سرل جو کچھ عرصہ قبل کیمبرج کی گلیوں میں ولیم بلیک کی کتابیں لیے مشق سخن کرتا پھرتا تھا اور کسی پب میں جا کر چند پنس کے آلو کھاتا تھا، جو ٹنڈل مل کے پھاٹک سے نکل کر دریا کے کنارے ڈون اور گرے کی نظموں پر سر دھنتا سنسان سڑکوں پر ٹہلا کرتا اور رات کو کسی طالب علم ساتھی کے یہاں جا کر سو رہتا تھا۔

**ذیل میں تقسی سے قبل کے لکھنو کے ضمن میں وہ بھیا صاحب کا کردار پیش کرتی ہیں**

**یہ بھیا صاحب ہیں جن پر ہمیں عینی آپا کے محبوب کا شک ہوتا ہے ،اب وہ خود کو روپا کے روپ میں ظاہر کرتی ہیں یا پھر آپا جی کہ یہ وہ خود جانتی ہیں مگر روپا یا چمپا کا کردار انکے اصول و انا پر منطبق بیٹھتا ہے:**

بھیا صاحب جو میرے چچا زاد بھائی تھے میرے بہنوئی بھی ہو سکتے تھے۔ بچپن سے میں یہی سنتا چلا آیا تھا۔ بھیا صاحب جب جوان ہو کر لکھ پڑھ کر بڑے آدمی بن جائیں گے تب اپی کو بیاہ کر لے جائیں گے۔ میرا کوئی سگا بھائی نہ تھا۔ میں بچپن سے بھیا صاحب پر عاشق تھا، وہ میرے ہیرو تھے میرے لیے گیری کوپر اور اشوک کمار سے اونچا درجہ رکھتے تھے۔ بھیا صاحب نے مجھے سینئر کیمبرج کے امتحان کے لئے مار مار کر ریاضی پڑھائی تھی۔ ان کی دل سے اتری ہوئی نائیاں میں بڑے چاؤ سے خود پہن لیتا تھا۔ بھیا صاحب جو کتابیں پڑھتے وہی میں پڑھتا۔ ان کو بیٹی ڈیوس سے نفرت تھی۔ میں نے بھی بیٹی ڈیوس کے فلم دیکھنے سے توبہ کر لی۔ پہلے وہ فارورڈ بلاک میں تھے۔ مجھے نیتا جی کا فلسفہ سمجھایا کرتے۔ میں بھی ان کے ساتھ جلسے جلوسوں سے واپس آ کر رات کو سوتے میں انقلاب زندہ باد کے نعرے لگایا کرتا، پھر جب بھیا صاحب نے مقابلے کے امتحانوں میں بیٹھنا شروع کیا میں نے اس کا اہتمام کیا کہ ان کی پڑھائی میں خلل نہ ہو، ان کے کمرے

بھیا صاحب چچا ابا مرحوم کی اکلوتی اولاد تھے۔ ہمارے آبائی قصبے کلیان پور میں، جو گھاگھرا کے کنارے آباد تھا، تالاب کے کنارے ایک پھونس کا بنگلہ تھا جس میں چچا ابا کبھی کبھی آ کر رہا کرتے تھے، بھیا صاحب بھی یورپ سے لوٹ کر جب قصبے پہلی بار گئے تو اس بنگلے میں جا کر رہے۔ یہ بنگلہ چھوٹی بارہ دری کہلاتا تھا اور اس کے برآمدے میں بیٹھ کر بھیا صاحب موٹی موٹی کتابیں پڑھا کرتے۔ خاندان کو ان سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ یہ بھی اپنے مرحوم بابا کی طرح نام پیدا کریں گے۔ بڑے آدمی کہلائیں گے۔

**اب چمپا کلی جو ماضی کی ہندو تھی حال میں مسلم گھرانے کی چشم و چراغ بن کر نمودار ہوتی ہے کی طرف اشارہ کرتی ہیں :**

چمپا احمد نے بیسنٹ کالج کے کلاس روم کے دریچے میں آکر نیچے نظر ڈالی۔ لو چل رہی تھی۔ دور سڑک پر ایک بگولہ اڑتا ہوا جا رہا تھا۔ سارے میں املتاس کے زرد پتے تیرتے پھر رہے تھے۔ نیچے کالج کا وسیع' بے رونق میدان گرمی کی سہ پہر میں پڑا تپتا تھا۔ جانے بارش کب ہوگی' چمپا نے سوچا۔ سفید کھادی کی ساریاں پہنے لڑکیوں کی ایک ٹولی کالج کی دوسری عمارت کی طرف جا رہی تھی۔ کلاس روم کے ڈائس کے اوپر سے مسز اینی بیسنٹ کی بڑی روغنی تصویر مسکرا رہی تھی۔ یہ مسکراہٹ بھی چمپا کو بہت اداس معلوم ہوئی۔ گھنٹہ بجا اور لڑکیاں برابر کے کمرے سے نکل کر باہر آئی۔ لیلا بھارگوا کے ہمراہ اس نے زینہ طے کرنا شروع کیا۔ قریب کے ایک برآمدے میں ہائی سکول کے امتحان کا کوئی پرچہ کیا جا رہا تھا۔ چھتری سنبھال کر وہ اور لیلا سڑک پر نکل آئی۔ ابھی انہیں کسی پروفیسر سے ملنے یونیورسٹی جانا تھا۔ تانگے پر بیٹھ کر وہ یونیورسٹی کی طرف روانہ ہوگئیں۔

یہ چمپا کی زندگی کا معمول تھا۔ بسنت کالج' یونیورسٹی' گھر

جس سال چمپا کیمبرج پہنچی طلعت اور نرملا وہاں سے جا چکی تھیں۔ (میں ہمیشہ مڈ ہرسٹ جانا چاہتی ہوں لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آتی۔ سرل' اب کے ویک اینڈ پر ضرور مڈ ہرسٹ چلیں گے' بے چاری نرملا کو دیکھئے) اب وہ اونچے طبقے کی برطانوی لڑکیوں کے لہجے میں گفتگو کرتی۔ کیمبرج کی بدو ماغی بھی اس نے پوری طرح اوڑھ لی۔ کچھ طور طریقے اس نے ادیبوں کے گروہ میں رہ کر لندن میں سیکھ لیے تھے۔ اس کے علاوہ رکھ رکھاؤ' سلیقہ' نفاست' بردباری' ایک خاص سطح کا دھیما دھیما مزاج۔ رات کو آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر وہ دفعتاً سوچتی: چمپا احمد کہاں رہ گئی! چمپا احمد جو ایک دیو مالا' ایک حکایت میں تبدیل ہو چکی ہے۔ وہ بسنت کالج بنارس والی لڑکی کہاں گئی' یادو کی لڑکی

جس کو عامر رضا نے گلفشاں کے سائیڈ روم میں ترکاری بناتے دیکھا تھا۔ عامر رضا کا خیال اب اسے بہت مضحکہ خیز لگتا۔ وہ فلم اسٹاروں کے حلیے والا ڈیلو میٹ جس کی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ شام کو کون سا سوٹ پہن کر اور

**مذکورہ بالا حوالہ بیان کرتا ہے کے اب سارے کردار لنڈن میں پڑھائی و فکر کے جھمیلوں میں سر پھنسالیتے ہیں .یہیں پر میرے تعارف کا اختتام ہوتا ہے-**

## ۳۳

ایک دن پروفیسر گوتم نیلمبر دت بند گھوڑا گاڑی سے اتر کر اپنے مکان کی برساتی میں داخل ہوئے تو مالی نے ان کو اطلاع دی کہ مٹیا برج والے نواب صاحب آپ سے ملنے آئے تھے، بڑی دیر آپ کی راہ دیکھا کیے، ابھی ابھی واپس گئے ہیں۔ نیلمبر الٹے پاؤں باہر گئے اور سڑک پر آکر جلدی سے چاروں اور دیکھنے لگے۔ سامنے ایک بوڑھا سفید جامدانی کا انگرکھا پہنے جریب ٹیکتا سڑک کے کنارے چلا جاتا تھا۔ نیلمبر دت نے لپک کر اسے جالیا۔

''اخاہ میاں نیلمبر صاحب'' بوڑھے نے خوشی سے کھل کر کہا۔ ''ہمارا خیال تھا آپ سے ملاقات نہ ہو پائے گی۔''

''کیوں نواب صاحب، خیریت تو ہے۔ آپ سے تو یوں بھی برس گزر جاتے ہیں ملنا نہیں ہو پاتا، اب آیئے چل کر دو گھڑی اندر بیٹھیے۔ میری نواسی سکول کے بورڈنگ ہاؤس سے لوٹ کر آئی ہے، آپ نے شاید ابھی تک اسے نہیں دیکھا۔''

نواب صاحب کا ہاتھ پکڑ کر وہ ان کو مکان کے اندر لے آئے۔

''اچھا میاں۔'' نواب صاحب نے ڈرائنگ روم میں آکر صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''تم کو دیکھ لیا، تمہارے بچوں کو دیکھ لوں، پھر جانے زندہ لوٹنا نصیب ہو

نہ ہو۔''

''کیوں۔کہاں کا قصد ہے۔لکھنؤ۔۔؟''

''کربلائے معلی جا رہا ہوں۔خدا وہیں یہ مٹی عزیز کرے، یہاں اب کیا رکھا ہے۔''ان کی آواز بھرا گئی اور انہوں نے کانپتے ہاتھوں سے مشہدی رومال نکال کر آنسو خشک کیے۔

نیلمبر دت ان کو محبت سے دیکھتے رہے۔ملازم چائے لے کر آیا۔ڈرائنگ روم ہمعصر وکٹورین طرز میں سجا ہوا تھا۔دیواروں پر ان گنت تصویریں تھیں۔مناظر اور فوٹو گراف،موتیوں کے پردے دروازوں پر پڑے تھے۔فرن اور پام کے پودے پیتل کے گملوں میں رکھے تھے۔برابر کے کمرے میں پیانو بج رہا تھا۔پیانو کی آواز یکلخت نیلمبر دت کو بڑی اداس معلوم ہوئی،انہوں نے آواز دی:''نیلما بیٹی،باجہ بند کرو اور یہاں آؤ،دیکھو تمہارے میٹابرج والے چاچا آئے ہیں۔''

ایک پندرہ سالہ لڑکی اندر آئی،اس نے جھک کر نواب صاحب کے پاؤں چھوئے۔

''یہ میری نواسی ہے نواب صاحب،اسکول ہی میں رہتی ہے۔''وہ دھندلی آنکھوں سے اسے دیکھتے رہے۔پندرہ سالہ لڑکی جو شادی کرکے گود میں بچہ کھلانے کے بجائے اسکول میں انگریزی پڑھ رہی تھی اور ارگن باجہ بجاتی تھی۔

نواب کمن نے صوفے پر بیٹھے بیٹھے دریچے سے باہر نظر ڈالی۔کلکتے کی روشنیاں چاروں طرف جگمگا اٹھی تھیں۔شام کا اندھیرا چھا رہا تھا۔نیلمبر دت ان سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے دونوں کے پاس مشترکہ موضوع گفتگو کوئی نہیں

تھا سوائے ماضی کے، مگر ماضی کی یاد کو نیلمبر دت کہاں تک گھسیٹ سکتے تھے، ان کے سامنے مستقبل تھا۔ نواب کمن کے پاس صرف ماضی تھا۔ وضع داری نبھانے کے لیے دونوں بڑے تپاک سے ایک دوسرے سے ملتے تھے، جب لکھنؤ اجڑا اور کلکتے میں مہاراجہ بردوان کی کوٹھی آباد ہوئی مٹیا برج میں دوسرا لکھنؤ بسایا گیا۔ اس وقت نواب کمن نے، جو سلطان عالم کے ساتھ یہاں آ گئے تھے، نیلمبر دت کو ملاقات کے لیے بلوایا، وہ اس سے کلکتے کا مشہور اخبار نویس بن چکا تھا۔ اس نے اب تک کئی کتابیں لکھ ڈالی تھیں اور وہ برہمو سماج کے پلیٹ فارم کا شعلہ بیان مقرر تھا۔ نیلمبر ان سے پابندی سے سال میں دو ایک بار ضرور مل لیتا تھا، جب راجہ سریندر موہن ٹیگور کے یہاں موسیقی کی تجدید کی بنا ڈالی گئی اور ملک بھر کے موسیقار کلکتے مین جمع ہونا شروع ہوئے اس وقت بھی نیلمبر نے نواب کمن کو یاد رکھا اور نئی سنگیت کی محفلوں میں مدعو کرتا رہا۔

اب کمروں میں لیمپ روشن کر دیے گئے تھے۔ باہر گلیوں میں بارش کا پانی جمع ہو گیا تھا جن میں مینڈک ٹراتے تھے مکان کی بالائی منزل پر نیلمبر بابو کے بیٹے منورنجن دت کے یونیورسٹی کے ساتھی تھیٹروں میں ان دنوں چند بہت اچھے اچھے ڈرامے اسٹیج کیے گئے تھے۔ منورنجن کے دوست مائیکل مدھوسودن نے ایک نیا ڈرامہ لکھا تھا، اس سے وہ سب اس کی پریکٹس میں جٹے تھے اور قہقہے لگا رہے تھے۔ کیمپبل میڈیکل اسکول میں ایک لڑکا کھڑکی میں بیٹھا ہارمونیم بجا رہا تھا۔

منورنجن تو رولتا کی نئی انگریزی نظم پڑھ رہا تھا۔ ہارمونیم کے سر اور لڑکوں کے قہقہوں اور مکالموں کی آوازیں نیچے ڈرائنگ روم تک پہنچ رہی تھیں۔

نواب صاحب جریب پر انگلیاں پھیرتے رہے۔ یہ ایک دوسرا زمانہ تھا، دوسرا عہد، یہ ۱۸۷۱ء تھا۔ دنیا بوڑھی ہو چکی تھی۔ نواب کمال رضا کی دنیا۔ نیلمبر دت بھی ان ہی کے ہم عمر تھے مگر ان کی دنیا اب جوان ہو رہی تھی، یکلخت نواب کمن کو احساس ہوا کہ اس نئی دنیا میں ان کی کوئی جگہ نہیں۔ دارالسلطنت کے اس جدید ڈرائینگ روم میں بیٹھے وہ خود کو بے حد مضحکہ خیز نظر آئے۔

''نواب صاحب! منورنجن لکھنؤ کے کیننگ کالج میں قانون کا لیکچرار ہو کر جا رہا ہے۔'' گوتم نیلمبر دت کی آواز ان کے کانوں میں آئی۔ یہ آواز بھی کسی دوسرے کرے سے آ رہی تھی، وہ چونک پڑے۔ ''اچھا۔ اچھا۔ ماشاءاللہ سے۔ انہوں نے ہڑبڑا کر کہا۔ ''جائیں، سدھاریں، ان کو امام ضامن کی ضامنی میں دیا۔'' پھر وہ جریب کے سہارے اٹھے اور نیلمبر دت کو خدا حافظ کہہ کر مٹیابرج لوٹ گئے۔

رات گہری ہو چکی تھی۔ نیلمبر دت نواب کمن کے جانے کے بعد تھوڑی دیر ڈرائنگ روم میں ٹہلتے رہے، انہوں نے گھومنے والی الماریوں سے ایک کتاب نکال کر اس کی ورق گردانی کی، مگر اس میں بھی ان کا دل نہ لگا۔ انہوں نے چاروں طرف دیکھا، الماریوں میں ہر طرف کتابیں ہی کتابیں تھیں۔ اخباروں کے مجلد فائل، قانون کے رسالے، کمیٹیوں کی رپورٹیں اور قراردادیں۔ ہر طرف مسائل تھے اور مسائل کا حل انہوں نے پا لیا تھا۔

مسائل کا حل انہوں نے پا لیا تھا؟ نیلمبر دت کا دم گھٹنے سا لگا۔ ہوا بند تھی اور رات گرم تھی، باہر سڑکوں پر لیمپ مدھم مدھم ٹمٹما رہے تھے۔ دفعتاً عروس البلاد کلکتہ

ان کو بے حد خوفناک معلوم ہوا، وہ گھبرا کر باہر برآمدے میں نکل آئے۔ ایسی ہی راتوں میں دکھی روحوں کی پرواز کی سنسناہٹ سنائی دیتی ہے۔ آنگن میں کیلے اور پام کے پتے ساکن کھڑے تھے۔ پختہ حوض کے کنارے ایک کتا دم ٹانگوں میں سمیٹے سو رہا تھا، اگر ان کو آواگون میں یقین ہوتا تو شاید وہ سوچتے کہ یہ کتا کسی کی دکھی روح ہے، وہ برآمدے سے اتر کر گیندے کے کنارے کنارے ٹہلتے رہے۔ اوپر منورنجن کے کمرے میں خاموشی چھا چکی تھی۔ کیمپبل میڈیکل اسکول کا لڑکا ابھی تک دریچے میں بیٹھا تھا، وہ بھی ہارمونیم کے پردوں پر سر رکھ کر سو چکا تھا۔ منورنجن کے کمرے سے جو زینہ باغ میں اترتا تھا اس کی آخری سیڑھی پر بیٹھا کوئی تورولتا کی نئی انگریزی نظم آہستہ آہستہ پڑھ رہا تھا۔ چاند اب دت ہاؤس کے عین اوپر آ چکا تھا۔

برآمدے میں لڑکوں کا ایک گروہ بیٹھا تو رولتا کی نظم پر سر دھن رہا تھا:

محبت اور روشنی اور نغمے کو تمہاری تلاش ہے۔

روشنی قرمزی آسمانوں پر موجود ہے

نغمے لارک گا رہا ہے

محبت میرے دل میں ہے

ایک دوسرے سے جدا

ہم فطرت کے مقصد کو کھو رہے ہیں

اپنی قسمت کو دھوکا دینے کے لیے ہم کیوں کوشاں ہیں

میری محبت تمہاری روح کے لیے تخلیق کی گئی ہے

تمہارا حسن میری آنکھوں کے لیے

اب جاگ اٹھو

میں منتظر ہوں اور روتی ہوں

تم کہاں ہو

اس دھرتی پر ایک بے آسرا،

بیمار، بدصورت اور حقیر

بچے کی طرح میں پیدا ہوئی

پیدائشی بدقسمت لڑکی۔۔۔۔

ہر ایک نے مجھے ٹھکرا دیا ہے

پھر میرے ہونٹوں سے ایک نالہ بلند ہوا:

خدایا۔۔۔!

اور خدا نے جواب دیا:

گائے جا۔۔۔ بے چاری لڑکی۔۔۔گائے جا۔۔

نیلمبر دت مبہوت اس نظم کو سنتے رہے۔انہوں نے آواز پہچانی، یہ ان کے بیٹے کی آواز تھی۔منورنجن اور وہ آہستہ آہستہ رو رہا تھا، وہ جس نے کلکتہ یونیورسٹی کے فلسفے اور منطق کے امتحانات میں سارے ریکارڈ توڑے تھے، جو اگلے ہفتے کینتگ کالج کا پروفیسر ہو کر پردیس جانے والا تھا۔

نیلمبر دت مسکرائے۔مبارک ہیں وہ لوگ، انہوں نے اپنے آپ سے کہا، جو محبت کر سکے۔خواہ اس میں انہیں ناکامی ہی ہوئی ہو، پھر انہوں نے چاند کو دیکھا جو

تیرتا تیرتا دت ہاؤس کے عین مقابل میں آ چکا تھا۔اس کی کرنیں حوض کے پانی میں منعکس تھیں۔چاند نے ان کو بہت سی کہانیاں سنائیں،وہ پورن ماشی کی رات تھی۔

اس رات چیت پور روڈ سے واپس جانے کے بعد نواب ابوالمنصور کمال رضا بہادر جب گارڈن ریچ پہنچے، جہاں میٹا برج میں ان کا مکان تھا،تو اپنے پلنگ پر لیٹتے ہوئے ان کو خیال آیا: کیسی عجیب بات ہے کہ انسان صرف ایک مرتبہ دنیا میں آتا ہے اور پھر ختم ہو جاتا ہے۔زندگی صرف ایک ہی دفعہ زندہ رہنے کے لیے ملتی ہے۔انسان مر جاتا ہے، پھر کبھی اس دنیا کو نہیں دیکھ پاتا جیسے شاہ زمن غازی الدین حیدر مرے تھے اور نصیر الدین حیدر اور محمد علی اور امجد علی،ان سب کو مرتے نواب کمن نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔یہ لوگ، جو اودھ پوری کے راجہ تھے،یہ سب موت آئی تو پٹ سے ختم ہو گئے اور بے چارے سلطان عالم واجد علی۔پڑوس کی رادھا منزل میں اندر سبھا منعقد کروا کے خود کو یقین دلانے کی کوشش کرتے تھے کہ ابھی قیصر باغ ہی میں موجود ہیں، ایک روز وہ بھی ختم ہو جائیں گے۔تخت شاہی ہو یا غریب الوطنی، انتہائی مسرت ہو یا شدید رنج وغم،موت آ کر سارا قصہ ہی چکا دیتی ہے، جانے مرنے کے بعد کیا حشر ہوتا ہوگا۔فشار قبر اور منکر نکیر اور ۔۔۔اور۔۔۔یہ سب سوچتے سوچتے نواب کمن کو بے حد ڈر معلوم ہوا۔انہوں نے تکیے پر سے سر اٹھا کر اپنے گھر والوں کو آواز دینا چاہی۔انہوں نے پلنگ سے اٹھنا چاہا مگر پیچھے کو گر گئے۔

کیونکہ کربلائے معلی کا سفر کرنے کے بجائے نواب کمال رضا سفر آخرت

اختیار کر چکے تھے۔

## ۳۴

نواب صفدر جنگ سے لے کر سلطان عالم تک نو حکمرانوں نے اودھ پوری پر راج کیا۔ سلطان عالم کے زمانے میں سلیمن صاحب آیا۔ صفدر جنگ نے اپنی طاقت کے بل پر اس سلطنت کی بنیاد ڈالی تھی، جو دلی کے زوال کے بعد ہندوستان کی سب سے شاندار سلطنت تھی، جس کے بادشاہ فرانس کے لوئی چہاردہم سے زیادہ جاہ و جلال والے تھے۔ سلیمن صاحب چونکہ ان سب سے طاقتور تھا اس نے پل کی پل میں ایک اتنی بڑی پھونک ماری کہ یہ ساری دیپ مالا چشم زدن میں بجھ گئی۔ ہیولاک جیتا۔ سلطان عالم ہارا۔ لکھنؤ کی اندرا پوری اجڑ گئی۔ نوٹنکی ختم ہو چکی۔ قیصر باغ کی چاندی والی بارہ دری میں سبز پری کا ناچ، عیش باغ کے میلے، محرم اور رام لیلا کے ہنگامے۔ دل کشا محل اب سنسان پڑا ہے۔ ہیلی گارد کو توپوں نے اڑا دیا۔ حضرت گنج میں انگریزی دکانیں ہیں۔ امین آباد میں کالج اور اسکول۔ اخبار چھپ رہے ہیں۔ ٹیلیگراف کے تار جھنجھناتے ہیں۔ ایودھیا کے رام چندر کی گدی لٹ چکی۔ صبح ہوئی اور آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ یہ سب عمرو عیار کا طلسم تھا، آخری ایکٹ شروع ہونے سے پہلے ہی راجہ اندر کو مع اس کے اکھاڑے کے دیولوک سے شہر بدر کر دیا گیا۔

کلکتے کے پروفیسر نیلمبر دت اپنے بیٹے سے ملنے کی غرض سے لکھنؤ آئے ہوئے

تھے۔ ریل گاڑی جب اسٹیشن پر پہنچی اور وہ فٹن پر بیٹھ کر باہر آئے تو انہوں نے دیکھا کہ نقشہ ہی بدلا ہوا تھا، وہ آج سے اڑتالیس سال قبل ۱۸۲۳ء میں لکھنؤ آئے تھے، وہ شاہی کا لکھنؤ تھا۔ یہ انگریزی کا لکھنؤ ہے۔ یہاں ڈھومی بیگ کو تو ال کے بجائے انگریز ڈپٹی کمشنر کا راج ہے جو سعادت علی خاں کی نور بخش کوٹھی میں براجتا ہے، بیچارے سعادت علی خاں کی حیات بخش کوٹھی اب بینکس ہاؤس کہلاتی ہے، اس میں کمشنر رہتا ہے۔ قیصر باغ میں کیننگ کالج ہے۔ جس میں کلکتہ کا منورنجن دت قانون پر لیکچر دیتا ہے۔ شہر کی گلیاں اور محلے وہی ہیں لیکن زمانہ بدل گیا۔ نخاس چوک، معالی خاں کی سرائے، پاٹا نالہ، چوپٹیاں، چوکھی، گولہ گنج، بارود خانہ، سعادت گنج، ڈالی گنج، حسین گنج۔ ساری جگہیں وہیں ہیں۔ مکان، انسان مگر وقت دوسرا ہے۔ تاریک محلوں، شکستہ مکانوں میں انقلاب کے مارے ہوئے لوگ سر جھکائے بیٹھے ہیں۔ دولت مند لٹ گئے، غریب امیر ہو گئے۔ باغیوں کو پھانسیاں اور وفاداروں کو تعلقے ملے۔ اختر پیا جب سے پردیس سدھارے اب تو ان کے لیے روتے روتے آنسو بھی خشک ہو گئے، یہ اودھ پوری ہے۔ یہاں سے رام کو بھی اسی طرح بن باس ملا تھا۔

فٹن اسٹیشن سے شہر کی طرف چلی۔ کوچبان نے سر پر انگوچھا لپیٹ کر نیلمبر دت کو دیکھا: ''بابو صاحب، پیچھے سائیس بیٹھا ہے، اسے اوپر بلا لوں۔ بڈھو ہے گر کر مر جائے گا۔''

''ہاں بلا لو۔'' انہوں نے جواب دیا۔ پیچھے سے ایک بوڑھا کود کر کوچ بکس پر آ گیا۔ فٹن پھر روانہ ہوئی۔

''بابو صاحب کلکتے سے تشریف لاوت ہیں۔''

''ہاں''

''ہم بھی سوچتے ہیں کلکتے چلے جائیں، یہاں اب جی نہیں لگتا۔'' نوجوان نے کہا۔

''کوہے'' بوڑھے سائیں نے نوجوان کے کان کے قریب منہ لے جا کر بڑے رازدارانہ انداز میں پوچھا۔

''کلکتے کے بابو۔۔۔'' نوجوان نے، جس کا نام شمبھو تھا، چلا کر کہا۔

''کلکتہ۔۔۔؟'' بوڑھے نے، جس کا نام گنگا دین تھا اور جو اونچا سنتا تھا، غیر یقینی انداز میں دہرایا اور پھر مڑ کر دھندلی آنکھوں سے بنگالی بوڑھے کو دیکھا۔

''ہاں ہاں۔ سمجھ میں نہیں آوا؟'' شمبھو نے کہا۔

''بابو صاحب'' گنگا دین نے مڑ کر بڑی لجاجت سے نیلمبر دت سے کہا۔ ''ہم کا بھی کلکتے پٹھائے دیو۔''

نیلمبر دت کی سمجھ میں اس کی بات نہیں آئی۔ نوجوان نے ہنس کر بوڑھے سے کہا: ''بابو صاحب تمہری بولی نہیں سمجھتے، اردو میں اپنا مطبل بیان کرو۔''

بوڑھے نے بہت سنبھل کر کہا: ''کھداوند، ہم کو کلکتے پٹھا دیجیے، وہاں ہمرے بادشاہ رہت ہمن۔''

نوجوان ہنس پڑا: ''حضور بابا کی بات پر دھیان مت دیجیے۔ یہ جو مسافر ریل سے اترتا ہے اس سے یہی بات کہتے ہیں، میاں مسافر تم کلکتے سے آئے ہو۔ ہم کو بھی وہیں پہنچا دو۔ پوچھو، ہمرے بادشاہ خود جوکھم میں ہیں، اوپر سے یہ بھی پہنچ

جائیں۔ جیسے بس ان ہی کی کسر ہے۔''

نیلمبر دت خاموش رہے۔ فٹن اب امین آباد کی طرف بڑھ رہی تھی۔

''سرکار پہلے بھی نکھلو تشریف لائے ہیں۔'' نوجوان نے پوچھا۔

''ہیں؟'' نیلمبر دت نے چونک کر پوچھا، ''ہاں''

''کب۔؟''

''بہت زمانہ گزرا جب تم پیدا نہیں ہوئے تھے۔ غازی الدین حیدر کے وقت میں۔''

''بابا۔'' کوچوان نے پھر چلا کر بوڑھے سائیس کے کان میں کہا، ''بابو صاحب تمرے گاجی الدین حیدر کے زمانے میں آئے رہے۔''

پھر کوچوان نیلمبر دت سے مخاطب ہوا: ''بابا کہا کرت ہیں کہ گاجی الدین حیدر کے چوبدار تھے۔ اس سے پہلے شکرم ہانکتے تھے مگر کہتے ہیں کہ محل میں پہنچ کر انہوں نے بڑے اچھے دن دیکھے۔ سارے بادشاہوں کی ڈیوڑھی پر نوکری کی ہے، سلطان عالم ان کو بہت مانتے تھے۔''

''کھداوند'' گنگا دین نے کہا، ''سلطان عالم کو آپ نے دیکھا ہے؟ کیسے ہیں؟ خیریت سے ہیں؟'' پھر وہ بچوں کی طرح رونے لگا۔

نیلمبر دت بہت متاثر ہوئے، ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ لوگ اس قدر جذباتی بھی ہو سکتے ہیں۔ مدتوں وہ محض عقل کے پجاری رہے تھے، اب آن کر انہوں نے دل کی عظمت کو سراہا۔ فٹن اب امین آباد کے چوراہے پر پہنچ چکی تھی۔

دفعتاً کوچوان نے پکارا: ''ارے سامنے سے ہٹتی نہیں بوڑھیا، کاہے اپنی جان

کی لاگو ہوت۔'' اس نے باگیں کھینچ کر فٹن روک لی۔ ایک ضعیفہ دلائی میں لپٹی ہوئی سامنے آ گئی اور اس نے ہاتھ پھیلا کر میکانکی انداز میں اپنے فقرے دہرانے شروع کر دیے: جناب امیرؑ کا صدقہ، خدا تمہیں سوا غم حسینؑ کے اور کوئی غم نہ دے۔

نیلمبر دت فٹن کے کشنوں سے پیٹھ لگائے بیٹھے سوچ رہے تھے: لکھنؤ کیا بوڑھوں کا شہر ہے؟ یہاں کے جوان کہاں چلے گئے؟ ان کو معلوم نہ تھا کہ یہاں کے جوان ملکہ حضرت محل کے لیے لڑتے ہوئے مارے گئے تھے اور جو باقی تھے قبل از وقت عمر رسیدہ ہو چکے تھے، مگر زندگی کا ہنگامہ بدستور جاری تھا۔ امین آباد روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ پھول بیچنے والے صدائیں لگا رہے تھے۔ لوگوں کا جم غفیر چاروں طرف موجود ہوتا تھا۔ شام اودھ بدستور بزم آرا تھی۔ فقیرنی اسی طرح آنکھیں بند کیے کھڑی دہراتی رہی: خدا سو غم حسینؑ کے اور کوئی غم نہ دے۔ ایک ٹکا۔ خالی ایک ٹکا۔

نیلمبر دت چونک پڑے۔

یہ آواز جانی پہچانی تھی، یہ آواز سینکڑوں ہزاروں برس کا سفر طے کرتی۔ ان کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ اس آواز نے بڑی خوبصورت باتیں کی تھیں۔ راگ سنائے تھے قہقہے لگائے تھے۔

انہوں نے ہڑبڑا کر عینک درست کی اور فٹن سے باہر جھانکا مگر سڑک کے کنارے تو وہی فقیرنی کھڑی تھی جس نے اودے رنگ کی بوسیدہ دلائی اوڑھ رکھی تھی۔

"اسے کچھ مت دیجیے گا خداوند۔" شمبھو نے کوچ بکس پر سے جھک کر آہستہ سے مودبانہ انداز میں کہا، "اسے کوکین کی لت ہے، جو ملتا ہے اس کی کوکین کھا جاتی ہے نیک بخت۔"

نیلمبر دت نے اپنے رعشہ دار ہاتھوں سے ایک روپیہ جیب سے نکال کر فقیرنی کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر رکھ دیا۔

فقیرنی نے اپنی چندھی چندھی آنکھوں سے اس بنگالی بوڑھے کو دیکھا جس کی لمبی سفید داڑھی تھی اور جو سفید براق دھوتی پہنے اگرئی شال میں لپٹا ٹانگ پہ ٹانگ رکھے فٹن میں بیٹھا تھا۔

بڑھیا کو نیلمبر دت نے پہچانا۔۔۔

بڑھیا چمپا تھی۔

روپیہ مٹھی میں مضبوطی سے بند کرنے کے بعد ایک لحظہ کے لیے اسے بڑی ہوئی، یہ کیسا دیالو رئیس ہے جوڑکا مانگو تو چاندی کا روپیہ دیتا ہے۔ سکے کو اپنی گرفت میں لے کر فقیرنی نے پھر رٹے ہوئے انداز میں دہرانا شروع کر دیا: سرکار، غریب پرور۔۔۔ آپ کو پوتوں، نواسوں کی خوشیاں دیکھنی نصیب ہوں۔ میں غدر کی ماری ہوں، بندہ نواز۔ شاہی میں میرے دروازے پر ہاتھی جھومتا تھا، اب کوئی دو روٹی کا سہارا دینے والا نہیں۔ اللہ آپ کو۔۔۔ شمبھو نے گھوڑے کو چابک لگایا۔ فٹن آگے بڑھ گئی۔ شمبھو، جس کی دنیا کے واقعات پر رائے زنی کرنے کی عادت بہت پختہ ہو چکی تھی، ہنس کر کہنے لگا:

"بڑھیا کی باتیں۔ دروجے پر ہاتھی جھومتا تھا، یہ گردی کا یار لوگوں کو اچھا بہانہ

مل گیا ہے۔جس سے سنو یہی کہتا ہے میں غدر سے پہلے یوں طرم جنگ تھا، فلانا تھا، ڈھمکا تھا۔ بابا ہی کو دیکھ لیجئے، بابو صاحب، گردی سے پہلے بادشاہ کے خاص چوبدار تھے۔اب سائیسی کرتے ہیں۔'' وہ طنز سے ہنسا اور اسی طرح اظہار خیال کرتا ہوا موتی محل برج کی سمت رواں رہا۔

چمپا نے روپے کو شام کے اندھیرے میں کئی بار الٹ پلٹ کر دیکھا اور آہستہ آہستہ چلتی ایک تاریک گلی میں مڑ گئی جہاں ایک زمین دوز دکان میں کوکین فروخت ہوتی تھی اور جہاں بھنگڑ یے اور مدکیے گھٹنوں میں سر دیے بیٹھے تھے۔

اندھیرے نے سارے شہر کو اپنے آنچل میں سمیٹ لیا۔جس وقت فٹن امین آباد کے چوراہے سے آگے بڑھی۔نیلمبر دت نے ایک بار پیچھے مڑ کر نظر ڈالی۔چمپا سڑک کے کنارے دلائی میں لپٹی کھڑی ان کا دیا ہوا روپیہ لیمپ کی روشنی میں الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی جیسے اس کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آتا ہو۔اس کے بال چاندی کی طرح چمک رہے تھے اور اس کے چہرے پر ان گنت جھریاں تھیں، اس کی دلائی میں جابجا پیوند لگے تھے۔کہیں کہیں پر گوکھرو اور بنت ٹکی رہ گئی تھی جس کے تار نکلے ہوئے تھے۔

انہوں نے فٹن کے کشنوں سے پیٹھ لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

کیونکہ گوتم نیلمبر نے ویشالی کی امباپالی کو دیکھ لیا تھا۔

گومتی کے اس پار شاہ نجف کے مقابل میں سنگھاڑے والی کوٹھی تھی جس کو بابو منورنجن دت نے اپنے رہنے کے لیے کرائے پر لے رکھا تھا۔فٹن موتی محل کے پل پر سے گزر کر دریا کے کنارے والی کچی سڑک پر مڑ گئی اور کچھ دیر بعد سنگھاڑے

والی کوٹھی کے پھاٹک میں داخل ہوئی۔

اس رات جب منورنجن اپنے کمرے میں جا کر سو گیا اور مالک مکان کے کمروں میں لیمپ گل کر دیے گئے تب نیلمبر دت برآمدے میں آ کر، جس کی سیڑھیاں ندی میں اترتی تھیں، بہت دیر تک ندی کے بہتے ہوئے پانی کو دیکھتے رہے۔ رات اب بھیگ چکی تھی، لیکن کمرے میں جا کر سونے کے بجائے وہ باہر نکل آئے اور گومتی کے کنارے کنارے سڑک پر چلنے لگے۔ چاروں اور مکمل سناٹا چھایا ہوا تھا، ان کے پیچھے پیچھے بھوتوں کا ایک پورا جلوس ان کا تعاقب کر رہا تھا۔ آگے آگے چھل پیریاں رقصاں تھیں۔ سامنے کچھ دور پر پل کے نیچے کشتیاں بندھی تھیں اور چنڈی کا مندر نظر آ رہا تھا۔ درختوں پر سرخ آنکھوں والے بندر سو رہے تھے، یہ بہت جانے پہچانے بھوت تھے جو ان کے پیچھے دانت نکوستے، لنگڑاتے اچھلتے کودتے چلے آ رہے تھے۔

سارے شاہان اودھ، سعادت علی خاں اور جان بیلی، نصیر الدین حیدر اور ان کا یورپین حجام اور قدسیہ محل اور بوڑھے محمد علی شاہ۔ سر ل ہاورڈ ایشلے اور شنیلا۔ لارڈ میکالے اور بشپ ہیبر۔ ان انگریز بھوتوں کو بھی وہ خوب جانتا تھا، جب زندہ تھے اور مر کر اب جانے کس جہنم میں گئے ہوں گے، مگر وہ تو بدستور سر پر سوار تھے۔ دنیا کا عروج و زوال گوتم نے دیکھ لیا تھا۔ اب اسے کون سا تماشہ دیکھنا باقی تھا۔ ندی رواں تھی۔ کنارے پر مکان بنے تھے۔ ان مکانوں کے نام تھے۔ ان مکانوں میں انسان سو رہے تھے۔ ان انسانوں کے بھی نام تھے۔ مکان پتھر کے بنے تھے۔ ساحل پر پتھر بکھرے تھے۔ وقت رواں تھا۔ وقت پتھر میں منجمد تھا۔ مرگھٹ میں

شعلے بلند ہو رہے تھے، آج کی رات جانے کون کون مرا ہو گا۔

نیلمبر دت آگے بڑھتے رہے۔

سامنے مرگھٹ تھا۔ مرگھٹ میں کالی ناچ رہی تھی۔ کالی جو ساری کائنات کو اس کے خاتمے پر اپنے میں سمیٹ لیتی ہے، صرف وہی انسان اس سے خوفزدہ ہوئے بغیر اس کی عبادت کر سکتا ہے جو اپنی خواہشوں کو ختم کر کے اس کی ذات میں فنا ہو سکے۔

مرگھٹ۔۔۔ یہاں ساری خواہشیں جل کر بھسم ہو جاتیں ہیں۔۔۔ اور کالی۔۔۔ جو ذہن اور گویائی سے ماورا ہ ساری جاندار کائنات کو نفی میں تبدیل کر دیتی ہے، وہ۔۔۔۔ جو سونیا کو پورن بناتی ہے۔ پورن۔۔۔ جو روشنی اور سکون ہے۔

کالی۔۔۔۔ جس کا لباس ساوی ہے، وہ وسعت ہے کیونکہ لامحدود ہے۔ عظیم طاقت ہے۔ مایا سے بلند تر ہے کیونکہ خود مایا بن کر دنیا کی تخلیق کرتی ہے۔

مرگھٹ میں کالی شیو کے سفید جسم پر کھڑی ہے۔

شیو۔۔۔۔ جو سفید ہے کیونکہ سروپ ہے۔ روشنی بخشتا ہے اور مایا اور خود پرستی کے عفریتوں کو تباہ کرتا ہے، وہ ساکت ہے کیونکہ تبدیلی سے ماورا ہے۔ کالی اس کی تبدیلی کی مظہر ہے۔

شیو۔۔۔ جو تبدیل نہیں ہوتا لیکن ہر تغیر میں موجود ہے۔ شعلوں کے دھویں میں کالی رقصاں ہے، وہ کالی ہے۔ تارا۔۔۔۔ دھوم وتی، وہ شانت رس کا ناچ ناچ رہی ہے اور کائنات جے جے کے نعرے لگا رہی ہے۔

نیلمبر دت جس نے کالی کو ستی اور گوری اور جوگ مایا کے روپ میں دیکھا تھا،

انہوں نے مرگھٹ پر نظر ڈالی اور اسے پہچانا۔

کیونکہ مرگھٹ حیات کی اصلیت تھی۔

وہ کچھ دیر پل پر کھڑے مدھم شعلوں کو دیکھتے رہے، پھر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے سنگھاڑے والی کوٹھی کی طرف واپس لوٹ آئے۔

صبح کے چار بجے تو گھر کی بی بی بستر سے اٹھیں اور انہوں نے جا کر مہری کو جگایا جو ایک طرف کو فرش پر چٹائی بچھائے سو رہی تھی۔ ''چاء کا پانی رکھ دیو۔ چھٹکی کا اسکول آج چھ بجے سے لگیے۔'' مہری آنکھیں ملتی ہوئی اٹھی اور بالوں کا جوڑا لپیٹتی پانی کے نل کی سمت چلی۔ اب وہ غسل خانوں میں جگمگاتی پیتل کی بالٹیاں پانی سے بھر کر رکھے گی۔ بڑے صاحب اور بھیّن صاحب کے شیو کا پانی پیالیوں میں لگائے گی، پھر چاء کا انتظام کرے گی۔

نیچے باغ میں مولسری کے درختوں پر چڑیوں نے شور مچانا شروع کر دیا تھا۔ دور کچی سڑک پر سے ایک بیل گاڑی چرخ چوں کرتی گزر رہی تھی۔ دودھ والا المونیم کی بالٹیاں سائیکل کے ہینڈل سے لٹکائے لپکا ہوا بستی کی اور چلا جاتا تھا۔ گھر کی بی بی پوجا کے لیے ٹھاکر دوارے میں چلی گئیں۔ ٹھاکر دوارہ دوسری منزل پر مشرق کے رخ کی برجی میں تھا۔ کمرے میں حبس تھا اور برسات کی گرمی۔ دروازہ کھلا تو اندر کے اندھیرے میں گوپی ناتھ ٹھاکر حسب معمول اپنی خالی خالی آنکھوں سے سامنے خلا میں دیکھتے نظر آئے، ان کی کیسری پوشاک پر جھوٹا گوٹا لگا تھا اور ان کے مکٹ میں مور کا ایک پر تھا جو ذرا ٹیڑھا ہو رہا تھا اور وہ اسی طرح ایک ٹانگ پر دوسری ٹانگ رکھے بانسری اٹھائے پیتل کے چھوٹے سے مندر میں

کھڑے تھے۔ ساکت، منجمد، لاتعلق، ان کے چہرے پر بڑی بھیانک سی مسکراہٹ تھی۔ کمرے میں مچھر بھنبھنا رہے تھے۔ اس برجی کے مقابل میں برآمدے کے سرے پر دوسری برجی تھی۔ برآمدے میں دونوں لڑکیاں سو رہی تھیں۔ برآمدے کی چھت میں سیاہ رنگ کے شہتیر تھے۔ فرش جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا تھا۔

پرانی وضع کی مسہریاں اور تخت چاروں طرف بچھے تھے۔ تلسی کا منقش گملہ عین وسط میں رکھا تھا۔ سامنے کی دیوار پر کسی موٹے سرمنڈے مہنت کی تصویر آویزاں تھی۔ برآمدے کے سرے پر دوسری برجی، جو چھتر منزل کے رخ پر تھی، اس میں لڑکیوں کا بھائی سوتا تھا، وہ مزے سے ہلکی دلائی تانے کھڑکی کے قریب سنا رہا تھا۔ قریب ٹیبل فین گھوں گھوں کر رہا تھا۔ برجی کے آٹھوں دروازے چوپٹ کھلے ہوئے تھے اور بڑی ٹھنڈی ہوا اندر آ رہی تھی۔ کمرہ کافی وسیع تھا۔ الماریوں میں ڈھیروں کتابیں رکھی تھیں۔ فارسی، اردو اور انگریزی کی کتابیں۔ پلنگ کے نزدیک والی میز پر دیوان غالب رکھا تھا اور کبیر کی گرنتھاولی اور ایلیٹ کا ویسٹ لینڈ۔ ایک طرف کو اردو کے نئے ترقی پسند رسالوں کے انبار لگے تھے اور پانیر اور لیڈر کے پرچے اور انگریزی کے ادبی رسالے جو کلکتے اور بمبئی سے نکلتے تھے اور وشوا بھارتی میگزین دیواروں پر نندلال بوس اور اونیندر ناتھ ٹیگور اور چغتائی اور ایل ایم سین اور روی ورما کے واٹر کلرز کے پرنٹ تھے۔ کمرے میں سخت بے ترتیبی تھی۔ ٹینس کے ریکٹ پر ٹائیاں پڑی تھیں۔ گیند کے ڈبوں میں موزے ٹھنسے تھے۔ مسہری کے سرہانے دیوار پر جواہر لال نہرو کی تصویر تھی جس میں وہ نینی جیل سے باہر نکل رہے

تھے، ایک تصویر کملا نہرو کی تھی ۔ آ ٹھوں دروازوں کے درمیان جو جگہ خالی بچی تھی اس پر یونیورسٹی کے گروپ فریم آویزاں تھے ۔ ۱۹۳۷ء ۔ ۱۹۳۸ء ۔ ۱۹۳۹ء ۔ آل انڈیا مباحثوں میں جو ٹرافیاں جیتی گئی تھیں ان کے گروپ ۔ یونین کے عہدیداروں کی تصویریں، ہسٹری سوسائٹی اور انگلش ڈیپارٹمنٹ کے گروہ جس میں لڑکے اپنے پروفیسروں کے ساتھ بیٹھے تھے ۔ پروفیسر سدھانت، ڈاکٹر راؤ، مسٹر سی ۔ جی ۔ رائے ایک کونے میں آ تشدان کے اوپر ایک گروپ تھا جو اب بالکل پیلا پڑ چکا تھا ۔ اس تصویر پر ۱۸۹۷ء لکھا تھا، یہ گروپ بھی کیننگ کالج کا تھا ۔ یہ تصویر اس لڑکے کے باپ کے زمانہ طالب علمی کی تھی، اس میں اس لڑکے کا باپ گول کالی ٹوپی اور بند کالر کا کوٹ پہنے بڑی مستعدی سے فیکلٹی آف آرٹ کے ڈین ڈاکٹر منورنجن دت مرحوم کے پیچھے کھڑا تھا ۔ ڈاکٹر دت کی ٹیگور کی ایسی یہ لمبی سفید داڑھی تھی (یہ دوسری بات ہے کہ ہر داڑھی والا بنگالی ٹیگور کا ایسا نظر آتا ہے جس طرح ہر داڑھی والا انگریز کنگ جارج پنجم معلوم ہوتا ہے) اور وہ اپنی چھڑی پر دونوں ہاتھ رکھے کیمرے کو بہت گھور گھور کر دیکھ رہے تھے ۔

اسی طرح گھر کے سارے کمروں میں ان گنت تصویریں آویزاں تھیں ۔ کانگریس کے اجلاس میوزک کانفرنسوں کے گروپ جس میں پٹنے، مہاراشٹر، گوالیار اور الور کے استاد لوگ بڑے بڑے پگڑ باندھے بیٹھے تھے ۔ چیمبر اوف پرنسز کے گروپ ۔ نچلی منزل میں ڈرائنگ روم کے آتشدان کے اوپر ایک روغنی تصویر لگی تھی جس میں ایک دقیانوسی بوڑھا سبز گوٹ کا جامہ اور چنا ہوا پائجامہ پہنے، سر پر مندیل اوڑھے منقش کرسی پر بیٹھا تھا ۔ یہ تصویر شاہی کے زمانے میں انگریز

مصور نے بنائی تھی اور اس کے نیچے اردو میں لکھا تھا: ''رائے زادہ بخشی مہتاب چند''
چند تصویریں پرانے وقتوں کی دلہنوں کی تھیں اور ایسی بیبیاں جو اونچی ساڑھیاں
باندھے، انگریزی جوتے پہنے، ایک ہاتھ میز پر ٹکائے کھڑی تھیں۔ میز پر موٹی
موٹی کتابیں یا گلدان رکھے تھے۔ اس کوٹھی میں تین برجیاں تھیں۔ تیسری برجی
میں لکڑی کا فرش تھا۔ یہاں ساز رکھے تھے اور لڑکیاں شام کو جب سورج بخش
صاحب آتے تھے تو ان سے گانا اور ناچ سیکھتی تھیں۔

یہ کوٹھی اس کے مکینوں کے لئے مرکز کائنات تھی۔ (ہر گھر اپنے مکینوں کے
لئے مرکز کائنات ہوتا ہے)

یہاں سے اپنے پیاروں کی ارتھیاں نکلیں، دلہنوں کے ڈولے آئے، براتیں
چڑھیں، بیٹیاں وداع ہوئیں، بڑے بڑے تہوار منائے گئے۔ رام نومی اور جنم
اشٹمی اور دیوالی اور شوراتری۔ یہاں بچے پیدا ہوئے۔ لڑائیاں جھگڑے ہوئے،
لوگ ہنسے اور روئے، ہر گھر میں یہ سب ہوتا ہے۔ گھر خاموشی سے یہ سب دیکھتا
رہتا ہے۔ اس کی داستان پر کوئی کان نہیں دھرتا۔ اس کی وقت سے ہمیشہ ٹھنی رہتی
ہے۔ دیکھتا ہوں تم میرا ساتھ کب تک دیتے ہو۔ تم میری نشان دہی کب تک
کرتے رہو گے۔ وقت کہتا ہے۔ گھر پھر بھی خاموش رہتا ہے۔ برس گزرتے
ہیں۔ صدیاں بدلتی ہیں۔ موسم پلٹ پلٹ کر آتے ہیں۔ گھر وقت کی ندی میں
چھوٹے سے جہاز کی طرح لنگر انداز رہتا ہے، کبھی کبھی لہریں اسے بہالے جاتی
ہیں، پھر اس کا نام ونشان بھی نہیں ملتا۔

یہ کوٹھی نواب سعادت علی خاں کے عہد میں ان کے مقرب خاص اور اودھ کے

وزیر مالیات رائے زادہ بخشی مہتاب چند نے بنوائی تھی، اس وقت ان کے پڑپوتے اس میں براجمان تھے جو اوسط درجے کے بیرسٹر تھے۔ ان کا ایک لڑکا تھا اور دو لڑکیاں، تینوں ابھی طالب علم تھے۔

بیرسٹر صاحب کا سارا وقت کانگریس کے چکر میں نکل جاتا یا وہ بیٹھ کر زمانہ فراغت میں اردو شاعری پر مضمون لکھتے، پھر پریکٹس کی طرف توجہ کون دے، مگر گھر کی زمینداری تھی اس لیے آسائش سے بسر ہو رہی تھی۔ دونوں لڑکیوں کے جہیز تیار تھے۔ لڑکے کو وہ کیمبرج بھیجنے کی سوچ میں تھے، جہاں انہوں نے خود پڑھا تھا۔ اس سے وہ برساتی کے اوپر جو کھلی چھت تھی اس پر مچھر دانی لگائے پڑے سوتے تھے۔ بی بی کی کھڑ پڑ کی آواز نے ان کو جگا دیا۔ بی بی میں یہی تو ایک بری عادت تھی کہ صبح صبح اپنی کھڑاوں کی آواز سے سارے گھر کو جگا دیتی تھیں، کبھی گودام کا دروازہ کھول رہی ہیں، کبھی نعمت خانے کی الماری بند کر رہی ہیں، کبھی اس کمرے میں جا رہی ہیں کبھی اس کمرے میں۔ اس کے بعد وہ پوجا کرنے بیٹھ جاتی تھیں اور زور زور سے رامائن پڑھتی تھیں۔

بڑی سہانی ہوا چل رہی تھی۔ سامنے ندی پر ابھی دھند لکا چھایا تھا، مکمل سکون سارے میں طاری تھا۔ مقابل میں ندی کے دوسرے کنارے پر چھتر منزل اور شاہ نجف اور موتی محل کے گنبد اودے رنگ کے کہرے میں چھپے تھے۔ موتی محل برج پر ابھی سناٹا تھا، پل کے نیچے مندر میں گھنٹے بجنا شروع ہو گئے تھے۔

پھر نیچے کی منزل کے دروازے کھلے۔ ترلوچن نے جھاڑو لگانے پر کمر باندھی۔ بستر لپیٹے گئے۔ صراحیاں اٹھا کر اندر رکھی گئیں۔ "اٹھو بیٹا جلدی کرو۔

تمہر اسکول آج سے سبیرے کا ہوئے گوا۔۔۔'' جمنا مہری نے آن کر چھوٹی لڑکی سے کہا،لڑکی ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھی۔جلدی سے اس نے تکیے کے نیچے سے گھڑی نکال کر دیکھی، پانچ بج گئے۔ارے رام رے۔آج سے اسکول کھل رہا تھا، وہ پلنگ پر سے کود کر تیزی سے غسل خانے کی طرف بھاگی۔

بڑی لڑکی نے کاہلی سے کروٹ بدل کر آنکھیں کھولیں اور ندی کی اور دیکھتی رہی، وہ سترہ اٹھارہ سال کی رہی ہو گی۔۔۔کالج میں پڑھتی تھی اور اس کا کالج چودہ جولائی کو کھلتا تھا۔جلد اس کی شادی ہونے والی تھی اور اسے کالج والج کی چنداں پرواہ نہیں تھی،وہ اطمینان سے لیٹی ندی کو دیکھتی رہی۔

برجی والے کمرے میں سے نکل کر اس کا بھائی چپل گھسیٹتا انیچیوں کی طرح باہر آیا اور وہ بھی برآمدے کے ایک ستون کے پاس ٹک کر کاہلی سے ندی کو دیکھنے لگا، جدھر پل تھا۔اس نے ایک زوردار انگڑائی لی اور تولیہ کاندھے پر ڈال کر بے سری آواز میں گاتا غسل خانے میں گھس گیا۔

''اسکول میں اپنی گوئیاں سے کہہ دینا شام کو آ کر بڑی کے لہنگے کی گوٹ ختم کر ڈالیں۔'' گھر کی بی بی نے ٹھا کر دوارے سے باہر نکل کر چھوٹی لڑکی کو آواز دی جو بالوں کی دو چوٹیاں گوندھے ہلکا نیلا ٹیونک پہنے، جس کی پیٹی سرخ رنگ کی تھی، کتابیں اٹھائے زینے کی طرف بھاگ رہی تھی۔نیچے برساتی میں لامارٹینئر کی بس نے ہارن بجایا۔''اچھا۔اچھا کہہ دوں گی۔'' اس نے سیڑھیاں اترتے ہوئے مڑ کر جواب دیا۔

گھر کی بی بی خالص پوربی تھیں۔شادی ہو کر لکھنؤ آئے ان کو پچیس سال گزر

چکے تھے مگر اپنے لب و لہجے پر انہوں نے لکھنؤ کی اور اپنی سسرال کی ٹکسالی اردو کا ذرا اثر نہیں ہونے دیا تھا، وہ بڑی بیٹی کو بڑکی کہتی تھیں، چھوٹی کو چھٹکی، جیٹھ بڑ کو کہلاتے تھے۔ ماں مہتاری، متیاں منٹی۔ بیرسٹر صاحب ان کو بمبئی، کلکتہ، کشمیر سب جگہ گھمالائے تھے، ہر سال نینی تال اور مسوری جاتی تھیں مگر کیا مجال جوان کی وضع میں فرق آیا ہو۔

اتنے میں بڑی لڑکی نے برآمدے سے نیچے جھانکا، نیچے باغ کی سڑک پر اسکول کی بس کھڑی تھی جس میں چند ہندوستانی لڑکیوں کے علاوہ سب انگریز لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ ہندوستانی لڑکیوں میں سے ایک نے کھڑکی میں سے سر نکال کر ہاتھ ہلایا: ''ہم لوگ شام کو آئیں گے۔ میرس کالج سے لوٹ کر۔''

''اچھا'' بڑی لڑکی جواب دیا۔

بس پھاٹک سے باہر نکل گئی۔

اس کے بعد لڑکا سیٹی بجاتا نیچے اترا، برساتی میں اس کی سائیکل کھڑی تھی۔ اس نے ایک نوٹ بک بڑے اسٹائل سے سائیکل کے ہینڈل میں اٹکائی اور بے فکری سے پیڈل چلاتا کچی سڑک پر آ کر یونیورسٹی کی طرف روانہ ہو گیا جس کی سنگ سرخ کی برجیاں دور دھندلکے میں نظر آ رہی تھیں۔

سورج نکل آیا، اب دنیا اپنے کاروبار میں مصروف ہوئی۔ عدالتیں، دکانیں، کالج، سرکاری دفاتر، اخبار کے پریس، ریڈیو اسٹیشن، کونسل چیمبر، کارخانے، جیل۔۔۔خلقت زندہ رہنے میں مصروف رہی۔

پھر شام ہوئی، روشنیاں جگمگائیں۔ بازار، محلے، کوٹھیاں، سینما ہاؤس، کلب،

بال روم، محل سرائیں، جھونپڑیاں۔

ندی کے کنارے اس کوٹھی کے برآمدے میں سے لڑکیوں کے قہقہوں کی آوازیں بلند ہوئیں، یہ چار پانچ نوعمر لڑکیاں برآمدے کے جنگلے پر بیٹھی اس طرح ہنستی تھیں جیسے رنج سے نا آشنا ہیں۔ شاید وہ رنج سے نا آشنا تھیں۔

چھتر منزل کے پیچھے سورج ڈوبا۔ ندی کے کنارے کنارے ڈونگیوں میں چراغ جلے۔ ندی نے اپنا سفر جاری رکھا۔

## ۳۵

سورج جس سے جامنوں کے پیچھے پہنچا تب فٹن میرس کالج سے لوٹ کر اپنی تلی رفتار سے چلتی ندی کے پل پر آ جاتی تھی، یہ وقت عموماً جھٹ پٹے سے ذرا بعد کا ہوتا تھا۔ ندی کے پل سے اتر کر ایک سیدھی شفاف سڑک یونیورسٹی روڈ کہلاتی تھی اور اس کے دونوں طرف دریا کے کنارے کنارے دو کچے راستے جاتے تھے، ایک راستہ پل سے اتر کر یونیورسٹی بوٹ کلب، آرٹ اسکول اور ندوۃ العلماء کی طرف جاتا تھا، دوسرا کچا راستہ کاٹھ کے پل کی سمت۔۔۔ یہاں سے ندی کے کنارے کنارے چاند باغ تک نئی کوٹھیاں بنی تھیں۔ یہ علاقہ ٹرانس گومتی سول لائنز اور حیدرآباد کہلاتا تھا، یہاں بے شار نئے سیمنٹ کے مکان تھے۔ بم بہادر شاہ کا دو منزلہ محل، چند پرانی کوٹھیاں بھی تھیں جیسے کالا کنکر ہاؤس اور سنگھاڑے والی کوٹھی اور آگے بڑھ کر نشاط گنج کی بستی تھی۔ رائے بہاری لال روڈ،

جس کا ایک سرا یونیورسٹی روڈ پر تھا۔ بل کھاتی اس علاقے سے گزرتی فیض آباد روڈ پر جا پہنچتی تھی جہاں ازابلا تھوبرن کالج تھا۔ یہ بڑا خاموش اور پرسکون علاقہ تھا، کبھی کبھار کوئی موٹر نکل جاتی یا سائیکل سوار کالج کا لڑکا یا لڑکی۔ مضافات یا ڈالی گنج کی طرف جانے والے اکیلے فیض آباد روڈ پر سے گزرتے رہتے اور آگے مسلم گرلز کالج تھا۔ اس کے آگے ارہر اور گنے کے کھیت تھے اور ریلوے لائن اور ماہ نگر اور بادشاہ نگر کے چھوٹے چھوٹے اسٹیشن اور شفاف تالاب اور امرودوں کے جھنڈ۔ اس کے بعد انگریزوں کا قبرستان تھا اور ریپر مل جس کی آواز وقت کی یکسانیت کو متواتر منتشر کرتی رہتی تھی۔ اسی طرف کاٹھ کا پل بھی تھا۔ ادھر سے راستہ چریا جھیل اور بھینسا کنڈ جاتا تھا۔ ادھر سے اور آگے سکندر باغ اور بنارسی باغ اور وہ سارا علاقہ تھا جہاں گورنمنٹ ہاؤس تھا، جس کے پیچھے غازی الدین حیدر کی نہر تھی اور حضرت گنج اور لا مارٹینر کالج اور لا مارٹینر روڈ ہرے بھرے کنجوں سے نکلتی دل کشا پیلس کی طرف جاتی تھی جس کے آگے جس کے آگے وسیع سرسبز چھاؤنی تھی۔

موتی محل برج سے آگے بڑھ کر میرس کالج تھا اور قیصر باغ کی بارہ دری اور قیصر باغ۔ اس کے آگے امین آباد پارک تھا اور امیر الدولہ پارک، اور شہر۔۔۔ اور جھاؤ لال کا پل اور پھر سڑکیں نخاس اور چوک کی طرف جاتی تھیں جہاں میڈیکل کالج تھا اور ہسپتال، شاہ مینا کی درگاہ اور امام باڑہ آصف الدولہ، مچھی بھون اور امام باڑہ حسین آباد، وہیں اکبری دروازہ تھا اور گول دروازہ۔ یہ سارا علاقہ پرانا لکھنؤ تھا۔۔۔ یہ نئے لکھنؤ سے بہت دور تھا مگر نئے لکھنؤ میں بھی پرانا شہر ہر جگہ موجود تھا۔ شاہی کی ایک کوٹھی کی جگہ گورنمنٹ ہاؤس کھڑا تھا۔ ندی کے

کنارے موتی محل میں امپیریل بنک تھا۔ حضرت گنج کے عین وسط میں بیگم کوٹھی تھی۔ چھتر منزل میں کلب تھا، یہ بڑا وضع دار شہر تھا۔ یہاں کی چیزیں نئی ہو کر بھی قدیم تھیں، نو دولتے پن کا اظہار یہاں کی کسی عمارت سے نہیں ہوتا تھا۔ اس شہر میں وقت نے بڑی گمبھیرتا اور ٹھیراؤ کے ساتھ گزرنا سیکھا تھا۔

اس اطمینان اور آسائش کے ساتھ فٹن شام کی کاسنی گلابی نارنجی روشنی میں خراماں خراماں چلتی موتی محل برج تک پہنچتی۔ یونیورسٹی روڈ پر اس وقت کاروں اور سائیکلوں کا ہجوم ہوتا۔ پل سے اتر کر اس سڑک پر جانے کے بجائے اکثر ایسا ہوتا کہ فٹن بائیں ہاتھ والی کچی سڑک پر اتر آتی، جہاں راستہ بڑے بڑے سفید پھولوں کی جھاڑیوں سے گھر گیا تھا اور جدھر پرانے وقتوں کی چند کوٹھیاں تھیں۔

گنگا دین کوچ بکس پر بیٹھا مزے میں سر جھکائے چلا جاتا۔ ''بیٹیا سنگھاڑے والی کوٹھی نہیں چلئے گا۔؟'' وہ جھک کر دریافت کرتا۔

یہ کہانی اب یہاں سے میں سنا رہی ہوں۔ (طلعت نے کہا) داستان گوئی کے مختلف طریقے ہوتے ہیں، میری سمجھ میں ایک طریقہ بھی نہیں آ رہا، کون کردار زیادہ اہم ہیں، قصہ شروع کہاں سے ہوا۔ جی ہاں۔ قصہ شروع کہاں سے ہوا، کلائمیکس کہاں تھی۔ ہیروئن کون تھی اور اس کا انجام کیسا ہونا چاہیے تھا۔ ہیرو کون تھا۔ اس داستان کو سننے والا کون ہے اور سنانے والا کون۔ میرا بڑا بھائی کمال ایک زمانے میں کہا کرتا تھا کہ ایک دن بیٹھ کر وہ یہ سب طے کرے گا۔ کمال اب تک کچھ بھی طے نہیں کر پایا، پھر چمپا باجی سے پوچھنے بھلا کون جائے۔ 'ہاں چلیں گے' میں گنگا دین کو جواب دیتی۔ فٹن آہستہ آہستہ کچی سڑک پر رواں رہتی، یہاں ہو کا

عالم تھا، مکمل ابدی سناٹا۔ اسی راستے پر بہت آگے جا کر شمشان گھاٹ تھا۔ ندی کے پانی میں موتی محل کی روپہلی عمارت کے سائے لرزاں رہتے اور چھتر منزل کا سنہرا گنبد اور نجف اشرف کا امام باڑہ۔ ندی ان عمارتوں کی سیڑھیوں کے نیچے مودبانہ انداز میں بہتی رہتی۔ درختوں کی گھنی چھاؤں میں پانی کی موجیں گہری سبز دکھلائی پڑتیں، کبھی کبھی اس ہریالی میں سے تیرتی ہوئی کوئی ڈونگی نکل جاتی۔ سنگ سرخ کے شاندار موتی محل برج کے نیچے مندر کے چبوترے پر بندروں کا اکھاڑہ جمع رہتا۔ سنگھاڑے والی کوٹھی کی سیڑھیاں بھی پانی میں اترتی تھیں۔ یہ دومنزلہ عمارت تھی اور اپنی تین ہشت گوشہ برجیوں کی مناسبت سے سنگھاڑے والی کوٹھی کہلاتی تھی، یہ برجیاں کائی کی وجہ سے گہرے ہرے رنگ کی ہو چکی تھیں۔ برسات کے مہینوں میں یہ کائی اور ندی کا پانی اور آسمان، درختوں اور گھاس کا سبزہ، یہ سب مل کر ایک معلوم ہوتا۔ جاڑوں میں یہاں ہلکے پیلے رنگ کی روشنی پھیلی رہتی۔ کہر آلود درختوں کے پیچھے سے سورج نکلتا اور اس کی زرد لکیریں سارے میں تیرتی پھرتیں، جن میں آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر دیکھو تو رنگ برنگے ذرے اڑتے نظر آتے۔ چاند باغ جاتے ہوئے اوورکوٹوں میں ناکیں چھپائے لڑکیاں جلدی جلدی صنوبر کے جھنڈ کی اور بڑھتیں اور گھاس پر شبنم کے بڑے بڑے قطرے پیروں میں آ کر ادھر ادھر لڑھک جاتے۔ جاڑوں میں شام کو سورج بہت جلد غروب ہو جاتا۔ چنانچہ فٹن بڑھتی ہوئی مدھم خنکی میں چھ سات بجے پل پر آ جاتی۔

''بیٹا۔۔۔۔نرملا بٹیا کے یہاں نہیں چلئے گا؟'' گنگا دین کوچ بکس پر بیٹھے

بیٹھے کاہلی سے پوچھتا۔

اور پھر فٹن سڑک کے نشیب میں اتر کر ایک دھچکے کے ساتھ سنگھاڑے والی کوٹھی میں داخل ہو جاتی۔

''یہ لو بھین تمہارا آمد نامہ دے گئے ہیں۔'' لاج برساتی کی چھت پر سے آواز لگاتی۔۔ بھین یعنی شنکر سو یواستو ا یونیورسٹی میں تھا اور فارسی میں ایم۔اے کر رہا تھا۔

نرملا برجی میں کتھک کا کوئی نیا توڑا شروع کر دیتی۔ ''اے۔۔ ذرا آ کر جھپ تال تو بجا دینا۔''

وہ برجی کے کسی دوارے میں منہ نکال کر کہتی۔

ان کی اماں ٹھاکر دوارے میں چراغ جلانے کے بعد دوسری برجی میں سے آواز دیتیں:

''اری باؤلیو۔۔۔ پہلے کھانا تو بھتر لیو۔۔۔''

نرملا کی بڑی بہن لاج اطمینان سے آلتی پالتی مار کر برآمدے میں ندی کے رخ بیٹھ جاتی۔ ''اب یہ بتلاؤ کہ گیان نے کسم کو کیا جواب دیا؟''

میرس کالج کی سیاست شروع ہو جاتی، لاج وہاں سے ففتھ ایر پاس کر چکی تھی اور اب بی۔اے کے بعد اس کا بیاہ ہو جائے گا۔

''راجکماری شو پوری لاہور جا رہی ہیں۔''

''لاہور۔۔۔؟ ارے باپ رے باپ۔''

لاہور بہت دور تھا، بالکل دوسرا کرہ کہئے۔ ایسا ہی تھا جیسے کہہ دیتے راجکماری

سنگاپور جا رہی ہیں۔

''افوہ۔'' گھنگرو باندھے باندھے باہر آ کر نرملا اظہار خیال کرتی، پہلے وہ بھی میرے ساتھ میرس کالج میں تھی لیکن پچھلے سال جب وہ بیمار پڑی تو ڈاکٹروں نے کہا کہ اسکول اور میرس کالج کی دہری محنت اس سے نہ کروائی جائے۔ اب ہماری دوست مالتی کے بڑے بھائی سورج بخش سویاستوا، جو نابینا تھے اور میرس کالج کے اسٹاف پر تھے، شام کو آ کر اسے ایک گھنٹہ ریاض کرا دیتے تھے اور شمبھو مہاراج کے گھرانے کے ایک کتھک سے وہ ناچ سیکھ رہی تھی۔ لا مارٹینر میں نرملا میری ہم جماعت تھی۔ ہم دونوں دو سال بعد سینئر کیمبرج کریں گے۔

''کتنی عجیب بات۔ یعنی ہم میں سے ایک لاہور جا رہا ہے۔ ارے واہ۔'' اس نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''میرا بھی بڑا جی چاہتا ہے کہ انوکھی جگہیں دیکھوں'' اس نے گویا اپنے خطرناک ارادوں کا اظہار کیا۔

''پنجاب ہے نا۔۔۔ وہاں ان کی یونیورسٹی بھی ہے، اس میں وہ ہونے والا ہے، وہ کیا ہوتا ہے۔ ارے بھئی اس میں سنا ہے میوزک کی کلاسیں کھلنے والی ہیں۔ اس میں راجکماری اپنے پڑھایا کریں گی مگر ابھی تو وہ اندر جیت کی شادی میں شرکت کرنے جا رہی ہیں۔''

اندر جیت کور دہرہ دون کی ایک سکھ لڑکی تھی اور کچھ دنوں کے لیے اس نے میرس کالج میں پڑھا تھا۔

ویسے یونیورسٹی صرف ایک تھی۔ بھٹکنڈے یونیورسٹی۔ باقی کہ جو انورسٹی یعنی کیننگ کالج تھا، جس میں ہم سب کے بڑے بھائی اور بہنیں پڑھتے تھے، وہ تو

ایک قسم کا اندرلوک تھا جہاں اپنا دماغ ہی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ الجبرے پر سے سر اٹھا کر اکثر ہم لوگ حساب لگاتے: ایک دو تین چار پانچ۔۔۔ پورے پانچ سال بعد ہم اس اندرلوک میں پہنچ سکیں گے، ابھی تو ہم نے ہائی اسکول بھی نہیں کیا تھا۔

''بڑے آغا صاحب نے آج گاتری نگم کو پھر ڈانٹ پلائی۔''

''تھیوری کی کلاس کے لیے لیلا او یدی آئی تھیں؟''

''سنا ہے اب کے سے تھرڈ ایر کے ایکسٹرنل ایگزامنر وناٹک راؤ پٹوردھن ہوں گے۔''

''ارے ہائے۔۔۔ وہ بڑے سخت آدمی ہیں۔ وائیوا میں انہوں نے میرا پٹڑا کر دیا تھا۔''

لاج کہتی۔

سارے ہندوستان میں میرس کالج کی طرح کا کوئی اور ادارہ نہ تھا۔ پانچ سال کا اس کا کورس تھا۔ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کی طرح سخت۔ اس کے بعد کہیں جا کر بیچلر آف میوزک کی ڈگری ملتی تھی۔ اب اسے یونیورسٹی کا درجہ مل گیا تھا اور بھٹکنڈے یونیورسٹی آف ہندوستانی میوزک کہلاتا تھا۔ گیان، راج، لیلا، راجکماری، یہ سب لڑکیاں اب اسٹاف پر تھیں۔ تین سال قبل ریڈیو اسٹیشن کھلا تھا۔ یہ سب لوگ وہاں جاتے۔ کلاسیکل موسیقی اور ڈراموں کے لیے ریڈیو اسٹیشن سارے ملک میں مشہور تھا۔ گوہر سلطان ایک نئی دریافت تھی۔ یہ ایک پیاری سی نازک اندام قصباتی لڑکی تھی جو کوئل کی ایسی آواز میں گاتی، پھر نیاز فتح پوری کے داماد مجد دنیازی تھے۔ طلعت محمود سے ابھی کوئی واقف نہ ہوا تھا۔ ارچنا لہری تھی اور بہت سی بنگالی

لڑکیاں۔سورج بخش سریواستوا تھے۔ پرنسپل رتن جھنکر۔الیاس خانے اور جانے کون کون۔۔۔۔ایک سے پائے کا کلا کار پڑا تھا۔

''پر راجکماری ہم سے الگ اتنی دور جا کر بور نہیں ہو جائیں گی۔؟'' نرملا نے فکرمند ہو کر پوچھا۔

''جب بھین اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے جلسے کے لیے کراچی گئے تھے تو مجھے بھی سنگ لے گئے تھے۔۔یاد ہے۔؟ لاہور تو اتنا دور بھی نہیں ہے۔'' لاج کہتی۔

''مجھے بھی دنیا گھومنے کا شوق ہے۔'' میں فوراً اپنے سمندری سفروں کا حوالہ دیتی، مگر کراچی کی سیاحت کی بات ہی اور تھی۔ میں رشک کے ساتھ لاج کو دیکھتی۔ ''تم کو کیا پتا اونٹ گاڑی کیسی ہوتی ہے۔ میں نے دیکھا ہے۔'' لاج رعب سے مطلع کرتی۔

ندی میں ڈوبتے سورج کی کرنیں اب رنگ برنگی لہروں پر چم چم کرتیں۔ ساری دنیا، کائنات، زندگی پیش منظر کا جو دھندلا سا الکل پچوخا کہ ہمارے ذہنوں میں تھا وہ ہمارے سامنے ان لہروں پر ناچتا رہتا۔شاہی کے زمانے کی عمارتیں (ہم خود شاہی کے زمانے کی ایک عمارت میں موجود تھے)، دور سنگ سرخ کا پل، بوٹ کلب کی ڈونگیاں، سنگھاڑے والی کوٹھی کی محفوظ کائی آلود سیڑھیاں۔جغرافیے کے ماہرین کی طرح ہم دماغ پر زور ڈال کر سوچتے۔اس کے آگے کیا ہے۔۔اور کیا کیا ہوتا ہے۔

''آپی بدا ہو کر کہاں جائیں گی؟'' اکثر نرملا کچھ سوچتے سوچتے عجیب سے سوال کر بیٹھتی۔

''وہیں جائیں گی جہاں بھیا صاحب لے جائیں گے اور کہاں جائیں گی۔''

میں جھنجھلا کر جواب دیتی۔

''بھیا صاحب کہاں جائیں گے۔''

''کیا معلوم۔'' میں سٹ پٹا جاتی۔

(اب کمال اپنے کونے میں سے اٹھ کر باہر آیا اور بالکنی کے ایک ستون سے ٹک گیا۔ گویا طاعت کی بات ختم کرنے کا انتظار کرتا ہو۔ اس کے بعد اس نے گویا کیو لے کر کہنا شروع کیا):

بھیا صاحب جو میرے چچا زاد بھائی تھے میرے بہنوئی بھی ہو سکتے تھے۔ بچپن سے میں یہی سنتا چلا آیا تھا۔ بھیا صاحب جب جوان ہو کر لکھ پڑھ کر بڑے آدمی بن جائیں گے تب اپی کو بیاہ کر لے جائیں گے۔ میرا کوئی سگا بھائی نہ تھا۔ میں بچپن سے بھیا صاحب پر عاشق تھا، وہ میرے ہیرو تھے میرے لیے گیری کوپر اور اشوک کمار سے اونچا درجہ رکھتے تھے۔ بھیا صاحب نے مجھے سینئر کیمبرج کے امتحان کے لئے مار مار کر ریاضی پڑھائی تھی۔ ان کی دل سے اتری ہوئی ٹائیاں میں بڑے چاؤ سے خود پہن لیتا تھا۔ بھیا صاحب جو کتابیں پڑھتے وہی میں پڑھتا۔ ان کو بٹی ڈیوس سے نفرت تھی۔ میں نے بھی بٹی ڈیوس کے فلم دیکھنے سے توبہ کر لی۔ پہلے وہ فارورڈ بلاک میں تھے۔ مجھے نیتا جی کا فلسفہ سمجھایا کرتے۔ میں بھی ان کے ساتھ جلسے جلوسوں سے واپس آ کر رات کو سوتے میں انقلاب زندہ باد کے نعرے لگایا کرتا، پھر جب بھیا صاحب نے مقابلے کے امتحانوں میں بیٹھنا شروع کیا میں نے اس کا اہتمام کیا کہ ان کی پڑھائی میں خلل نہ ہو، ان کے کمرے

کی طرف کوئی نہ جائے، وہ عموماً لان پر بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے، سیمل کے درخت کے نیچے۔

بھیا صاحب برسوں سے ہمارے یہاں رہتے آئے تھے۔ دراصل کسی کو اس کا احساس نہ تھا کہ ہمارے یہاں، ان کے یہاں، سے مختلف کوئی چیز ہے۔ جب چچا ابا کا سوئٹزرلینڈ میں اچانک انتقال ہو گیا وہ بھیا صاحب سے ملنے وہاں گئے ہوئے تھے۔ اس وقت بھیا صاحب لوزان کے ایک سکول میں پڑھتے تھے۔ ان کو سوئٹزرلینڈ سے واپس بلا لیا گیا۔ بھیا بمبئی سے سیدھے ہمارے یہاں الموڑے پہنچے تھے۔ ابا میاں ان دنوں الموڑے میں تعینات تھے۔ برساتی میں وہ فل بوٹ پہنے کھڑے تھے۔ اپنے سوئس اسکول کے سبز اور سیاہ دھاریوں والے مفلر میں ان کا چہرہ تقریباً چھپا ہوا تھا۔ ان کی آنکھوں کے پپوٹے روتے روتے سوج گئے تھے اور ان کی ناک سرخ ہو رہی تھی۔ اپنے امنڈتے ہوئے آنسوؤں کو روک کر انہوں نے مجھے اور اپی کو اپنے قریب بلایا اور ہم دونوں کو اپنے بازوؤں کے حلقے می لے کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ طاعت اس وقت بہت چھوٹی تھی اور گھر کے دوسرے بچوں کے ساتھ الا پچی کے درخت پر چڑھی ہوم ورک کر رہی تھی۔

الا پچی کا درخت ہم لوگوں کی زندگیوں میں خاص اہمیت رکھتا تھا۔ یہ پہلو کے برآمدے کے قریب تھا۔ اس کے سامنے لان تھا۔ اس درخت پر بیٹھ کر ہم اسکول کا کام کرتے۔ اکثر کھانا بھی وہیں کھاتے۔ جاڑوں میں اسی کے نیچے اسنو مین بنایا جاتا۔

اس کے بعد سے بھیا صاحب مستقلاً ہمارے یہاں رہنے لگے۔ بابا ان کو دیکھ

کر جیتے تھے۔ممی ان پر عاشق تھیں۔ان کی امی کا انتقال بہت پہلے ہو چکا تھا۔سارا کنبہ، ساری برادری، سارا قصبہ ان کے نام کی مالا جپتا۔

بھیا صاحب چچا ابا مرحوم کی اکلوتی اولاد تھے۔ ہمارے آبائی قصبے کلیان پور میں، جو گھاگھرا کے کنارے آباد تھا، تالاب کے کنارے ایک پھونس کا بنگلہ تھا جس میں چچا ابا کبھی کبھی آ کر رہا کرتے تھے، بھیا صاحب بھی یورپ سے لوٹ کر جب قصبے پہلی بار گئے تو اس بنگلے میں جا کر رہے۔ یہ بنگلہ چھوٹی بارہ دری کہلاتا تھا اور اس کے برآمدے میں بیٹھ کر بھیا صاحب موٹی موٹی کتابیں پڑھا کرتے۔ خاندان کو ان سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ یہ بھی اپنے مرحوم بابا کی طرح نام پیدا کریں گے۔ بڑے آدمی کہلائیں گے۔

گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد بھیا صاحب لامارٹینئر کالج میں داخل کر دیے گئے جو ڈیڑھ سو سال قبل نواب آصف الدولہ کے مقرب خاص جنرل کلاڈ مارٹن فرانسیسی کے روپے سے یورپین لڑکوں کے لیے قائم کیا گیا تھا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس داستان کے ہیرو کیا بھیا صاحب ہیں؟ میں کہانی سنانے بیٹھا ہوں تو کرداروں کے متعلق بھی تو طے کرتا چلوں۔ سوچتا ہوں، بھیا صاحب میں ہیرو والی ساری خصوصیات موجود تھیں۔ اب تک جو کچھ میں نے تمہیں بتلایا ہے تم سمجھ دار ہو، خود ہی تم نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ ایسا رومانی پس منظر ہیرو کے علاوہ اور کس کا ہو سکتا ہے۔ لازمی بات ہے کہ ہیرو لوگ چارلس بوائیر ہوتے ہیں، اگر تم قدامت پسند تماشائی نہیں ہو تو تم کو یہ جان کر بڑی جھنجھلاہٹ ہو گی کہ بھیا صاحب بھی بہت خوبصورت تھے۔ مجھے ڈرتے ڈرتے نہایت افسوس

کے ساتھ اطلاع دینی پڑتی ہے کہ بھیا صاحب عین مین چارلس بوائیر تھے ۔فرانس اور سوئٹزرلینڈ کے اسکولوں میں پڑھنے کی وجہ سے شروع شروع میں ان کا لب و لہجہ بھی بالکل فرانسیسی تھا جب وہ 'ت' اور 'ڈ' کے تلفظ کے ساتھ رک رک کر انگریزی بولتے تو مت پوچھو کہ کس طرح ازابلا تھوبرن کالج کی لڑکیوں کے دلوں پر چھریاں چلتیں۔

رہیں اپی ۔تو وہ اس افسانوی قسم کی عم زاد بہن قطعی نہیں تھیں جو اپنے اس طرح کے کزن لوگوں کے لیے پکوان بناتیں یا پل اوور بنتیں، وغیرہ وغیرہ ۔اس قسم کے مشغلے میں نے اردو افسانوں میں پڑھا ہے کہ مسلمان عم زاد بہنوں کے ہوتے ہیں ۔اپی لا مارٹینئر گرلز ہائی اسکول میں پڑھتی تھیں۔ جو نجف اشرف کے قریب ندی کے دوسرے کنارے پر خورشید منزل میں تھا۔ پہاڑی کی ڈھلان پر خورشید منزل کی اونچی عمارت، جو نواب سعادت علی خاں نے ڈیڑھ سو سال گزرے اپنی بیگم خورشید زادی کے لیے بنوائی تھی، اس کے چاروں اور خندق تھی اور یورپین وضع کے کنگورے ۔سال کے بارہ مہینے پھولوں اور درختوں کی ہریالی میں چھپی رہتی۔ گہرے نیلے آسمان کے مقابل میں اس کے اونچے کنگورے اور برجیاں دور سے بڑی واضح نظر آتیں اور ایسا جان پڑتا جیسے اٹھارویں صدی کے کسی لینڈ اسکیپ مصور کی مدھم خوشگوار شفاف رنگوں والی بڑی سی پینٹنگ منقش چوکھٹے میں جڑی سامنے دھری ہے ۔اکثر جب بنارسی باغ جاتے ہوئے پل سے اتر کر اس اسکول کے سامنے کی خاموش سایہ دار سڑک پر سے گزرتا تو اپی مجھے قلعے کے کسی دریچے میں کھڑی کسی لڑکی سے باتیں کرتی نظر آتیں۔ اس منظر میں بڑا ناقابل بیان

سکون رچا تھا۔

بھیا صاحب ہرے بھرے کنجوں، طویل بل کھاتی شفاف سڑکوں اور باغات کے اس سلسلے کے دوسری طرف لڑکوں کے لا مارٹینئر کالج میں پڑھتے تھے۔ کالج کے وسیع تالاب کے کنارے وہ اپنے انگریز ہم جماعتوں کے ساتھ کوئی کتاب ہاتھ میں لیے آہستہ آہستہ فرانسیسی لہجے میں باتیں کرتے یا ٹہلتے یا کبھی کبھی کسی بات پر کھلکھلا کر ہنس پڑتے۔ ان کی طبیعت میں جو دھیما پن، جو کھوئی کھوئی اداسی تھی اس نے ان کو اور زیادہ رومینٹک بنا دیا تھا۔

دیکھیے، میں عرض کروں، مجھے اس لفظ رومینٹک سے دلی نفرت ہے۔ یہ کوئی میں خواتین کے رسالے کے لیے بالاقساط ناول نہیں لکھ رہا ہوں جس میں سوا چاندنی رات اور گلاب کے شگوفوں اور والٹس کی موسیقی کے اور کچھ نہیں ہوتا اور جن کا ہیرو اچھا خاصا ہسپانوی بل فائٹر نظر آتا ہے۔ اسے حسن اتفاق کہیے اور بحیثیت قصہ گو میری بدقسمتی کہ بھیا صاحب فرانسیسی لہجے میں بات کرتے تھے اور لا مارٹینئر میں پڑھتے تھے اور دھیمی دھیمی آواز میں ہنستے تھے۔

سینئر کیمبرج کے بعد بھیا صاحب انٹرمیڈیٹ کے لیے کالون تعلق دار کالج میں آ گئے جو ہمارا خاندانی کالج تھا اور جہاں ہمارے گھرانے کے افراد کئی پشتوں سے پڑھتے چلے آ رہے تھے۔ میرے اور ہری شنکر کے باپ دادا سب نے یہیں پڑھا تھا۔ یہاں بھیا صاحب دوسرے ڈیکیڈنٹ رئیس زادوں کے ہمراہ شہسواری کرتے اور ستار بجاتے۔ سال بھر بعد وہ سڑک عبور کر کے کیننگ کالج میں داخل ہو گئے اور کئی برس تک یونیورسٹی کے ورنداابن کے کنہیا بنے رہے۔

اپی اور بھیا صاحب ایک دوسرے کے معاملات میں دخل نہیں دیتے تھے۔ ان دونوں کی الگ الگ ٹیمیں تھیں۔ اپی بھیا صاحب کے دوستوں میں کیڑے ڈالتیں، یہ اپی کی سہیلیوں کی نقلیں اتارتے۔ ان دونوں میں ہمیشہ تلے اوپر کے بہن بھائیوں کی طرح لڑائی ہوا کرتی۔ لاج وتی سریواستو اپی کی سب سے پیاری گوئیاں تھیں۔ یہ میرے چہیتے جان کے ٹکڑے دوست ہری شنکر کی بہن تھی۔ جانے کیوں، پر اکثر ایسا ہوا کہ چمپا باجی کا ذکر سنتے ہی لاج ایک دم چپ ہو جاتی۔ اپی بے پرواہی سے بیٹھی ہنستی رہتیں۔ ہری شنکر بے وقوفوں کی طرح سگریٹ سلگانا شروع کر دیتا۔ چمپا باجی ہم میں سے کسی ٹیم میں شامل نہ تھیں۔ یہ سب سے الگ تھیں۔ ہمارے لیے کافی اجنبی تھیں۔ ہم سب جنم جنم سے ایک دوسرے سے منسلک تھے۔ ایک ہی پس منظر اور ایک ہی طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ چمپا باجی کے پس منظر سے ہمیں واقفیت نہیں تھی۔ مجھے اکثر یہ قوی شبہ ہوا کہ چمپا باجی مڈل کلاس ہیں۔

جب بھیا صاحب لاء کر رہے تھے اس وقت چمپا باجی نے بنارس سے آ کر ازابلا تھوبرن کالج میں داخلہ لیا۔

یہ سن انیس سو اکتالیس عیسوی تھا۔

اپی لا مارٹینر اسکول سے ازابلا تھوبرن کالج آ چکی تھیں۔ بھیا صاحب ایک کے بعد معرکے سر کرتے رہے۔ یونیورسٹی کی محفلیں، سوسائٹی کے ڈرائنگ روم، ہر میدان میں ان کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ میں ان کے اے ڈی سی کی طرح ساتھ ساتھ لگا رہتا۔ نہایت عقیدت سے ان کی ہاں میں ہاں ملاتا۔

جس سال اپنی نے تعلیم ختم کی اسی سال بھیا صاحب اور اپنی کی شادی کی بات ٹوٹی۔

اب میں من میں ایک بات سوچ رہا ہوں، وہ بات یہ ہے کہ جس طرح، جس تفصیل اور وضاحت سے میں اس زمانے کی یہ کہانی دہرانا چاہتا ہوں اس میں کامیاب نہ ہوسکوں گا۔ بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں۔ بادشاہ باغ کا شاہی کے وقت کا پھاٹک جس میں یونیورسٹی پوسٹ آفس تھا۔ پھولوں کے تختے۔ سڑک پر سے گزرنے والی کہارنیں، وہ بوڑھیا جو سرخ لہنگا پہنے دوپہر کو سنسان سڑک پر املیاں چنا کرتی تھی اور جو ایک روز ٹرین کے نیچے آ کر مر گئی۔

ان سب چیزوں کی میرے لیے بے اندازہ اہمیت ہے۔ تم کو یہ تفصیلات بے معنی اور شاید مضحکہ خیز بھی معلوم ہوں گی۔ جبھی تو کہانی سنانا کوئی آسان کام نہیں۔ پلاٹ کا توازن، مکالمات کی برجستگی غیر ضروری جزویات سے احتراز۔ یہی سب تو فن افسانہ نگاری کی تکنیک کہلاتا ہے اور کیا تکنیک میں کوئی ہاتھی گھوڑے لگے ہوتے ہیں۔

میں چاہتا ہوں کہ ایسا طریقہ ہو کہ جس سے اس فضا، اس ماحول اور اس وقت کا سارا تاثر، ساری خواب آگیں کیفیت دوبارہ لوٹ آئے، کسی طرح تمہارے ذہن میں منتقل ہو جائے۔ یہ کمیونی کیشن کہلاتا ہے اور بڑی مشکل چیز ہے۔ میں آرٹسٹ نہیں ہوں، کمیونی کیٹ نہیں کرسکتا۔ طلعت شاید ایسا کر سکے۔

بہرحال تفصیلات ملاحظہ ہوں:

یہ دیکھئے۔ یہ بینٹ ہال ہے۔ میں اس کی ایک اونچی شہ نشین میں بیٹھا ہوں اور

ریڈیو کے لیے کانووکیشن کی کومنٹری سنا رہا ہوں۔ نیچے وسیع و عریض کواڈ رینگل میں سیاہ کیپ اور سیاہ گاؤن میں ملبوس مخلوق ادھر ادھر چل پھر رہی ہے۔ سرسبز گھاس کے قطعے اور سرخ اور زرد کینا اور لالہ کے تختے۔ سنگ سرخ کی عمارات کے سائے ساریوں اور سیاہ چغوں اور فیکلٹی کے زرتار منقش لبادوں کے سارے رنگ آپس میں گڈمڈ ہو گئے ہیں۔ وقت تیزی سے اڑتا جا رہا ہے۔ اس کی پرواز کی سنسناہٹ میرے کانوں میں آ رہی ہے۔ نیچے گھاس پر بہت سارے لوگ جمع ہیں اور موٹروں کی قطاریں کھڑی ہیں۔ بھیا صاحب نیچے سرخ قالینوں والے طویل راستے کے کنارے کنارے چمپا باجی کے ساتھ ساتھ چلتے دوسرے کواڈ رینگل کی طرف جا رہے ہیں جدھر ایٹ ہوم کے لیے سفید میزیں بچھی ہیں۔ لاؤڈ اسپیکر پر یکلخت نیوتھیٹرز کا نیا ریکارڈ لگا دیا گیا ہے:

''یہ کوچ کے وقت کی آواز۔'' پہاڑی سانیال کی آواز سارے میں گونجتی جا رہی ہے۔۔۔ پہاڑی سانیال بادامی ریشمیں کرتا پہنے، دھوتی کا لمبا پلو ہاتھ میں سنبھالے میرس کالج والوں کے ساتھ کرسیوں کی ایک قطار میں بیٹھے ہیں اور ہنس ہنس کر کسی بنگالی لڑکے سے باتیں کر رہے ہیں۔ دوسری طرف ازابلا تھوبرن کالج کی لڑکیوں کا پرا اپنے امریکن اسٹاف کے ساتھ گھاس پر سے گزر رہا ہے۔ سامنے سے وائس چانسلر حبیب اللہ آ رہے ہیں۔ ان کے ساتھ بہت سے جغادری پروفیسر اپنی اپنی قبائیں پہنے راستے پر رواں ہیں۔ ایک دن ایسا ہوگا جب ان انسانوں میں سے ایک باقی نہ بچے گا۔

اب میں مائیکروفون اپنے پوجیے متر ہری شنکر کے ہاتھ میں دیتا ہوں۔

ہلو۔۔۔میری آواز آ رہی ہے۔۔ہلو۔۔۔

ہلو۔۔۔ہاں۔۔۔۔

(ہری شنکر نے، جو لیمپ کے پیچھے اندھیرے میں چھپا بیٹھا تھا، جواب دیا اور ایسا معلوم ہوا جیسے اسٹیج کے باہر سے اس کی آواز مائیک پر گونجتی ہوئی آ رہی ہو، وہ خود نظر نہیں آ رہا تھا۔)

ہلو۔۔۔ہلو۔۔۔ میں، ہری شنکر، اب آپ سے بات کر رہا ہوں۔ میں ہری شنکر سریواستوا، کمال کا ہمزاد۔ لاج اور نرملا کا اکلوتا بڑا بھائی۔ چمپا باجی کا رفیق۔ میرا کردار بھی خاصا اہم ہے۔ میرے کردار کے بہت سے پہلو ہیں۔ میں کہانی میں اتنے سارے مختلف رول ادا کر رہا ہوں۔ میں بات کس طرح شروع کروں؟ اسٹیج پر کیسے داخل ہوں؟ یہ بڑا اکھیڑا ہے۔

سامنے وسیع سبزہ زار ہے۔ ہزاروں لاکھوں پھول گھاس پر کھلے ہیں۔ گلاب، لالہ، سویٹ پی۔ درختوں کی ہری نارنجی پتیاں جاڑوں کی سنہری دھوپ میں جھلملا رہی ہیں۔ اپنی گاؤن پہنے اپنے ساتھ کی لڑکیوں کے ساتھ اگلی قطار میں جا بیٹھی ہیں۔ بھیا صاحب اور چمپا باجی آم کے درخت کے نیچے کھڑے بڑی مصروفیت سے کسی دوست سے گفتگو میں محو ہیں۔ کیننگ کالج کے وسیع کواڈرینگل میں چاروں اور قالین بچھے ہیں اور صوفے اور سرخ قالینوں والے راستے ایک عمارت سے دوسری عمارت تک جا رہے ہیں۔ اب مجمع کم ہو گا۔ شام کو لڑکیوں کے غول اپنی تصویریں کھنچوانے حضرت گنج جائیں گے۔ لڑکے قہوہ خانے میں اکٹھے ہوں گے۔ یہ یہاں کی پرانی ریت ہے۔ ہر سال یہی سب ہوتا ہے، پھر ان موقعوں کے

گروپ فریم کر کے دیواروں سے لٹکا دیے جاتے ہیں اور وقت گزرتا ہے اور ان کے کاغذ پیلے پڑ جاتے ہیں۔

کمال نے شاید آپ کو بتایا ہو گا کہ میں اس کا بڑا چہیتا دوست ہوں۔ اس کی بہن تہمینہ سے، جسے گھر میں اپی کہا جاتا ہے، مجھے اتنی ہی محبت ہے جتنی لاج اور نرمل سے، لیکن میرا اور کمال کا اپی کے لیے دوڑ بھاگ کرتے کرتے ناک میں دم آ جاتا ہے۔ ''اللہ، ہری شنکر ہمرے لیے باٹا سے یہ جوتوں کی جوڑی بدلوا تے لانا۔'' اے میاں ذری آج امین آباد جاؤ تو حاجی صاحب سے کہنا ہمری ساری کب تلک رنگ کر دیں گے؟'' ''اے جناب! حضرت گنج جاتے ہیں؟ ذرا ہمارے اور لاج کے لیے ماری والوسکا کے دو ٹکٹ خرید لائیے گا۔''

''خدا کے لیے اپی آخر تمہاری وہ سائیکل کس مرض کی دوا ہے۔ ایسی کاہلی بھی کس کام کی'' میں بعض دفعہ جھنجھلا کر کہتا، ''اور اتنی بڑی جہاز کی جہاز موٹر جو گیراج میں پڑی جھک مارتی ہے، وہ کس دن کام آئے گی۔ اتنی گھام میں ایسی ایسی بیگار کروا کے ہم مزدوروں کا خون پسینہ ایک کرواتی ہو۔''

''اے بھیّن۔۔۔ میرس کالج جا کر گیان سے ملنا اور اس سے کہنا کہ نیڈل ورک کا وہ والا نمبر بھجوا دے جس میں۔۔۔'' لاج کھڑکی میں سے سر نکال کر حکم چلاتی۔

''لاحول ولا قوۃ۔'' غصے کے مارے دل چاہتا کہ ان دونوں چڑیلوں کی چٹیا پکڑ کر گھسیٹتا ہوا ندی تک لے جاؤں اور پانی میں ڈبو دوں۔

اگر مر گئیں تب بھی دونوں کے بھوت آ کر نیڈل ورک کے رسالوں اور سینما

کے ٹکٹوں کی فرمائش کیا کریں گے۔

میں ایک پیر سائیکل پر رکھتے ہوئے دوسرا برساتی کی سیڑھی پر ٹکا کر سگریٹ جلاتا اور اداسی سے دونوں کو دیکھتا رہتا۔

''میرا لائبریری کارڈ ہی کہیں گم ہو گیا۔ شنکر میاں، ٹیگور لائبریری تک جا کر۔'' اپی اطمینان سے گھاس پر بیٹھے بیٹھے آواز دیتیں۔ اب وہ یونیورسٹی میں پہنچ چکی تھیں اور ہماری مصیبتوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔

''بھیں، آج شام کو پکچر نہیں دکھلاؤ گے۔'' لاج اپی کی شہ پا کر بولتی۔

''چپ رہ چڑیل۔'' میں غراتا۔

''اچھا ہے۔ ڈانٹ لو غریب کو۔ بچاری چار دن کے لیے نہر میں مہمان ہے۔'' اپی بڑی رقت خیز آواز میں کہتیں۔

''اور کیا۔ کر لو کمینہ پن۔'' لاج حوض کی منڈیر پر بیٹھ کر پیر ہلاتے ہوئے سوں سوں کرتی۔

''ہم کوئی چمپا باجی ہیں جو ہم کو کافی ہاؤس لے جا کر آئس کریم کھلاؤ۔ ہم تو بچاری لاج اور اپی ہیں۔''

''چمپا باجی ۔۔۔ ان کا کیا ذکر ہے۔'' میں ہڑبڑا کر کہتا اور پیڈل پر زور سے پیر مار کر زناٹے کے ساتھ برساتی کے باہر نکل آتا۔

اکثر شام کو اپی اور کمال کی چھوٹی بہن طلعت میرس کالج سے لوٹتے میں میرے گھر میں رک جاتیں۔ میں اپنی برجی کی کھڑکی میں سے فٹن کو اپنی کوٹھی کی طرف بڑھتے دیکھتا۔ سڑک پر عمیق سناٹا طاری ہوتا اور اداسی اور موسم کے سارے

پھولوں کی مہک۔ندی کے پانی کی پرسکون لرزہ خیز موسیقی میرے کانوں میں پہنچتی اور جانے کا ہے سے میرا دل دھڑک اٹھتا۔میرا ہمزاد کمال کہتا تھا کبھی کبھی وہ بھی چونک پڑتا ہے۔اسے بھی بہت ڈر لگتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ ہمارے دماغوں کی ایک ایک چول ذرا ڈھیلی تھی۔

جب ہم دونوں کسی سفر سے لوٹتے تو صبح صبح ہلکے خنک دھندلکے میں سندیلے کا چھوٹا سا اسٹیشن آتا تھا۔(کمال نے کہنا شروع کیا)'یہاں لڈو ہوتے ہیں۔'

شنکر نے خیال ظاہر کیا۔عین اسی وقت ''لڈو سندیلے والے'' کی صدا سنائی دی۔سرخ بجری کے پلیٹ فارم پر نستعلیق قصباتی شرفاء انگرکھے، دو پلی ٹوپیاں، سفید ڈھیلے ڈھالے پاجامے، اجلی دھوتیاں پہنے، دوسری ٹرین کے انتظار میں اطمینان سے ٹہلتے تھے۔پلیٹ فارم کے کنارے چند پالکیاں رکھی تھیں۔

سفید پھولوں سے گھرا ہوا اسٹیشن جس کے عقب میں آم کے باغات تھے۔ باریک سرخ کاغذ میں لپٹی ہانڈیوں میں رکھے ہوئے لڈو بیچنے والوں کی صدائیں۔دور سرخ چادر اوڑھے کوئی لڑکی بدا ہو کر جھکو پھکو روتی اسٹیشن کے پھاٹک کی طرف جا رہی تھی۔اس کے آگے آگے تین چار دیہاتی چل رہے تھے۔ دولہا نے ہلدی کے رنگ کا جوڑا پہن رکھا تھا۔

میں نے برتھ پر لیٹے لیٹے ذرا سر اونچا کر کے کھڑکی سے باہر دیکھا، پھر گھڑی پر نظر ڈالی۔اوپر کی برتھ پر سے شنکر نے آواز لگائی:

''میں ذرا بھیرو کا ریاض کرنا چاہتا ہوں، اگر تم برا نہ مانو۔''

''میاں تم کو کون منع کرسکتا ہے۔تم بھیرو چھوڑ......''

''آ۔۔۔آ۔۔۔رے۔۔۔رے۔۔۔دھاپا۔۔۔گا۔۔۔اوہو۔۔ہو۔۔جا گو.

ارے۔۔بھائی جا گو موہن''۔۔۔اس نے دہاڑنا شروع کیا۔

''لاحول ولا۔۔کس قدر ایلی منٹری بھیرو۔۔۔یہ والا بھجن تو فرسٹ ایر میں سکھلایا جاتا ہے۔''

میں نے کروٹ بدل لی۔''اور دوسری بات یہ کہ میں ذرا چند لڈو کھانا چاہتا ہوں۔''میں نے اظہارِ خیال کیا۔

''اے میاں۔اے بھائی۔جہنم میں جائے تمہارا ریاض۔تم خود کسی دن مجھ سے یہی چیز درت میں سننا۔اے بھائی۔''میں نے آدھی بات شنکر سے کہنے کے بعد پھر لڈو والے کو آواز دی۔

''کہیئے مہربان۔''لڈو والے نے کھڑکی میں سے اندر جھانک کر نہایت شائستگی سے دریافت کیا۔

''جاگو۔۔۔ہی ہی۔۔اے کیا مرکیاں لیتا ہوں۔''شنکر چنگھاڑتا رہا۔

''ذرا دماغ پر زور ڈالو اور تصور کرو کہ برابر والے ڈبے سے ایک مدھر تان بلند ہو۔۔۔گوال بال سب گیین چراوت۔''

اس نے انترہ اٹھایا۔

''تمہارے درس کو بھوکے ٹھاڑے۔''میں نے غصے کے ساتھ گرج کر آواز ملائی۔''میاں شنکر یہ باتیں محض افسانوں میں ہوتی ہیں۔تم نے کانن کا وہ نیا فلم دیکھا ہے۔''جوانی کی ریت۔۔۔''کہ:

موہے ان بن یہ جلسہ سہائے نہ۔۔''

''کہاں دیکھا۔ ہم تو مرزاپور میں بیٹھے جھینک رہے تھے۔''

''کیوں گپ مارتا ہے بے۔۔مرزاپور میں جھینک رہے تھے۔تم مجھے نہ بھیجو وہاں جھینکنے کے لیے''میں نے غصے سے کہا۔

''چلا جا بھائی اللہ تو ہی چلا جا۔۔اور میری جان بخشی کر۔''اس نے ہاتھ جوڑ کر التجا کی۔

یہ مجھے معلوم تھا کہ گپ ہانکتا ہے نا معقول۔خود ہی خود بردکھوے کے لیے وہاں پہنچ گیا تھا اور مجھ پر رعب جھاڑ رہا تھا۔میں ساری چھٹیاں اکیلا مسوری میں بور ہوتا رہا اور ہری شنکر سریواستوا تھے کہ مرزا پور میں بیٹھے کجریاں الاپ رہے تھے۔اب پچھلے ہفتے اماں بیگم کا خط پہنچا کہ فوراً لوٹو۔کلیان پور سے اپی بھی لوٹ کر آ رہی تھیں۔یونیورسٹی کھلنے میں ابھی ایک ہفتہ باقی تھا مگر گھر میں ایک کرائسس درپیش تھا۔اماں بیگم نے لکھا تھا کہ خدا خدا کر کے بھیا نے بیاہ کے لیے ہاں کر دی تھی۔سب کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے کہ بھیا نے ہاں کی تو لڑکی ندارد۔اطلاع ملی کہ اپی نے انکار کر دیا ہے۔اب گھر پر ہائی کمانڈ کا اجلاس ہونے والا تھا۔شنکر بھی مرزاپور سے لوٹ آیا تھا اور لاج کے میاں سے ملنے کے لیے دلی پہنچا ہوا تھا۔میں نے مسوری سے اس کو تار دیا۔مرادآباد کے اسٹیشن پر وہ مجھ سے آن ملا۔

''بھیا کی شادی کا کیا ہوگا۔''

''بھیا نہیں۔لاج ہزمل سے پوچھنا کوئی لونڈیا ہے ان کی نظر میں۔یہ اس قدر لڑکیاں دنیا بھر میں بھری ہوئی ہیں مگر وقت پر کوئی نہیں ملتی۔''

''چمپا باجی بھی لکھنؤ پہنچ گئی ہوں گی۔کیلاش ہوسٹل ہی میں رہیں گی نا۔''شنکر

نے یکلخت بڑی سنجیدگی سے کہا۔

''پتا نہیں۔'' میں چپ ہو گیا۔ ''لاؤ ایک بیڑی دیو۔'' میں نے کچھ دیر بعد خالص یکے والوں کے لہجے میں اس سے کہا۔ اس نے خاموشی سے سگریٹ کیس اوپر سے پھینک دیا۔ میں پھر کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا۔ اب ہم تیزی سے شہر کی اور آرہے تھے۔ عالم باغ شروع ہو چکا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ میرا دماغ دراصل ایک قسم کا بھان متی کا پٹارا تھا۔ میں بہت سی باتوں کو الگ الگ کر کے ان پر غور کرنا چاہتا تھا مگر وہ پھر گڈمڈ ہو جاتی تھیں۔

چمپا باجی اس میں ایک ڈسٹرب کرنے والے عنصر کی حیثیت سے آ شامل ہوتی تھیں۔ میں ان کو نظر انداز کرنا چاہتا تھا۔ مجھے اس سے کسی چیز کی ضرورت نہ تھی۔ بجز ایک سندیلے کے لڈو کے۔ میں نے شنکر سے کہا: ''لڈو پھینکو۔''

''ساپت ہوئے۔'' اس نے اطمینان سے منہ چلاتے ہوئے کہا۔ ''کیا چمپا باجی نے منگوائے تھے؟''

''وہ مجھ سے کون سی چیزیں منگواتی ہیں۔ میں کوئی بھیا صاحب ہوں۔''

''ہاں یہ بھی ٹھیک کہتے ہو۔'' شنکر نے عقلمندی سے کہا۔ ''تم بھیا صاحب نہیں ہو، میں کمال رضا نہیں ہوں۔ اپی چمپا باجی نہیں ہیں۔ ہم سب الگ الگ ہستیاں ہیں۔ ہم اپنے اپنے دائروں میں زندہ رہیں گے۔''

''یہ ویدانت کا ریکٹ مت چلاؤ سویرے سویرے۔'' میں نے غصے سے کہا۔

''اچھا۔ لڈو لیو۔''

''تمہاری تو بڑی خاطریں ہوئی ہوں گی مرجاپور میں۔'' میں نے کروٹ

بدلتے ہوئے کہا۔

''ہاں آں۔ہوئی تھیں۔''اس نے بےتعلقی سے جواب دیا۔''مگر خاطریں تو ہماری گورکھپور میں ہوئی تھیں پچھلے سال۔''

یہ شنکر کا باقاعدہ کریز بنتا جا رہا تھا۔ہر سال گرمیوں کی چھٹیوں میں کہیں نہ کہیں بردکھوے کے لیے بلایا جاتا تھا۔ٹھاٹھ تھے بھائی کے۔

''اب تو لاج کو بدا کر کے بندہ چین کی بنسی بجائے گا۔''اس نے آرام سے لیٹتے ہوئے اظہارِ خیال کیا۔

''کمینے۔۔بہن کو بدا کرتے سمے بجائے اس کے کہ روؤ، بیٹھے خوش ہو رہے ہیں کہ اب فرصت ہے لونڈیوں میں گھومنے کی۔یہ تمہارا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا ریکٹ فراڈ ہے سارے کا سارا۔اس ہیراوتی پانڈے کا کیا ہوا۔''

''اور میں تم سے سوال کر سکتا ہوں کہ لاہور میں جو آپ وہاں کی ترقی پسند لڑکیوں سے بھائی چارہ کر رہے تھے پچھلے سال اور وہ الہ آباد میں جو تھی شولیا! بہادری۔۔۔اور۔۔۔۔''

''میاں کیوں دل کو جلاتے ہو صبح صبح۔۔''

''اور کلکتے میں جو ہے وہ۔۔۔کیا نام ہے اس کا۔۔مدھر لیکھا موجو مودور۔''

۔۔۔شنکر نے ہونٹوں کی مخروطی شکل بنا کر بنگالی لہجے میں کہا۔

''جبھی تو لاج اور ا پی کہتی ہیں کہ ہم لوگ سخت چِپڑ قناتی ہیں۔''

میں نے اعتراف کیا۔

شنکر دفعتاً بڑا اداس ہو گیا:''دیکھو بہنیں ہیں۔''اس نے کہا۔''اور وہ بدا ہو جاتی

ہیں۔"

ہاں۔میں چپ ہو گیا۔

لاج نے مجھ سے کہا تھا۔"کمال بھیا: چمپا باجی ایسی لڑکی ہیں مجھے لگتا ہے جیسے ان کی وجہ سے بہت سے لوگ بہت دکھی ہوں گے۔"لاج میں یہ چھٹا حس جانے کہاں سے آ گیا تھا۔لڑکیوں کی تھاہ کون پا سکتا ہے بھلا۔

"شنکر۔"

"ہاں یار۔"

"تزئین دریافت کریں گی اسکرپٹ مکمل کیا یا نہیں۔"

"اسکرپٹ چمپا باجی کے پاس ہے۔چلے جانا کیلاش ہوسٹل۔کیا رکھا ہے۔"

جو بات میں ختم کرنا چاہتا تھا شنکر معاً اسی نقطے پر پہنچ گیا۔

"ہاں۔۔نہیں۔۔۔پتا نہیں۔"

یہ چار الفاظ ہم سب کی زندگیوں کا گویا مکمل عنوان تھے۔

ہاں۔۔نہیں۔۔پتا نہیں۔۔

ضرور جاؤں گا کیلاش ہوسٹل۔واقعی اس میں رکھا کیا ہے آخر، وہ میرا کر ہی کیا سکتی ہیں؟ وہ پیلی رنگت والی دبلی پتلی لڑکی۔متوحش آنکھوں والی۔یونین میں تقریر کرنے کھڑی ہوتی ہیں تو گھبرا جاتی ہیں۔ابھی تک یہی طے نہیں کر پائیں کہ مسلم لیگی رہیں یا کانگریس میں شامل ہو جائیں۔ہر قسم کی عقل سے معذور۔ایک ہزار بار سمجھایا ہوائی جہاز ایسے اڑتا ہے، ریڈیو ایسے بجتا ہے، گراموفون میں آواز اس طرح بھری جاتی ہے مگر ہر دفعہ مرغے کی وہی ایک ٹانگ کہ میرے پلے تمہارا

سائنس نہیں پڑتا۔واہ کیا ادا ہے۔جی ہاں میں ان سے کوئی ڈرتا ہوں۔۔۔مطلق نہیں ڈرتا ہوں ان سے مجھ سے عمر میں ایک ہی آدھ سال بڑی ہوں گی مگر بزرگی پر اس قدر اصرار ہے کہ اگر بھولے سے باجی نہ کہا تو خفا ہو جاتی ہیں۔میں بہت معمولی ہوں۔انہوں نے بھیا سے کہا تھا۔بھیا کون آئن سٹائن تھے۔میں کون مارشل فوش ہوں پر بھیا صاحب چمپا باجی سے عشق فرما رہے تھے تو لگتا تھا ہری پورہ کانگریس کا اجلاس ہو رہا ہے یا ہاؤس اوف لارڈز میں بحث کی جا رہی ہے یا سدھانت صاحب اٹھارہویں صدی کی نثر پر لیکچر دے رہے ہیں۔

اپی نے ایسا کیوں کیا۔۔میرا مطلب ہے۔۔شادی سے انکار۔۔۔شنکر نے دفعتاً سوال کیا۔میں نے غصے سے دانت پیسے۔میں اس شنکر سر یواستوا سے عاجز تھا۔جو بات میں سوچتا تھا وہ بے تار برقی کی لہر کی طرح سے اس کے دماغ میں پہنچ جاتی تھی۔یا پہلے سے ہوتی تھی۔۔ہمزاد کی طرح کہیں اس سے مفر نہ تھی، اگر میں اس سے باتیں نہ بھی کرتا تھا تو بیکار تھا کیونکہ مجھے معلوم تھا یہ ایسا پہنچا ہوا پرم ہنس بن چکا ہے کہ اسے زبانی گفتگو کی ضرورت ہی نہیں۔ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے بھگوان کرشن اور ارجن کا درجہ رکھتے تھے۔اکثر یہ درجے ادلتے بدلتے رہتے تھے۔جب سے چمپا باجی نے بنارس سے آن کر لکھنؤ میں داخلہ لیا تھا اسے معلوم تھا کہ میں ان کے عشق حقیقی میں مبتلا ہوں۔نہایت ڈھٹائی سے وہ بھیا صاحب سے کہتا: ''چمپا باجی آپ کو بہت پسند کرتی ہے۔۔۔ویسے آپ ہیں ہی پسند کے لائق۔۔مگر یہ کہ۔۔''

اور چونکہ اپی سے بھیا کی منگنی ہو چکی تھی اور اپی بھیا صاحب کو عام ہندوستانی

لڑکیوں کی طرح اپنا دیوتا تصور کرتی تھیں اور بھیا صاحب چمپا باجی پر دم دیے دے رہے تھے لہٰذا یہ سچویشن بے انتہا گنجلک ہو گئی تھی اور یہ شنکر کا بچہ نہایت خوبصورتی سے بھیا صاحب کو سمجھاتا رہتا تھا کہ وہ سخت غلطی پر ہیں اور چمپا باجی کی ایسی لڑکیاں تو ہر سال یونیورسٹی میں آتی ہیں، اپی کا اور ان کا کیا مقابلہ، پھر اسے بھیا صاحب کے اس چیڑ قناتی پن پر غصہ آتا کیونکہ لاج کی مانند اپی کو بھی وہ اپنی ذمے داری سمجھتا تھا۔

دراصل ہم لوگوں کی اوریجنل غلطی یہی تھی کہ ہم سب ایک دوسرے کو اپنی ذمے داری سمجھتے تھے اور زندگی کے متعلق نہایت سنجیدہ اور بھاری بھر کم تصورات لیے بیٹھے تھے۔

''اپی کیا کریں گی؟ ابھی تو وہ ولایت بھی نہیں جا سکتیں۔'' اس نے فکرمندی سے کہا۔

''ولایت جانا ہی تو سارے دکھوں کا علاج نہیں ہے۔'' میں نے کہا، پھر مجھے ایک وحشت خیز خیال آیا۔۔اپی۔۔کیا لاج کی طرح میں ان کو وداع نہیں کر سکوں گا۔اپی کی شادی کس سے ہو گی؟ ان کی زندگی میں خوشی کس طرح داخل ہو گی؟ بھیا صاحب کس قدر کمینے، ذلیل انسان ہیں۔میری آنکھوں میں آنسو آ گئے،مگر بھیا صاحب تو شادی کرنا چاہتے تھے۔اپی ہی نے انکار کر دیا تھا مجھے معلوم تھا وہ کس قدر خوفزدہ ہیں۔عزت نفس۔۔۔خودداری۔۔۔وغیرہ یہ الفاظ اس عمر میں مجھے، ہم سب کو بے حد اہم اور زوردار لگتے۔ان کے الفاظ معنی بھی بدلتے رہتے ہیں۔یہ ہمیں معلوم نہ تھا۔نہ مجھے نہ اپی کو۔۔۔نہ غالباً چمپا باجی کو۔۔۔

کیونکہ ہم ابھی بہت کم عمر تھے۔

ٹرین اب مضافات میں داخل ہو رہی تھی۔ کھڑکی میں سے ہوا کا جھونکا کمپارٹمنٹ میں داخل ہوا۔اس میں آم کے پتوں کی مہک تھی۔اب میلوں دور تک عالم باغ کا سلسلہ پھیلتا آ رہا تھا۔ بارش میں بھیگی ان گنت ریل کی پٹڑیاں۔ ریلوے ورکشاپ۔ کنارے کنارے پر پھولوں میں چھپے ہوئے بنگلے جن کے سامنے اینگلو انڈین بچے کھیل رہے تھے، پھر ٹرین آہستہ آہستہ عالم باغ کو چھوڑتی ہوئی چار باغ جنکشن میں داخل ہوئی۔اسٹیشن کی سنگ سرخ کی راجپوت، مغل طرز کی سینکڑوں فلک بوس برجیوں، گنبدوں، میناروں اور شہ نشینوں والی طویل وعریض عمارات کا سلسلہ جب ایک دم آنکھوں کے سامنے آ گیا تو دل ڈوب سا گیا۔ہم لکھنؤ پہنچ گئے۔۔۔۔میں نے دل میں کہا۔گھر آ گیا۔۔۔گھر۔۔۔

پلیٹ فارم کے شفاف سرمئی فرش پر لوگ نرم روی سے ادھر ادھر چلتے پھرتے تھے۔ چیخ پکار تھی لیکن اس شوروشغب میں تیرتے ہوئے جو جملے اور فقرے کانوں میں آتے تھے وہ سرشار نے اپنے ناولوں میں لکھے تھے۔

ہم لکھنؤ پہنچ چکے تھے۔

اسٹیشن کی برساتی میں موٹر داخل ہوئی۔جسے قدیر چلا رہے تھے۔

موٹر میں بیٹھ کر ہم نے ٹرانس گومتی سول لائنز کا رخ کیا۔شنکر کو سنگھاڑے والی کوٹھی اتارتے ہوئے میں گھر پہنچ گیا۔

(اب خاموشی چھا گئی اور مکمل اندھیرا۔جیسے یہ سب کچھ یاد کرتے ہوں اور یاد نہ آتا ہو، پھر یہ ذہنی بلیک آؤٹ ختم ہوا اور کمال نے دوبارہ کہنا شروع کیا):

تیسرے پہر کا وقت تھا۔ اسٹیشن سے جب میں گھر پہنچا اپی اپنے کمرے میں بیٹھی اکنامکس کے نوٹس بنا رہی تھیں۔ اماں بیگم اور خالہ تختوں والے کمرے میں بیٹھیں تھیں۔ قدیر کی بی بی بڑی مصروفیت سے پان بنا رہی تھیں۔ میں کوٹھی کے خاموش کمروں میں ادھر ادھر گھومتا رہا، پھر میں نے اکتا کر شنکر کو فون کیا۔ معلوم ہوا اسٹیشن سے لوٹ کر نہانے اور کپڑے بدلنے کے بعد فوراً پھر باہر چلا گیا ہے۔

آخر میں نے سائیکل اٹھائی اور کیلاش ہوسٹل پہنچا، وہاں مسز وانچو سے معلوم ہوا کہ چمپا باجی ابھی نہیں آئی ہیں، وہ اپنے ماموں میاں کے یہاں وزیر حسن روڈ ہی پر ہیں۔ میں بھینسا کنڈ کی طرف روانہ ہوا۔

چمپا باجی کے ماموں میاں کے مکان میں لان پر ہمیشہ دھوپ کی سرخ اور سفید دھاریوں والی چھتریاں لگی رہتی تھیں۔ میں اندر گیا، وہ ایک چھتری کے نیچے بیٹھی تھیں، وہ بھی بڑی مصروفیت سے اکنامکس کے نوٹس بنا رہی تھیں۔

دوسری کرسی پر بھیا صاحب بیٹھے کچھ پڑھ رہے تھے۔ اے لیجئے، وہ تو یہاں موجود تھے۔ مجھے آتا دیکھ کر وہ اٹھے اور ''ہلو کمال، مسوری سے لوٹ آئے۔'' کہتے ہوئے برساتی کی طرف بڑھے جدھر ان کی سائیکل کھڑی تھی اور دوسرے لمحے وہ پھاٹک سے باہر جا چکے تھے۔

مجھے بڑا عجیب سا لگا۔

آخر میں ایک ڈک چیئر سائے میں گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

''بڑی گھام ہے۔'' چمپا باجی نے بے دھیانی میں درختوں کی اور دیکھتے ہوئے کہا۔

''بھیا اتنی جلدی اٹھ کر کیوں چلے گئے۔'' میں نے کوشش کر کے ریڈیو کے اسکرپٹ پر دھیان دیتے ہوئے کہا جو میں ساتھ لیتا آیا تھا۔ ہواپور یونیورسٹی کا کانووکیشن۔۔میں نے بیدلی سے دیکھا۔

''اللہ بہتر جانتا ہے۔۔یا تم۔۔تم ان کے کزن ہو۔۔''

''بجیا۔۔۔یہ اپنا پارٹ لیجئے۔۔۔۔''

''تمہارے گھر میں۔۔۔'' انہوں نے کاغذات اٹھا کر کہا۔''میں نے سنا ہے کہ ایک کرائسس آ گئی ہے۔''

''بجیا۔۔یہ دوسرا اسکرپٹ کملا کو دے دیجئے گا۔''

''تمہارا ہمزاد ہری شنکر۔۔۔تم نے اسے کہاں روانہ کر دیا۔۔۔آیا نہیں تمہارے ساتھ۔''

''پتا نہیں کہاں ہے اس وقت ۔۔۔دن بھر تو وہ بھیا صاحب کے ساتھ ہی گھومتا رہتا ہے۔''

''تم لوگ۔۔۔کس قدر ڈریمیٹک ہو'' ۔۔۔چمپا نے کہا۔

میں نے ان کو غور سے دیکھا، وہ میز کے کنارے انگلیاں رکھے یوں بیٹھی تھیں جیسے وہ ان کا ہاتھ نہیں تھا کہیں اور سے وہاں آ گیا تھا۔

''کہاں گئے ہیں تمہارے بھیا صاحب۔۔۔''

دیبی۔۔کیا اداس تھی۔ہم سے سے خفا تھی۔

اندر ریڈیو سے گیان وتی بھٹنا گر کے گانے کی آواز آ رہی تھی۔دنیا میں حفاظت کا احساس تھا اور سکون اور شدید اضطراب اور جولائی کی دھوپ۔

(پھر طلعت نے کہنا شروع کیا): فٹن موڑ پر سے اترتی ہوئی سڑک کے گڑھوں پر سے گزر کر ایک دھچکے کے ساتھ سنگھاڑے والی کوٹھی میں داخل ہو گئی۔
یہ اس سال کی بات ہے جب اپی

۔۔۔۔۔۔اختتام صفحہ نمبر ۲۲۴۔۔۔۔۔۔۔از۔۔شہزاد رضا

دریا۔۔۔صفحہ نمبر ۲۲۵ سے۔۔۔علی رضا صاحب۔۔۔۔۔

کی منگنی ٹوٹی۔

لاج اندر سے نکل کر آئی۔ اس نے زعفرانی ساڑے باندھی ہے۔ اس کی شادی ہو چکی ہے۔ اس کے پاؤں میں بچھوے ہیں۔ اپی اس کے ساتھ ساتھ برساتی میں آ گئیں۔ اپی نے ابھی بچھوے نہیں پہنے۔ خالی وہ لڑکیا' جن کا بیاہ ہو جاتا ہے' یہ زیور پہن سکتی ہیں۔ جب اپی کا بیاہ ہوگا اور یہ بچھوے پہنیں گی تو ان کے چھوٹے چھوٹے پاؤں کتنے خوبصورت لگیں گے۔ برآمدوں کے ٹھنڈے فرش پر ننگے پاؤں ساری کا پلو آگے ڈالے کنجیوں کا گچھا کمر میں اڑسائے وہ مصروفیت 'تمکنت اور گمبھیر تا کے ساتھ ادھر ادھر کام میں مشغول نظر آئیں گی۔

مگر بیاہ کی تو آج قدیر کی بیبی کہہ رہی تھیں کہ انہوں نے مناہی کر دی ہے

---

میں گاڑی سے کود کر اندر بھاگی۔

''اپی آپ یہاں کب سے آئی ہوئی ہیں۔ اسٹیشن سے آ کر کمال بھیا آپ کو پوچھ رہے تھے۔ ابھی جب میں شکیلہ کو اتارنے کے لیے بھینسا کنڈ کی طرح سے گزری تو وہاں چمپا باجی کے لان پر دونوں کو میں نے بیٹھا دیکھا_''

''کون دونوں ____ ''

''بھیا صاحب اور کمن بھیا ____ چھتریوں کے نیچے' وہ املتاس کا درخت نہیں ہے چمپا باجی کے ماموں کے گھر میں' وہیں۔ ہماری فٹن سڑک پر سے گزرتی دیکھ کر انہوں نے بڑے زور سے ہاتھ ہلایا اور مسکرائیں ____ بے حد خوبصورت لگ رہی تھیں۔'' میں نے مستعدی سے ایک سانس میں سب بتا دیا۔

اپی اور لاج خاموشی سے روش پر سے گزرتی برساتی اور بڑھ گئیں جیسے انہوں نے مری بات ہی نہیں سنی۔

میں چنبیلی کی جھاڑی پھلانگ کے نرملا کی اور چل دی' وہ اور مالتی رائے زادہ اوپر میوزک روم کی برجی میں بیٹھی تھیں۔

''بھین تو مرزا پور او ردلی گئے تھے نا۔'' مالتی نے پوچھا۔

''ہاں صبح ہی آئے ہیں مگر آتے کے ساتھ ہی سیدھے پہنچے چمپا باجی کے یہاں۔اس سے وہ بس ڈٹے ہوں گے۔''

''چمپا باجی کو اس روز میں نے گلیتری کے گھر پر دیکھا تھا۔لال ہری لہریے کی ساری پہنے اتنی سندر لگ رہی تھیں کہ کیا بتاؤں۔'' مالتی نے کہا۔

''بھین تو ہمارے لیے بھی اس قدر پیاری جے پوری چنری لائے تھے کہ بس۔جب کمال بھیا کے ساتھ راجپوتانہ گئے تھے۔تب' نرملا نے لاج اور اپی کی لہجے کی تقلید کرتے ہوئے کہا۔

''میں نے ایسا سندر لہنگا بنوایا ہے دیوالی کے لیے۔سیر بھر تو اس پر گوکھرو ہی ہوگی۔للولال جگل کشور کے یہاں سے۔'' نرملا نے اطلاع دی۔

یہ گوکھرو اور بنت والے جوڑے سال کے سال ہی نصیب ہوتے تھے۔ دوالی' عید' بقر عید اور بس۔ اپی وغیرہ کے ٹھاٹھ تھے کہ روز پارٹیوں کے لیے ایک سے ایک بڑیا ساریاں اور ڈھیلے پائجامے اپنی الماریوں میں سے نکالتی تھیں۔ اپنی حالت تو یہ تھی کہ صبح کو نیلا یونیفارم لادا اور پڑھنے چلے گئے۔ شام کو واپس آ کر دوسرا کوئی منحوس فراک پہنا اور تان پورہ سنبھالے میرس کالج چلے جا رہے ہیں کتوں کی طرح۔ جب سے جنگ چھڑی تھی اور پٹرول راشننگ ہوئی تھی فٹن ہی اپنی قسمت میں لکھی تھی۔ موٹر صرف والدین کی سواری کے لیے مخصوص تھی۔ عید، بقر عید اس زبوں حالی پر ترس کھا کر جوڑا بنوا دیا جاتا۔ اب اسے لادے' ہاتھوں میں ڈھیروں چھما چھم کرتی بنارس کی نگوں والی چوڑیاں پہنے بیگمات کی طرح ٹھسے سے تخت پر چڑھے بیٹھے ہیں۔ کوئی نوٹس نہیں لیتا۔ یہ کیا فینسی ڈریس کیا ہے۔ کمال دہاڑتا _____ سنا ہے آج بریلی کی ساری کاجل کی دکانوں میں ڈاکا پڑ گیا _____ بھیا صاحب فرماتے _____ یہ کاجل کی لکیر کے ایکسٹنشن کا کیا مقصد ہے _____ اگر ڈھیلا پائجامہ پہنا ہے تو قرینے سے بیٹھو' درختوں پر کیوں چڑھ رہی ہو، نیک بختو۔ خالہ بیگم کہتیں۔ تیج تہوار کا دن یوں فضیحتے میں کٹتا، پھر نرملا کی اجار (ازار یو۔ پی کی غیر شادی شدہ کائستھ لڑکیوں کا پائجامہ جو غرارے کی وضع کا ہوتا تھا) اور ہمارا ڈھیلا پائجامہ اگلے تہوار کے لیے اٹھا کر رکھ دیے جاتے۔ دوسرے دن سے پھر وہی موچی کے موچی۔

نرملا اور مالتی جب چنریوں کا ذکر ختم کر چکیں تو اب نرملا نے گہنوں کا قصہ نکالا۔ اس بھات پہ تبصرہ کیا گیا جو دے ماما لاج کے لیے لانے والے تھے۔ اس میں

زمرد کا جگنو کس قدر خوبصورت تھا۔ ہمارے مماں بھی جو بھات لے کر آئیں گے اس میں زمرد کا جگنو ہو گا' پھر اپی کو زبردستی سارے گہنے پہنے ہوں گے۔ بھیا صاحب ہاتھی پر بیٹھ کر آئیں گے' جیسے نرملا کی کزن رامیشوری کا دولہا آیا تھا۔ اپی کے چہرے پر وہ سفید سفید بندکیوں والے نقش ونگار کتنے خوبصورت لگیں گے اور افشاں اور سیندور' پھر چھاج میں سات قسم کا اناج رکھ اس میں دیا جلایا جائے گا اور اپی کے ہاتھوں میں چاندی کا کنگنا باندھا جائے گا اور رامام باندھی منگل گائے گی اور بھیا صاحب دولہا بن کر کیسے لگیں گے ________

مگر اسی وقت مجھے قدیر کی بی بی کی بات یاد آئی۔ جب میں کالج سے وٹ کر چاء کی میز پر بیٹھی تھی تو قدیر کی بی بی نے مکھن دانی سامنے رکھتے ہوئے بڑے پر اسرار انداز سے منہ لٹکا کر کہا تھا____ بڑی بٹیا نے بیاہ کے لیے مناہی کرا دی

________

''اپی کے بیاہ میں پہننے کے لیے میں تو بڑی بڑھیا ساری بنواؤں گی ______ کارچوبی______ '' نرملا کہہ رہی تھی۔

پھر دفعتاً طاعت خاموش ہو گئی۔ دیکھو' اس نے کمال سے کہا' میں نے محسوس کیا ہے کہ میرا ماضی صرف میرے لیے اہمیت رکھتا ہے۔ دوسروں کے لیے' دنیا کے لیے اس کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ ان کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی۔

''میرا ماضی محض میرا ہے۔'' کمال نے طاعت کی بات دہرائی۔

''اور دنیا کو صرف حال سے دلچسپی ہے۔'' ہری شنکر کی آواز گونجی۔

''لیکن ماضی حال ہے۔ حال ماضی میں شامل ہے اور مستقبل میں بھی۔ وقت

کی اس شعبدہ بازی نے مجھے بڑا حیران کر رکھا ہے۔''طلعت نے اداسی سے کہا۔

''میں وقت کے ہاتھوں عاجز آ چکی ہوں۔تم میں سے کوئی میری مدد نہیں کرتا۔''

''تمہاری مدد طلعت بیگم شاید آئن سٹائن بھی نہیں کرسکتا۔''ہری شنکر نے کہا۔

''میرے ماضی سے دوسروں کو کیا دلچسپی ہوسکتی ہے۔''کمال نے پھر ضد سے دہرایا۔

''وقت برابر موجود ہے۔وقت مسلسل حال ہے۔''طلعت نے کہا۔

یہ لوگ'جولندن کے ایک فلیٹ میں بیٹھے ۱۹۵۴ء میں یہ باتیں کر رہے تھے'ان کے سائے کھڑکیوں کے شیشوں پر منعکس رہے۔باہر تیز ہوائیں چل رہی تھیں۔موٹریں آ جا رہی تھیں۔ریڈیو میں بی بی سی آنا کے کسی کانسرٹ کی آواز آ رہی تھی۔

وقت کے اسی اندھیرے میں طلعت ۱۹۴۰ء کی جولائی میں سنگھاڑے والی کوٹھی کے برآمدے میں بیٹھی نرملا اور رمالتی سے باتیں کر رہی تھی۔اس طلعت میں اور اس لڑکی میں کوئی فرق نہ تھا مگر دونوں مختلف ہستیاں تھیں۔مہاتما بدھ شاکیہ منی نے کہا تھا کہ انسان ہر لحظہ بدلتا رہتا ہے۔انسان بچپن میں کچھ اور ہوتا ہے اور جوانی اور بڑھاپے میں کچھ اور تم اس لمحے سے پہلے نہیں تھے۔صرف تسلسل باقی رہتا ہے۔پہاڑوں پر گلیشئر ٹوٹ ٹوٹ کر بہہ رہے تھے۔ہوائیں۔اندھیرا۔وقت جو سیال تھا۔وقت جو برف میں منجمد تھا۔

''ہم اپنا قصہ دہرا کر اپنا اطمینان کرنا چاہتے ہیں۔''ہری شنکر نے کہا''کیونکہ ہم بہت خوفزدہ ہیں۔''

''ہم وقت سے اور اندھیرے سے خوفزدہ ہیں کیونکہ وقت ایک روز ہمیں مار ڈالے گا اور اندھیرا ہماری آخری جائے پناہ ہوگا۔''طلعت نے کہا۔

''اور گوتم نیلمبر کا ذکر یہاں نہ کرنا۔تم اصل موضوع سے بہت دور ہٹ رہے ہو۔طے یہ کرنا ہے کہ زندگی میں اصل موضوع کیا ہے۔''کمال نے کہا۔

''میں چودہ سال قبل بھی موجود تھا اور اگر زندہ رہا تو چودہ سال بعد ہری شنکر ہی سمجھا جاؤں گا اور جب وقت کے سارے تجربے یہ اپنے اوپر کرلیں گے تو یہ جو چھوٹے چھوٹے گنی پگ ہیں تب یہ تینوں مر جائیں گے اور ان کے علاوہ اور سب بھی جن کا اس کہانی میں ذکر ہے۔''
ہری شنکر نے کہا۔

(وقت کے پیٹرن میں طلعت جہاں بیٹھی تھی وہی طلعت اس پیٹرن میں ایک جگہ اور موجود تھی اور دونوں نقطوں کے درمیان برسوں کا فاصلہ تھا اور اس فاصلے پر انسان صرف آگے کی سمت چل سکتا تھا۔آگے اور آگے۔پیچھے جانا ناممکن تھا۔گو ہزاروں طلعتیں ان گنت ٹکروں میں منتشر ان گنت جگہوں پر موجود تھیں۔جیسے آئینے کے ٹوٹے ہوئے ٹکروں میں ایک ہی چہرے کے مختلف عکس نظر آتے ہیں۔)

## ۳۲

لکھنو۔۱۹۴۰۔

اب چراغ سارے میں روشن ہو چکے تھے۔ ندی کے کنارے ڈونگیوں میں دیے جلے۔ ندی نے اپنا سفر جاری رکھا۔ برآمدے میں لیمپ روشن کر دیئے گئے تھے۔ شیڈ پر برساتی پروانے کے چکر کاٹ رہے تھے۔

لڑکیاں برآمدے میں بیٹھی رہیں۔

سیتل پاٹی پر اودے رنگ کا کم خواب کا لہنگا پھیلا دیا گیا جس کی گوٹ بڑے اہتمام سے طلعت تراش رہی تھی۔ گوٹ کاٹنے میں طلعت بڑی ماہر فن سمجھی جاتی تھی۔ لاج ایک طرف کو ذرا بے نیازی سے بیٹھی یہ منظر دیکھتی رہیں۔ قریب ہی مالتی رائے زادہ بیٹھی تھی۔

پھر جب رات زیادہ ہوگئی تو نیشے سے گنگادین نے 'جواب تک حوض کی منڈیر پر بیٹھا جمنامہری سے باتیں کر رہا تھا' آواز لگائی ــــــ بیٹا چلئے ــــــ

مالتی کو شہر جانا تھا' وہ بارود خانے میں رہتی تھی۔

''بھین آ جائیں تو موڑ سے تم کو پہنچا آئیں گے۔'' لاج نے اس سے کہا۔

طلعت ان سب کو شب بخیر کہہ کر نیچے اتری اور اب فٹن نے رائے بہاری لال روڈ کی طرف چلنا شروع کیا۔

چند فرلانگ چلنے کے بعد فٹن ایک بڑی سیمنٹ کی کوٹھی میں داخل ہوئی جس کے پائیں باغ میں رات کی رانی مہک رہی تھی۔ گھر کے سب لوگ پچھلے چبوترے پر بیٹھے تھے۔ کرسیاں بچھی تھیں۔ پلنگ کے قریب ٹیبل فین رکھا تھا صراحیاں گھڑونچی پر دھری تھیں جن پر چنبیلی کے گجرے لپٹے ہوئے تھے۔ چبوترے کے سرے پر چھت والا راستہ تھا جو کھانے کے کمرے سے سیدھا باورچی خانے کی طرف

جاتا تھا۔ ادھر بگھاری کی خوشبو آرہی تھی۔ برآمدے میں نماز کی چوکی بچھی تھی نیچے بہت سے بڑے لوٹے ایک قطار میں رکھے جگمگاتے تھے۔

"کہو_____ گوٹ تراش آئیں_____" اماں بیگم نے نماز کی چوکی پر سے پائینچے سمیٹ کر چپلوں میں پیر ڈالتے ہوئے کہا۔

"اللہ رحم کرے_____ لاج بے چاری کے جہیز کے کپڑے ہیں۔ ان کو اپنا تختۂ مشق نہ بناؤ بے چارے رائے زادہ صاحب کے یہاں اتنے اللے تللے نہیں ہیں کہ تم لاج کے کپڑے کاٹ پیٹ کر برابر کر دو تو نئے بنوا دیے جائیں گے۔

"کمال نے کتاب پر سے سر اٹھا کر آواز لگائی' وہ برآمدے میں در کے قریب ٹیبل لیمپ لگائے پڑھ رہا تھا۔ اپی کھانے کے کمرے میں کچھ سٹر پٹر کر رہی تھیں۔ ہاتھ میں ایک ڈش لیے جب وہ باورچی خانے کی طرف جاتی نظر آئیں تو طاعت نے ان کو آواز دی_____

"اپی! کل لاج نے تم کو بلایا ہے۔"

"اچھا۔" وہ باورچی خانے میں داخل ہو گئیں۔

"لاج باہر نکلتی_____ کیا ابھی سے مائیوں بیٹھ گئی ہے۔" خالہ بیگم نے پوچھا۔

"جانے ابھی سے اس کا بیاہ کر دینے کی کیا تک ہے۔" کمال بڑبڑایا۔

"گونا تو اس کا بی۔ اے کے بعد ہوگا۔ کیا حرج ہے۔ میں تو کہتی ہوں بڑی بٹیا کا بھی اسی طرح بیاہ کر دینا چاہیے۔ نکاح ہو جائے۔ رخصتی اپنے جب دل میں آئے ہوتی رہے گی۔" خالہ بیگم نے کہا۔

اپی کے بیاہ کا مسئلہ پھر سے چھڑ گیا۔ طلعت گنگناتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

یہ مکان ''گلفشاں'' کہلاتا تھا۔ سامنے رائے بہاری لال روڈ بڑی خاموش سڑک تھی۔ دونوں طرف جو کوٹھیاں تھیں ان کے پھاٹکوں پر ناموں کی تختیاں خاموشی سے اپنی واقفیت کا اعلان کرتی رہتیں۔ نام' لوگ' خاندان' وجود کے تانے بانے' جھمیلے' گلفشاں کے پھاٹک کے اندر ایک حوض تھا اور سیمنٹ کی ایک نالی' جو ستونوں پر بنی تھی' باغ کی سڑک کے ساتھ ساتھ پیچھے کے بڑے حوض تک جاتی تھی جس پر امرود کا ایک درخت جھکا ہوا تھا۔ اس حوض کے اوپر پانی کی موٹر لگی تھی۔ نالی کے ساتھ ساتھ چلو تو راستے میں کھانے کے کمرے کی فرنچ کھڑکی پڑتی تھی جس میں اسٹینڈ پر آفتابہ رکھا رہتا تھا۔ اس میں روز تازہ پتے ڈالے جاتے تھے۔ اس فرنچ دریچے میں سے جھانکو تو اندر کھانا کمرہ نظر آتا اور اس کے آگے گول کمرہ جس میں شیشے کے لمبے لمبے دریچے تھے۔ گول کمرے کے تین طرف برآمدہ تھا۔ اس میں بھی شیشے کی کھڑکیاں لگی تھیں۔ اس میں بید کا صوفہ سیٹ پڑا تھا۔ برآمدے کے ایک سرے پر بھیا صاحب کا کمرہ تھا۔ برآمدہ ساری کوٹھی کا چکر لگا کر پہلو کے چبوترے پر ختم ہوتا تھا جہاں برساتی تھی۔ اس کے آگے موٹر خانے کی طرف سڑک جاتی تھی۔ پھر عقبی حصے میں دالان تھے۔ ان کے بعد شہتوت کے درخت اور اس کے پیچھے سیمنٹ کا شاگرد پیشہ جو بڑی سی کاٹج کی وضع کا تھا۔ یہاں سرکنڈے لگا کر ملازموں نے اپنے اپنے لیے آنگن بنا لیے تھے۔ گلفشاں کے ایک طرف کھلا میدان تھا جس کے اختتام پر دھوبیوں کی جھونپڑیاں تھیں اور پان والے کی گمٹی

ایک مرتبہ گلابی جاڑوں میں کیا ہوا کہ نشاط گنج کی بستی کے لوگوں نے اس میدان میں آ کر والی بال کے دو کھمبے نصب کر لیے اور ایک شکستہ جالی ان کھمبوں سے باندھ دی۔ اب شام پڑے وہ غریبا غربا' آ کر والی بال کھیلا کرتے اور جھٹ پٹے میں ان کی آوازیں گونجا کرتیں۔ طاعت پیچھے برآمدے میں تخت پر بیٹھی ان کی آوازیں سنا کرتی اور ہوم ورک کرتی جاتی عقبی لان کے وسط چوڑی سی روش تھی۔ رام اوتار مالی گھنٹوں کھرپی لیے بے مقصد ادھر ادھر گھومتا۔ کبھی کسی درخت کے تنے میں کھرپی گھونس کر آسمان کو دیکھتا رہتا اور طوطوں کو آم کے درخت سے اڑانے کے لیے عجیب وغریب آوازیں حلق سے نکالتا۔

نچلے طبقے کے لوگوں نے مہینہ بھر ہی والی بال کھیلا ہوگا کہ کوٹھیوں کے رہنے والوں نے میدان کے مالک سے شکایت کی۔ ان کی وجہ سے ماحول میں فرق آتا ہے۔ اس کے بعد سے والی بال کھیلنے والوں کا آنا بند ہو گیا اور میدان میں پھر سناٹا چھا گیا۔

احاطے کے پیچھے ایک مندر بھی تھا صبح کو جس کے گھنٹے ٹناٹن بجا کرتے۔ مندر کے کنارے دھوبیوں کے چوہدری کا پختہ دومنزل مکان تھا۔ اتوار کے روز صبح صبح ازابا تھوبرن کالج کی عیسائی لڑکیاں دھوبیوں کی بستی میں تبلیغ کے لیے آتیں۔ اردو بھجن گائے جاتے اور مٹھائی تقسیم ہوتی۔

برابر کی کوٹھی میں چکروتی صاحب تھے جو سپرنٹنڈنگ انجینئر تھے۔ ان کے لڑکے کے نام اونیل تھا۔ لڑکی کا ریکھا جو سونے کے بنگالی وضع کے ٹوپ پہنتی تھی جس میں جھالر لگی ہوتی ہے۔ یہ لوگ ڈھاکے کے رہنے والے تھے۔

اونیل کالج میں اپنے حسن کے لیے بہت مشہور تھا اور سنا گیا تھا کہ سجاتا سے اس کا بیاہ ہوگا۔ سجاتا اور رنند بالا دو بہنیں تھیں جن کے لیے یونیورسٹی کے کسی اہم شعبے کے صدر اور بہت مشہور سائنس دان تھے۔ سجاتا گلفشاں سے چوتھی کوٹھی میں رہتی تھی۔ اس کے آگے ارچنا اور پرناتی رہتی تھیں۔ یہ توام بہنیں تھیں اور ان کے باپ یونیورسٹی کے شعبہ فلسفہ کے صدر تھے۔ ان کے گھر میں پلنگوں کے بجائے تخت بچھے تھے اور ہر کمرے میں رام کوشنا پدم ہنس کی تصویریں تھیں جو بنگال کے بڑے بھاری سنت گزرے ہیں۔ اس کے آگے بڑھ کر جسپا لزکی کوٹھی تھی جب کی لڑکیاں یونیورسٹی میں پڑھتی تھیں اور حسن وذہانت کے لیے بے حد مشہور تھیں۔ اسی طرح اور بہت سی کوٹھیاں تھیں۔ ان میں ایک ہی طرح کے لوگ رہتے تھے۔ ان سب کے یہاں موٹریں تھیں اور ٹیلیفون لگے تھے اور صبح ہوتی تو ان کی لڑکیاں سائیکلوں پر اپنے اپنے پھاٹکوں سے نکل کر ازابلا تھوبرن کالج یا یونیورسٹی کا رخ کرتی تھیں۔ یہ بڑا مستحکم اور مضبوط معاشرہ تھا۔ یہ بڑے شریف لوگ تھے۔ باوضع اور خوشحال اور باعزت۔ ان کے یہاں کے دستور بھی ایک سے تھے۔ رنج اور خوشیاں' مسائل یکساں تھے۔ ان کے فرنیچر۔ ان کے باغوں کے پودے۔ ان کی کتابیں۔ لباس سب چیزیں ایک سی تھیں۔ ان کے ملازم' ان کے نام' ان کی دلچسپیاں۔

طلعت کے یہاں کا خانساماں بھی اسی قسم کا تھا جیسے اور سب کوٹھیوں کے خانساماں تھے۔ اس کا نام حسینی تھا۔

سارے باورچیوں کے نام حسینی' حسین بخش یا مدار بخش ہوتے ہیں۔ سارے

دھوبی تھو کہلاتے ہیں۔ سب کوچوان گنگا دین ہیں۔ ساری نوکرانیوں کے نام بلاقن، رسولیا اور حمیدن کی ماں اور منجور النساء ہوتے ہیں۔ سارے بیرے عبدل کہلاتے ہیں۔ جس طرح طعام خانوں میں والکن نواز ادبداکر ٹونی ہوتا ہے سارے باپوں کا نام خان بہادر تقی رضا بہادر ہوتا ہے۔

ناولوں والے باپوں کا نام بھی یہی ہوتا ہے، اصلیت والے باپوں کا بھی۔ جبھی تو کہا جاتا ہے کہ ناول حقیقت کی عکاسی کرتے ہیں۔ ویسے ادھر ادھر کی ہانکنے کی دوسری بات ہے۔

حسینی کو اماں بیگم نے طلعت کا ایک پرانا وورکوٹ دے دیا تھا جس کے کالر پر فر لگی تھی۔ اب فر کا فیشن ختم ہو چکا تھا لہٰذا طلعت اسے کہاں پہنی اور حسینی صبح صبح باورچی خانے کی سمت جاتے ہوئے چھت والے راستے میں سوں سوں کرتا گزرتا اور سودے کے پیسے لینے کے لیے کمرے میں آتا ______ اب وہ فاختئی رنگ کا فرکوٹ پہنے کام کرتا اس قدر مسخرہ معلوم ہوتا کہ جس کی حد نہیں۔ قدیر اس پر خوشدلی سے ہنستا۔ میم صاحب آوت ہیں۔ ہٹ جاؤ راستے سے۔

قدیر موٹر ڈرائیور، جب طلعت چار سال کی تھی، کمال آٹھ سال کا اور بھیا صاحب ابھی سوئٹزرلینڈ میں تھے، تب آن کر ان کے یہاں نوکر ہوا تھا۔ قدیر مرزا پور کا رہنے والا تھا اور بے حد دلچسپ۔ اس کی بیوی کا نام قمر النساء تھا اور بچے کا پھدن۔ جب طلعت کے بڑے ابا اناوے میں تعینات تھے تو ایک مرتبہ پھدن کو ضلع کے بے بی شو میں لے جایا گیا اور اسے پہلا انعام ملا۔ اب پوچھیے کیا انعام ملا، ایک گاڑھے کی چھپی ہوئی چھوٹی لڑکیوں کے پہننے کی ساری اور ایک جھنجھنا۔

قدیر کے یہاں اس روز عید ہو گی' پھر ایک روز قدیر کو کیا سوجھی کہ کیمرہ لوں گا۔ انگریزی رسالے گھر میں سب کو دکھاتے پھرے۔ اے بیٹا ـــــــ اے بیگم صاحب ـــــــ یہ کیمرہ کتنے کا ہے۔ پوچھو' میاں قدیر تم کیمرہ کیا کرو گے؟ بیگم صاحب' پھوٹو کھینچا کروں گا ـــــــ خدائے سے مجھے پھوٹو گرافی کا بہوتے شوق ہے ـــــــ پھر قدیر نے اپنی تنخواہ میں سے پیسہ بچا بچا کر ڈیڑھ سو روپے کا کیمرہ منگوایا اور تین ٹانگوں والا اسٹینڈ اور مور اور محل والے پردے۔ اب دونوں میاں بی بی نے شرگر دپیشے کے آگے سرکنڈے کھڑے کر کے باقاعدہ اسٹوڈیو بنایا اور گھر بھر کی تصویریں کھینچنی شروع کریں۔ ہائی پور اور یہ اور وہ جانے کون کون لوازمات منگوائے گئے۔ انہوں نے اپی اور اور بھیا صاحب اور طاعت' کمال اور سب کی سینکڑوں تصویریں کھینچ ڈالیں۔ تصیروں کے لیے قدیر کا بڑا زوردار تخیل تھا۔ اپی بیٹھی ستار بجا رہی ہیں۔ پیچھے پردے پر مور ناچ رہا ہے۔ محل کے اوپر چاند نکلا ہے۔ حوض پر پریاں کھڑی ہیں۔ اپی قلم ہاتھ میں لیے متفکرانہ انداز میں بیٹھی ہیں۔ کمال اپنے سارے کپ اور ٹرافیاں سنبھالے کھڑے ہیں۔ بھیا صاحب ٹینس کا ریکٹ ہاتھ میں لیے مسکراتے ہیں۔ خالہ بیگم اور اماں بیگم انتہائی سنجیدگی سے ہاتھ گھٹنوں پر رکھے بیٹھی سامنے کی اور دیکھ رہی ہیں۔ نرمل اور لاج' رادھا اور کرشنا کے لباس میں کھڑی ہیں۔ نرملا کے ہاتھ میں بانسری ہے اور وہ سخت پٹکل والا کرشنا کا پوز۔ ہری شنکر کتاب کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ تصویروں کے پوز کے متعلق قدیر کی اپنی اٹل تھیوریز تھیں اور اس معاملے میں وہ کسی کی رائے برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اپنی من مانی کرتے تھے لہٰذا ان کے موڈلز کو بلا چون و چرا کیے ان کا حکم

ماننا پڑتا تھا۔ اب فرصت کے وقت میں میاں بی بی بیٹھے تصویریں دھو رہے ہیں' سکھا رہے ہیں۔ آٹھ آٹھ آنے کی لاگت میں ایک پوسٹ کارڈ سائز تصویریں بنتی بنتی تھی۔

اپنا اپنا شوق ہوتا ہے۔

گرمیوں کی دوپہروں میں جب سارا گھر سو جاتا تو نوکروں کے کاٹج سے قدیر کے آلہا گانے کی آواز بلند ہوتی۔ کبھی جا کر دیکھو تو میاں قدیر دہلیز پر اکڑوں بیٹھے پڑول کا خالی ٹین بجا رہے ہیں۔ قمرن ایک طرف کو بیٹھی کروشیا سے جالی بنا رہی ہیں۔ آپ کو آتے دیکھا' فوراً پیتل کی پن دبیا کھینچ کر پان بنانا شروع کر دیا۔ قمرن پور کی ساری عورتوں کی طرح بے حد سانولی' سلونی اور سبک بی بی تھیں۔ ہم وطن ہونے کی وجہ سے لاج اور نرملا کی والدہ سے ان کا بڑا یارانہ تھا۔ اکثر سنگھاڑے والی کوٹھی بلوائی جاتیں یا جب مسز رائے زادہ گلفشاں آتیں تو فوراً قمرن کی طلبی ہوتی۔ رنگین کنارے والی گاڑھے کی دھوتی باندھے' جس کا پلو سامنے پڑا ہوتا' گھونگھٹ نکالے وہ روش پر سے گزرتی چبوترے پر پہنچتیں اور ان کے پیروں کے جھانجھن اطلاع دیتے کہ بہن قمر النساء آن پہنچیں۔

ایک ریشمی ساری بھی تھی بہن قمرن کے پاس جو پورے اٹھارہ روپے میں خریدی تھی اور وہ بھی کلکتے میں۔ جس روز کوٹھی میں کوئی تقریب ہوتی وہ ریشمی ساری اور اپنے سارے چاندی زیور پہن کر گھونگھٹ نکالے آن کر خاموشی سے کام میں مصروف ہو جاتیں۔ مہمان بیبیوں کا استقبال کرتیں، ان کو سلیقے سے بٹھاتیں۔

قمر اور قدیر دونوں کسانوں کی اولاد تھے۔ ڈرائیور بننے سے پہلے قدیر اپنے ضلع کی کسان سبھا میں شامل تھے اور چرخے کا پرچار کرتے پھرتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب موتی لال کا ولایت پلٹ بیٹا زمینداری کی بیخ کنی کرنے کے در پے تھا، گاؤں گاؤں گھومتا تھا، کسانوں کی جھونپڑیوں میں رہتا تھا اور اودھ کے کسانوں کا لیڈر بنا ہوا تھا۔ تعلقہ داری سسٹم نے کسانوں کی جو درگت بنا رکھی تھی اس سے قدیر سے بہتر واقف کون ہو سکتا تھا؟ اسی لیے جب گلفشاں کے لان پر کمال کے دوست احباب سوشلزم پر لمبی چوڑی بحثیں کرتے تو قدیر بھی کسی نہ کسی بہانے جا کھڑے ہوتے اور ان کی باتوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے۔ ان کی تو صرف یہ معلوم تھا کہ ان کے گاؤں کے زمیندار ٹھاکر صاحب کے سپاہیوں نے ایک روز جب لگان ادا نہ ہونے پر ان کے باپ کو ڈنڈوں سے اس قدر مارا کہ وہ ختم ہو گئے تو قدیر کو کلکتے جا کر کلیزی کرنی پڑی تھی اور ان کے گھر میں اب بھی روٹیوں کے لالے پڑے تھے۔ ان دنوں یعنی ۳۱ء کے لگ بھگ، کانگریس نے تحریک چلا رکھی تھی کہ حکومت کو ٹیکس مت ادا کرو۔ گاؤں گاؤں یہ تحریک چل رہی تھی۔ حکومت اور زمیندار ایک طرف تھے، کسان اور کانگریس دوسری طرف۔ قدیر کے گھر ایک زمانے میں قالین بھی بنے جاتے تھے مگر سرکاری پالیسی اور مشینی مال کی درآمد کی وجہ سے گھریلو صنعتیں تباہ ہو چکی تھیں۔ زمین پر بوجھ بڑھ گیا تھا اور زمیندار کو لگان ادا کرنا برحق تھا۔ انہی حالات نے قدیر کے باپ کی جان لی، مگر اب جو کچھ لکھنو شہر میں ہو رہا تھا وہ قدیر کی عقل میں نہیں آتا تھا بے اطمینانی اور انتشار کی اصل وجہ اقتصادی تھی۔ زمیندار اور کسان کا تصادم تھا۔ برطانوی حکومت اس بے اطمینانی کو

فرقہ وارانہ رنگ دے رہی تھی تا کہ عوام کا ذہن دوسری طرف متوجہ ہو جائے۔

شہر میں رہ کر قمرن کو اپنے مرجاپور کے گاؤں کی یاد بہت ستاتی اور سال دو سال بعد چھٹی لے کر دونوں اپنے گاؤں ہو آتے۔ دونوں میاں بی بی میں بہت محبت تھی۔ رام سیتا کی جوڑی ایسی۔

قمر ابھی دس برس ہی کی تھیں کہ ان کا بیاہ' گونا سب ہو گیا تھا۔ یہ شاردا ایکٹ کے زمانے میں بھی غریب غربا گورنمنٹ کی آنکھ میں کس طرح خاک جھونکتے ہیں! بی قمرن اب مر بھر کر پچیس سال کی ہوئی تھیں۔ قدیر ان سے دس بارہ سال بڑے تھے۔ ان دنوں کی محبت کو مثال کے طور پر دوسرے ملازموں بلکہ رشتے داروں تک کے سامنے پیش کیا جاتا تھا۔ ویسے بی قمرن دوسرے ملازموں کی بیبیوں سے میل جول نہیں رکھتی تھیں کیونکہ موٹر ڈرائیور کی اہلیہ ہونے کی حیثیت سے ان کا سماجی رتبہ شاگرد پیشے کی سوسائٹی میں بہت اونچا تھا۔ ان کا قاعدہ تھا کہ دوپہر کو کھانا پکانے، جھاڑو بہارو سے فارغ ہو کر پھدن کو گود میں لیے کوٹھی میں آجاتیں اور اماں بیگم کے بیڈ روم میں محفل جمتی۔ اماں بیگم تخت پر لیٹی رسالہ نیرنگ خیال یا عصمت پڑھ رہی ہیں۔ خالہ بیگم نماز کی چوکی ہی آڑی آڑی لیٹی ہیں۔ کوئی مہمان بی بی آئی ہوئی ہیں تو وہ بھی کسی مسہری پر نیم دراز ہیں۔ پاندان سامنے رکھا ہے۔

"آ گئیں قدیر کی بی بی ـــــــ آؤ ـــــــ بیٹھو"

قمر بڑی نزاکت سے سب کو آداب تسلیم کر کے قالین پر بیٹھ گئیں۔ پھدن کو ایک طرف سلا دیا۔ باجی اماں نے پان بنا کر بڑھایا۔

"کہو بی، آج کیا پکایا تھا۔" خالہ بیگم پوچھتیں۔

"ارہر کی دال بھات اور منگوچیاں بیگم صاحب ___"

اس کے بعد کھانوں پر تبصرہ ہوتا۔ ترکاریوں کے بھاؤ اور بھی کے نرخ پر تبادلہ خیالات کرنے کے بعد گفتگو اپنے محبوب موضوع پر آجاتی۔ شادی بیاہ کے قصے، کنبے کی سیاسیات' کس کی شادی کس سے ہورہی ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ قمرن ساری گفتگو میں پورا پورا حصہ لیتیں اور ان کی رائے کی قدر بھی کی جاتی۔ کبھی خالہ بیگم تخت پر لیٹے لیٹے کجریاں گنگنانا شروع کر دیتیں۔ بھری گگری موری ڈھرکائی شام ___ تو بی قمرن ان کے ساتھ ساتھ نیچی آواز میں گاتیں۔ ان کی آواز زیادہ اچھی نہ تھی پر سنگین میں گالیتیں۔

گانے میں میاں قدیر استاد تھے۔ نوٹنکی کے گانے، تھیٹر کی غزلیں (میں فیش سے پوزیشن سے کھاؤ مٹن چاپ) کجریاں' بارہ ماسے' دادرے' ٹھمریاں' برہا' آلہا اودل ___ ہر چیز کے بادشاہ تھے۔ ان کی پسندیدہ غزلیں مندرجہ ذیل تھیں:

اٹھاؤ نہ کھنجر مڑے گی کلائی

گلا کاٹو ناجک بدن دھیرے دھیرے

اور

شب غم کی آہیں بشر ہو رہی ہیں

مناتے مناتے سحر ہو رہی ہے

گانے میں قدیر اشعار کی صحت کا خیال رکھنے کا قائل نہ تھے۔ ان کے پٹرول کے ٹین پر آکر سارے اشعار اور الفاظ ایک نیا روپ اختیار کر لیتے تھے جو صرف

ان کا فن تھا۔ ان کے چند پسندیدہ اشعار بھی تھے جو وہ شاگرد پیشے بھی تھے جو وہ شاگرد پیشے کی ادبی محفلوں میں پڑھا کرتے ____ ایک تھا:

عطر غلاب خوبو لونڈر نے چھین لی

جنتری کی تمام کھریں کلنڈر نے چھین لی

قدیر کلکتہ پلٹ تھے لہٰذا ان کا درجہ ویسے بھی بہت بلند تھا۔ جس نے کلکتہ دیکھا جا نو لندن، پیرس، ساری دنیا دیکھ لی۔ کمال اور طلعت وغیرہ کے بچپن میں وہ اکثر اپنی وسیع معلومات سے ان لوگوں کو مستفید کیا کرتے اور بچے نہایت عقیدت سے ان کی باتیں گرہ میں باندھتے جاتے۔ مثلاً ایک روز بنارس کی ایک تارکوں کی سڑک پر قدیر بچوں کو موٹر میں بٹھائے کہیں لیے جاتے تھے۔ طلعت نے نہایت مفکرانہ انداز میں ناخن کترتے ہوئے کہا: "یہ پالش کی ہوئی سڑکیں تو بہت مہنگی بنتی ہوں گی۔ ہیں نا قدیر ____"

"جی ہاں۔ بیٹا ____" قدیر نے گلا صاف کر کے اسی مفکرانہ انداز میں پیچھے مڑتے ہوئے جواب دیا تھا: "ایک روپیہ بھر جگہ مطلب سوا انچی سڑک پر پالش کرنے کا ایک ہی روپیہ خرچ بیٹھتا ہے۔"

افواہ۔ پچھلی سیٹ پر سے حیرت واستعجاب کا کورس ہوا۔

وہ کیسے قدیر ____ طلعت نے پوچھا، وہ ہمیشہ کی بیوقوف تھی۔

"اب یہ دیکھ لیجئے۔" قدیر نے بڑی متانت سے جواب دیا "جیسے ایک ایک روپیہ کر کے سڑک پر بھاتی چلی جایئے، اتنے ہی روپے خرچ ہوتے ہیں۔" اور وہ کھنکار کر غور و فکر میں ڈوبے موٹر چلاتے رہے۔

ایک بار انہوں نے بتلایا کہ کلکتے میں صاحب لوگوں نے یہ ڈونڈیا پیٹی کہ جو درییر موٹر سے مرغی مار دے اسے پچیس روپیہ انعام۔ بڑے بڑے دریبر آئے۔ مہاراجہ بھروان کا دریبر اور بنگال کے لاٹ صاحب کا دریبر مرغی سڑک پر چھوڑی گئی۔کوئی نہ مار پایا۔

تم نے ماردی ہوگی۔طلعت نے اشتیاق اور عقیدت سے پوچھا۔

''جی ہاں۔بیٹا'' انہوں نے جواب دیا۔

''انعام کا کیا کیا'' کمال نے پوچھا۔

''دریبر کی بی بی کے لیے سونے (اس زمانے میں سونا پچیس روپے تولہ تھا) کے بندے بنوا دیئے''

قمرن چونکہ سارے میں ڈرائیور کی بی بی کہلاتی تھیں قدیر بھی اسی نام سے مخاطب کرتے۔

تیسرے پہر کو کمال اور اپی اور طلعت اور بھیا صاحب اپنے اپنے کالجوں سے لوٹتے۔گھر میں ایک دم چہل پہل شروع ہو جاتی۔کھانے کے کمرے میں برتن کھنکھناتے۔چاء کی کشتیاں تیار ہو کر مختلف کمروں میں بھیجی جاتیں یا سب اماں بیگم کے کمرے میں جمع ہو جاتے۔ایک پیارلی چاء قمرن کو بنا کر دی جاتی۔اپی اور طلعت ان سے کچھ تبادلہ خیالات کرتیں۔اتنے میں موٹر برساتی میں داخل ہوتی۔ قدیر' خان بہادر صاحب کو عدالت سے واپس لاتے۔موٹر کی آواز سن کر قمرن گھونگٹ کاڑھ لیتیں اور پھدن کو گود میں اٹھا کر پھر اپنے کاٹج کی طرف روانہ ہو جاتیں۔

وہ بے حد وضع دار آدمی تھیں۔ برسوں اودھ میں رہ لیں لیکن اپنی خوبو نہ چھوڑی ۔ ایک مرتبہ حسینی خانسا ماں کی بی بی نے ان سے کہا ____اے بہنی ____ کبھی کھڑے پائچے بھی تو پہن کر دیکھو۔ اور قمرن نے ہونٹ پچکا کر جواب دیا تھا۔____ ہم کوئی پتریاں ہوں ____ جو ای پہناوا پہنی ___ لہٰذا بہن قمر النساء اپنی گاڑھے کی سفید دھوتی ہی پہنا کیں اور اسی طرح گھونگٹ کاڑھے گھومتی رہیں جیسے آج ہی بیاہ کر آئی ہوں۔ نہ کبھی شہر کی مہریوں کی طرح انہوں نے آتی ہوں، جاتی ہوں والی زبان سیکھی۔ جب انہوں نے پہلی مرتبہ لکھنو کی لڑکیوں کی گفتگو سنی ____ بڑی بٹیا اپنی کسی سہیلی سے کہہ رہی تھیں ____ "اللہ آپ کہاں جاتی ہیں حضور، جائے آپ کا دین ایمان ____ یہ اپنی گھن ادائیں تو رکھیے چھپر پر۔ میں کہے دیتی ہوں۔ ذری میرے دماغ میں بھی خناس ہے۔ " ____ اور کوٹھی کی صاحبزادیوں ہی پر کیا موقوف تھا، مہربان اور مامائیں تک ایک سے ایک فقرے باز پڑی تھیں ____ تو قمرن حیران پریشان کھڑی سنا کیں۔ شاگرد پیشے میں واپس آ کر قمرن خوب ہنسیں۔ قدیر جب باہر سے کام نمٹا کر آئے تو ان سے ماجرا بیان کیا۔ شہرن کی بیبیاں پترین ایسی ہوت ہیں۔ سارا پہناوا بھی پترین ایسا باٹے۔ قدیر ان کے اس بھولپن پر بہت ہنسے اور ان کو دنیا کے حالات سے آگاہ کیا کہ یہ پترین کی بولی نہیں، یہ ٹکسالی اور بیگماتی زبان کہلاتی ہے۔ تم بھی اب اسی طرح بولا کرو: آتی ہوں، جاتی ہوں۔ اب تو خیر ان کو لکھنو میں رہتے دس سال ہوتے آئے تھے مگر اس کے باوجود حسینی کی بی بی کو اپنے خاص الخاص لکھنوا ہونے پر ناز تھا۔ ان کے دادا پر دادا نوابی عہد میں شاہی رکاب دار تھے۔ قمرن بے

چاری تو قصباتی بھی نہیں خالص دیہاتن تھیں لیکن قمرن کی سماجی حیثیت (جس کا ذکر پچھلے صفحے پر ہو چکا ہے) حسینی کی بی بی سے بلند تھی۔ انہوں نے بھی موخرالذکر خاتون کا کبھی نوٹس نہ لیا۔ ان کی تو نرملا اور راج کی والدہ مسز رائے زادہ کے علاوہ ایک گوئیاں اور تھیں۔ اس کا نام رم دیا تھا۔ ہم وطنی کا ناطہ بری چیز ہوتا ہے۔ کہاں رم دیا ذات کی اہیرن رام اوت ۵ ار مالی کی بی بی۔ صبح شام اس کا آدمی اس کو پیٹے۔ نہ وہ طلعت کی آپا سوسن کی طرح فلمی گانے گا سکے نہ حسینی کی بی بی کی طرح گھر سواں پائجامہ پہن کر ٹھمک ٹھمک چلنا اسے آئے، مگر وہی ہم وطنی۔ پردیس کی اس اجنبی دنیا میں رم دیا ہی قمرن کا دکھ سکھ سمجھ سکتی تھی۔ شاگرد پیشے کی سوسائٹی میں مالی کا رتبہ بہت نیچے پہنچتا تھا مگر بہن قمرن النساء کی ہمجولی تھی۔ تو رم دیا۔ رم دیا گورکھپور کی رہنے والی تھی۔ قمرن کی طرح نو دس برس کی عمر میں اس کا بھی بیاہ، گونا سب ہو گیا تھا۔ رام اوتار اس سے صرف تیس سال بڑا تھا۔ آج سے کئی سال قبل قمرن کے یہاں آنے کے کچھ عرصے بعد ایک روز رام اوتار اسے اکے پر بٹھلا اسٹیشن سے لائے تھے، وہ رام باس کی سرخ ساری پہنے چھکو پھکو روتی اتریں۔ پہلے انہیں کوٹھی میں سلام کروانے کے لیے پیش کیا گیا۔ اس کے بعد شاگرد پیشے میں وہ دوسرے ملازمین کی بیبیوں کے لیے موضوع گفتگو اور لڑکے بالوں کے لیے تماشا بنیں۔ چھوٹی سی دس سالہ دلہن۔ سب سے آخر میں قرمن نے ان کے قریب جا کر ان سے باتیں شروع کیں۔ معلوم ہوا یہ تو اپنے دیس کی ہیں۔ ان کی بڑی بہن مساۃ ہر دیا مرزا پوری میں قمرن کے گاؤں میں بیاہی گئی تھیں۔ اے لیجئے یہ تو بی رم دیا سے سمدھیانے کا رشتہ نکل آیا۔ بس اس دن سے رم دیا اور قمرن گوئیاں تھیں۔

چھوت چھات کے باوجود آپس میں لین دین بھی رہتا۔قمرن رم دیا کی ہتھیلی پر چاء کی پتیاں اوپر سے رکھ دیتیں ۔لیو_____ کوٹھریا ما جائے کے چاء بنا کے پی لیو _____اسی طرح پھل پھلاری امرود گنے سنگھاڑے سے ایک دوسرے کی تواضع ہوتی ۔جاڑوں میں گھنٹوں شاگرد پیشے کے پچھواڑے پھلواری میں قمرن اور رم دیا کھاٹ پر بیٹھی باتیں کیا کرتیں۔

سارا یا ہر سنگھار میں رنگ کر منڈیر پر سکھائی جاتیں ۔چاول بینے جاتے ۔قمر رم دیا کو کروشیا سکھلاتیں ۔کبھی کبھی حسینی کی بی بی جو ہی خانم ادھر آنکلتیں اور دیکھتیں کہ دونوں پوربنیں بیٹھی چاول صاف کر رہی ہیں یا چادر پر منگوچیاں سکھارہی ہیں تو حسینی کی بی بی ناک بھوں چڑھا کرسوسن یا زمرد سے کہتیں_____ دریبر کی بی بی نے بھی کیا!اہیرن سے پہنا پا گانٹھ رکھا ہے۔

پھر جب پکار فلم نئ نئ آئی اور اس کا ریکارڈ کوٹھی میں پہنچے تو ایک گانا قمرن کو بے حد پسند آیا_____ دھوبیوں کا گانا جس میں مرزا پور کا نام آتا تھا۔مرجا پور میں اورن ٹھورن کاشی ہمارو گھاٹ _____قمرن طلعت کے کمرے کی دہلیز پر اکڑوں بیٹھ جاتیں اور فرمائش کرتیں بیٹا وہ دھوبن والا تو اپھر بجایئے _____اس کے علاوہ کنگن فلم میں قمرن کو ایک اور گیت پسند آیا تھا _____ارے ارے کبیرن رے کبیر ۔رمیا کی جورو نے لوٹا بجار_____ اس میں رمیا کی بی بی کے بجائے قمرن ،حسینی کی بی بی گاتیں ارو بہت خوش ہوتیں ۔جوابا حسینی کی بی بی کسی دوہے میں قمرن کا نام چپکا دیتیں اور اسی طرح مزے مزے نوک جھونک چلاتی۔

گنگا دین سائیس ابھی بچلر تھا لہذا کوٹھی سے لے کر شاگرد پیشے تک ساری

خواتین کو اس کے رشتے کی بڑی فکر تھی۔ خالہ بیگم نے ان گنت کہاریوں سے اس کی بات لگائی۔ رام اوتار تو اسے اپنا ہم زلف بنانے پر ادھار کھائے بیٹھا تھا۔ اس کی ایک چھ سالہ سالی گورکھپور میں موجود تھی۔ رم دیا بھی اس کی بہت خاطریں کرتی۔ رم دیا کی بہن چھ سال کی تھی تو کیا ہوا' دو تین برس میں بڑی ہو جائے گی' مگر مصیبت یہ ہوئی کہ گنگا دین ضرورت سے زیادہ پڑھ لکھ گیا تھا اور شادی پر تیار ہی نہ ہوتا تھا۔

اس کے پڑھ لکھ جانے کی وجہ یہ ہوئی کہ گلفشاں میں میں اکثر مختلف النوع مشغلوں کی ہوا چلا کرتی تھی۔ ایک زمانے میں فی شخص نے میوزک سیکھنا شروع کی۔ بھیا صاحب برآمدے میں بیٹھے سورج بخش سریواستوا سے فیض حاصل کر رہے ہیں۔ صبح صبح بھیروں اڑ رہی ہے: دھن دھن مورت کرشن مراری۔ تیسرے پہر کو چاء کی میز پر گانا ہو رہا ہے۔ سب آوازیں ملا رہے ہیں۔ طاعت تو با قاعدہ میری کالج میں داخل تھی لیکن کمال اور اپی سارے کزن لوگ پانچوں سواروں میں شامل تھے۔ خالہ بیگم ڈھولک کے گیت بہت اچھے گاتی تھیں امام باندی میراسن مع اپنے خاندان کے تقریبوں کے موقعے پر آ کر ہفتوں گلفشاں میں رہتی تھی۔ سوسن اور زمرد دوارے گاتی تھیں۔ قصہ مختصر بچہ بچہ رتن جھنکر بنا ہوا تھا' پھر جب قدیر نے فوٹو گرافی شروع کی تو فی کس ہر طرح کے کیمرے ہاتھ میں لیے گھوم رہا ہے۔ بلی کتوں کی تصویریں کھینچی جا رہی ہیں۔ اس کا شوق بھی جلد ختم ہو گیا۔ اسی طرح گرم سدھار کا سلسلہ کچھ عرصہ چلا۔ تعلیم بالغاں کی تحریک ازابلا تھو برن میں شروع کی گئی تھی۔ ہر لڑکی پر ڈیوٹی لگائی گئی کہ وہ کم از کم دو ان پڑھ لوگوں کو

زیور علم سے آراستہ کرے۔ خالی گھنٹوں میں لڑکیاں کیمپس پر کالج کے ملازموں کو پڑھاتی نظر آتیں۔ شام کو آس پاس س غریب غرباء آکر گلفشاں کی برساتی کی سیڑھیوں پر بیٹھ جاتے۔ برساتی کے بلب اور باغ کے لیمپ کی روشنی میں الفاظ کے ہجے کرتے۔ گھر کی لڑکیاں اور لڑکے ان کو اردو اور ہندی سے فیض یاب کرتے۔ برساتی کا بلب اور باغ کا لیمپ بہت مدھم تھا مگر غریب غرباء نہایت ذوق وشوق سے رات گئے تک پڑھتے۔ قدیر سخت کندن ذہن ثابت ہوئے۔ ویسے بھی وہ بہت سپیریر تھے' ان خرافات میں کیا پڑتے۔ گنگا دین البتہ انگوچھا سر پر لپیٹتا سب سے پہلے تعلیم بالغاں کی طرف لپکا۔ امین آباد کے پستک بھنڈارے ہندی کا قاعدہ خرید لایا اور سب سے زیادہ ہونہار شاگرد ثابت ہوا۔ اب تو خیر وہ بہت پڑھ گیا تھا۔ فرفر ہندی ناولوں کا مطالعہ کرتا تھا اور ارادہ کر رہا تھا کہ ہندی مڈل کا امتحان پاس کر ڈالے۔

چنانچہ گنگا دین چھ سالہ بچی سے بیاہ کرنے کی دقیانوسی تجویزیں سنی ان سنی کر دیتا اوروں کی طرح اس نے بھی بھیا صاحب کو اپنا آیڈیل بنا رکھا تھا۔ جب بھیا صاحب ابھی بیاہ نہیں کرت ہیں تو ہم کاہے کری۔ اسے طلعت نے یہ بھی بتا رکھا تھا کہ انگریزوں کے کوی رڈیارڈ کپلنگ نے اس کا ذکر کیا تھا اور اس کے متعلق ایک فلم بھی انگریزی کے کوی رڈیارڈ کپلنگ نے اس کا ذکر کیا تھا اور اس کے متعلق ایک فلم بھی انگریزی میں بن چکی ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ گنگا دین نہایت روشن دماغ ہستی تھی اور بھیا صاحب کا اصل جاں نثار خادم۔ لڑکپن میں وہ سائیس کی حیثیت سے آیا تھا۔ شمبھو کے مرنے کے بعد اسے کوچمپین کا عہدہ مل گیا تھا۔ اسے اپنی فٹن سے

بے حد محبت تھی اور اس کے مقابلے میں وہ قدیر کی شیور لے کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔

یہ فٹن بڑے ابا مرحوم کی تھی یعنی بھیا صاحب کے والد کی۔ ان کے انتقال کے بعد جب بھیا صاحب گلفشاں میں رہنے کے لیے آئے اور سارے ساز سامون کے ساتھ فٹن مع گنگا دین یہاں منتقل کر دی گئی۔ پڑول راشنگ شروع ہوئی تو دفعتاً گنگا دین کی اہمیت بہت بڑھ گئی۔ اب وہ قدیر کو طعنے دیا کرتے' چلاؤ نا اپنی موٹر یا۔ ہمیں دیکھو۔ ہٹلر کا کھٹکا نہ کچھ نہ کچھ۔ مزے سے دندناتے ہیں۔

گنگا دین بھیا صاحب کا رفیق خاص تھا۔ ان سے اس کی وفاداری اس لیے زیادہ تھی کیونکہ وہ بہر حال ان کے مرحوم والد کا ملازم تھا اور ان کے گھر سے یہاں آیا تھا۔ اکثر بڑے سرکار کو یاد کر کے روتا۔ اپی اور بھیا صاحب کے بیاہ کے سلسلے میں بھی وہ اپنی رائے محفوظ رکھتا کیونکہ گو دنیا کا کہنا تھا کہ یہ رشتہ ضرور ہونا چاہئے لیکن بھیا صاحب نے اپنی رائے محفوظ رکھی ہوئی تھی۔

بیر کا نام امیر خاں تھا۔ یہ بے حد نیک اور مرنجان مرنج فلسفی قسم کے انسان تھے۔ خاموشی سے اپنے کام میں مصروف رہتے۔ انتہائی مفصل سوالات کا صرف جی ہاں یا جی نہیں میں جواب دیتے۔ یہ بھی نہایت وضع دار آدمی تھے۔ بگلی تک کا ذکر بڑے احترام سے کرتے۔ آ گئیں۔ چلی گئیں۔ جی ہاں بیگم صاحب' دودھ ابھی انہوں نے پیا ہے۔ ابھی کھڑکی میں سے کود کر بھاگ گئیں۔

٣٧

سنہ چالیس کے دسمبر میں طلعت کو جونیئر کیمبرج کا امتحان دینا تھا۔ اسی سال ستمبر کے مہینے میں اسے ڈبل نمونیہ ہو گیا۔ روتے روتے اس نے برا حال کر لیا ہمارا ایک سال برباد گیا' ہمارا ایک سال برباد گیا کی رٹ لگائے رکھتی۔ سارا گھر اس کی دلجوئی میں لگا رہتا۔ کمال اس کے لئے کہیں سے ایک پروجیکٹر اٹھا لایا' وہ نوابوں کی طرح تکیے کے سہارے بیٹھ جاتی اور دس سال پہلے کی خاموش فلمیں ملاحظہ کرتی جو جانے کہاں سے حاصل کی گئی تھیں۔ دیوار پر گزرے ہوئے وقتوں کے سائے ڈولتے بڑے عجیب سے لگتے۔ روڈولف ویلینٹو' ڈگلس فیئر بنکس' گلوریا سوانسن۔ دو دس سال پرانی ہندوستانی فلمیں بھی تھیں جن میں سلوچنا گھوڑے کی سواری کرتی اور رای بلی موریہ تلوار چلاتا۔ اتوار کے دن اپی کی سہیلیاں ٹہلتی ہوئی آ جاتیں اور اس کے پاس بیٹھ کر گپیں ہانکا کرتیں۔ یہ بڑی اسمارٹ' باوقار اور سنجیدہ لڑکیاں تھیں۔

دن بھر طلعت پلنگ پر لیٹی رہتی یا گنگا دین کو مزید ہندی پڑھاتی۔ اس نے کمال' ہری شنکر' بھیا صاحب اور اپی کی مہیا کی ہوئی ساری دلچسپ کتابیں پڑھ ڈالیں مگر اس غم کا مداوا کس کے پاس تھا کہ نومبر میں سالانہ امتحان تھے اور وہ بیمار پڑی تھی۔

ایک دن صبح صبح ہری شنکر اس کے کمرے میں آیا "طلعت ____ انتیت مورکھ کنیا استی" اس نے بڑے ڈرامائی انداز میں سنسکرت بولی۔

"کیوں۔"

"مت رو ہے نربدھی ______ مت رو ____"

''کیوں نہ روؤں ____''

''اس لئے نہ رو کہ تیرے کلیان کی ہم نے دیوستھا کر لی ہے ____ ہم تیرا داخلہ ٹروالے اسکول میں کروا رہے ہیں۔تو اپریل میں ہائی اسکول کا امتحان دینا اور مزے سے اگلے سال لا مارٹینئر کے نویں اسٹینڈرڈ میں گ ھس گھس کرنے کے بجائے آئی۔ٹی۔کالج میں دندنانا۔''

''رگھبیر ماما کے اسکول میں ____؟''طلعت نے سانس روک کر پوچھا۔

''ہاں۔''ہری شنکر نے جواب دیا اور اسی ڈرامائی انداز سے دوسرے دروازے سے غائب ہوگیا۔

نرملا کو جب معلوم ہوا کہ طلعت ہائی اسکول کام امتحان دے کر آئی۔ٹی۔پہنچا ہی چاہتی ہےتو اس نے مہنا متھ مچادی۔لہذا لا مارٹینئر چھوڑ کر طلعت کے ساتھ وہ بھی نئے اسکول میں بھیج دی گئی۔

ٹڑوالا اسکول اپنی جگہ ایک تاریخی اہمیت کا مالک تھا۔لال باغ میں بیروروڈ پر ایک پرانی عمارت تھی جس میں شاہی کے وقتوں کا بڑا پھاٹک' برجیاں' شہ نشین' غلام گردشیں اب تک موجود تھیں۔اس کے آگے بڑا لان تھا۔عمارت کے گرداگرد چٹائی کی دیواریں کھڑی کر دی گئی تھیں جن پر نیلے پھولوں کی بیلیں چڑھی تھیں، یہ رگھو ماما کا سکول تھا اور بنارس یونیورسٹی سے منسلک تھا اور گنی چنی لڑکیاں اس میں پڑھتی تھیں۔بالکل گھر کا سا ماحول تھا۔برابر کے مکان میں رگھو ماما مع اپنے خاندان کے رہتے تھے۔یہ بے حد فرشتہ صفت انسان تھے۔پرانے مدرسہ فکر کے کائستھ۔ لڑکیاں' شہر کے چیدہ چیدہ خاندانوں کے سٹریاں موٹروں میں بیٹھ کر آتیں اور

یہاں زیورِ علم سے آراستہ ہوتیں۔ یہاں اسٹاف اور لڑکیاں سب کا ایک دوسرے سے کوئی نہ کوئی ناطہ تھا۔ یہ رشتے خون کے نہیں بلکہ وضع داریوں کی وجہ سے قائم تھے۔ موسی، ماما، باجی، دیدی، بھیا ____ اسی طرح حفظ مراتب کا خیال رکھا جاتا۔

بعض لڑکیاں بے حد دلچسپ تھیں، مثلاً حمیدہ بانو جو وسطِ شہر کی ایک زبردست محل سرا میں رہتی تھی۔ شاعری کرتی تھی اور سخت رومینٹک روح تھی۔ بینا ماتھر کتھک کی ماہر تھی اور ہر سال آل انڈیا میوزک کانفرنسوں سے یہ بڑے بڑے کپ اٹھا لاتی تھی۔ مہر آراء ایک ایسی نواب زادی تھیں جن کی خواص ان کی خاصدان لئے ساتھ رہتی اور پیچھے کھڑے ہو کر انہیں پنکھا جھلتی رہتی۔ یہ سب لڑکیاں ایک دوسرے کے خاندانوں کی سو پشت سے واقف تھیں۔ سب ایک طرح کے ماحول کی پروردہ تھیں۔ ان سب کی، اس شہر اور اس طبقے کی ساری سوسائٹی کی اس طرح جتھ بندی تھی جیسی چوروں کے یہاں ہوتی ہے۔

میوزک کلاس پھاٹک کے اوپر والے کمرے میں تھی۔ فرش پر نیلی دھاریوں والی دری بچھی تھی۔ اس کے برابر کی برجی میں تنگ و تاریک زینہ تھا۔ برجی کے موکھوں میں سے ہلکی ہلکی روشنی اندر آتی۔ چھٹی کے گھنٹے میں لڑکیاں ان سیڑھیوں پر بیٹھ جاتیں اور حمیدہ بانو، جس کے یہاں ڈرامے کا احساس بے حد شدید تھا، اپنا سر ہلا کو بڑے پر اسرار انداز میں کہتی: ''شاہ زمن غازی الدین حیدر کی انگریز سالی اشرف النساء بیگم یہاں رہتی تھیں۔ ان کی مہری کو بادشاہ کے آدمیوں نے اس زینے پر قتل کیا تھا۔''

''کیوں گپ مارتی ہو ____ '' کسم بحث کرتی ''اشرف النساء بیگم، وہ

جان ہاپکنز والٹرز کی لڑکی؟''

''ہاں وہی۔''

''وہ تو بیگم کوٹھی میں رہتی تھیں۔''

''اپنی ماں سے لڑکر یہاں چلی آئی تھیں ـــــــ مجھے معلوم ہے ـــــــ''

حمیدہ بانو سے لکھنو کی تاریخ کے متعلق کوئی زیادہ بحث نہ کرسکتا تھا۔ اسے دیکھ کر خواہ مخواہ یہ خیال آتا کہ یہ خود سو سال پہلے کے لکھنو کا کردار ہے جو اس پرانی برجی میں سے جھانک کر ہم سے باتیں کر رہا ہے۔ ابھی زینے کا دروازہ بند ہوگا اور یہ غائب ہوجائے گی۔ طاعت کو یقین تھا کہ بڑی ہوکر حمیدہ بانو' بیگم عبدالقادر اور حجاب امتیاز علی کی طرز کے افسانے لکھا کرے گی۔

پھر گھنٹہ بجتا اور رگھو ماما کی بی بی اپنے رسوئی گھر سے نکل کر کمر پر ہاتھ رکھ کر چلاتیں ـــــ ارے لڑکیو ـــــ چلو باٹنی پڑھنے ـــــ یہ کانتی دیدی تھیں اور ان کو دیکھ کر کسی کے سان وگمان میں یہ بات نہ آسکتی تھی کہ یہ بی بی الہ آباد یونیورسٹی کی ایم۔ایس۔سی۔ ہیں اور اوپر سے گولڈ میڈلسٹ الگ۔ بوٹنی پڑھانے کے بعد وہ لپک کے پھر رسوئی گھر میں جا گھستیں اور رگھو ماما کے لئے کھانا بنانا شروع کر دیتیں۔

ایک مرتبہ کیا ہوا کہ اردو فارسی والے مولوی صاحب' جو ایک بہت بوڑھے کشمیری پنڈت تھے' بیمار پڑ گئے۔ رگھو ماما نے نرملا سے کہا: ''ذری ہری شنکر سے کہہ دینا آکے اردو فارسی پڑھا جایا کریں۔'' چنانچہ اگلے روز ہری شنکر بہت رعب داب

سے کھنکھارتے ہوئے کلاس میں آئے اور نہایت سنجیدگی سے اردو پڑھانے میں مصروف ہو گئے۔ بنارس یونیورسٹی کے مولوی مہیش پرشاد کا انتخاب اور ہری شنکر جیسے سخت گیر استاد کی پڑھائی۔لڑکیوں کی جان نکل کر رہ گئی۔اردو کے گھنٹے میں بستی مہری باغ میں آ کر لڑکیوں کو مطلع کرتی ______ :

''بیٹا چلئے ____ چھوٹے مولی صاحب آئے گئے۔''

لہذا ایک ماہ تک جب تک انہوں نے اس جامعہ میں درس دیا یہ افیشیل طور پر مولوی ہری شنکر کہلاتے رہے اور اپنی سخت گیری اور بدمزاجی کی دھاک بٹھا کر واپس لوٹے۔

صورت حال یہ تھی کہ کانتی دیدی بوٹنی پڑھاتی تھیں۔ان کی خالہ زاد بہن جو گشیوری دیدی سنسکرت کی استاد تھیں۔ مالتی رائے زادہ کے بھائی سورج بخش شعبہ موسیقی کے صدر تھے۔ ہری شنکر تو اردو فارسی پڑھا ہی رہے تھے۔حالات قابو سے باہر اس وقت ہوئے جب مس موناداس کی شادی لال باغ کے میتھوڈسٹ چرچ کے آرگنسٹ مسٹر جان فضل مسیح سے قرار پائی اور انہوں نے مہینے کی چھٹی لی تو رگھبیر ماما نے طاعت کو حکم دیا کہ وہ جغرافیہ کی کلاس لیا کرے۔ کس واسطے کہ وہ جغرافیہ میں بے انتہا ہوشیار تھی۔ یہ کلاس اس قدر پر لطف ثابت ہوئی کہ جب مسز فضل مسیح تنگ آستینوں والا نیا گرم کوٹ اور کانوں میں چھوٹے چھوٹے سونے کے بندے پہنے واپس آ گئیں تو لڑکیوں کو بڑا رنج ہوا اور انہوں نے گھڑونچیوں کے پاس ٹھنڈی زمین پر بیٹھ کر طاعت کو الوداعی پارٹی دی جس کے لئے رگھو ماما کی رسوئی میں پھلکیاں تیار کی گئی تھیں۔اس موقع پر باقاعدہ تقاریر ہوئیں جن میں

طلعت کی استادانہ صلاحیتوں پر روشنی ڈالی گئی۔

وہ دن بھی ایک تاریخی اہمیت رکھتا تھا جب مسز فضل مسیح نے اپنے نئے گھر میں لڑکیوں کی دعوت کی اور جب طلعت اپنی اکلوتی نیلی کارچوبی ساری پہن کر مقبرہ کمپاؤنڈ گئی کیونکہ اس روز سے پہلے طلعت نے ساری کبھی نہیں پہنی تھی۔ آج اسے احساس ہوا کہ وہ واقعی بڑی ہوگئی ہے۔

حضرت گن میں انگریزی دکانوں کے درمیان ایک بڑا سا شاہی کے زمانے کا پھاٹک ہے جس کے اندر وسیع احاطے میں سامنے ہی اودھ کے دسویں حکمران امجد علی شاہ بادشاہ کا مقبرہ اور امام باڑہ نظر آتا ہے۔ اس عمارت پر قیامت کی ویرانی اور نحوست برستی ہے۔ اس کے چاروں طرف احاطے کے کنارے کنارے جو کوٹھریاں بنی ہیں۔ ان میں اب نچلے متوسط طبقے کے عیسائی رہتے ہیں۔ انہوں نے اپنے چھوٹے چھوٹے کمروں کے آگے صاف ستھرے باغیچے لگا رکھے ہیں۔ ان کمروں میں ننھے منے ڈرائنگ روم ہیں جن میں کاٹج پیانو رکھے ہیں کھڑکیوں میں جالی کے پردے پڑے ہیں۔ عیسائی عورتیں نیچے نیچے فراک یا انگی ساریاں پہنے اپنے باغیچوں میں کھڑی ہو کر اپنی اولاد کو کھیلتا کودتا دیکھتی ہیں۔ یہ بڑے خاموش طبیعت اور شریف لوگ تھے اور ان کا اس قسم کی زندگی سے واسطہ نہیں تھا جس کے ساتھ عام طور پر اس فرقے کے افراد کو منسوب کیا جاتا ہے۔ مثلاً ان کی نوجوان لڑکیاں آوارہ نہیں تھیں اور ان کے لڑکے جینز پہن کر ناچتے نہیں تھے۔ اس وقت امریکہ لاکھوں میل دور تھا۔

مقبرہ سال بھر اجاڑ پڑا بھائیں بھائیں کرتا رہتا۔ خالی محرم کے زمانے میں

اس میں چہل پہل ہوتی ۔تب زبردست زنانی اور مردانی مجالس ہوتی تھیں ۔امام باڑے کے چبوترے کے نیچے کوٹھریوں اور تہہ خانوں میں عیسائی فقیرنیاں رہتی تھیں ۔بعض مرتبہ تو ایسا محسوس ہوتا کہ بے چارے امجد علی شاہ بادشاہ خود بھی ہندوستانی عیسائی تھے ۔۱۸۵۷ء کے بعد جب جنرل اوٹرم نے لکھنو پر قبضہ کیا تو اس امام باڑے میں انگریزی چرچ بنالیا گیا تھا اور لارڈ کیننگ اس میں عبادت کرنے کے لئے تشریف لائے تھے ۔

یہاں سابق مس موناداس اور موجودہ مسز فضل مسیح نے اپنے چھوٹے سے انتہائی نفاست سے سجے ہوئے ڈرائنگ روم میں اپنی طالبات کو چاء پلائی اور لڑکیوں نے ان کی شادی کا تحفہ' جو وہ راستے میں امین آباد سے خریدتی لائی تھیں' ان کو پیش کیا اور سب نے مل کر انگریزی گانے گائے ۔

لا مارٹینیر کے خالص یورپین ماحول کے بعد ٹٹر والا اسکول بالکل ایک دوسری دنیا تھی ۔طلعت اور نرملا اپنے طبقے کے دوسرے افراد کی طرح دو رنگی فضاؤں کی پروردہ تھیں جسے انڈو یورپین تہذیب کہا جاسکتا ہے ۔ اس طبقے میں بچے bilingual پیدا ہوتے تھے ۔انگریز گورنسوں کے ساتھ ساتھ قصباتی کھلائیاں اور انائیں ان کی پرورش کرتی تھیں ۔لڑکیوں کو کانونٹ اسکولوں میں پڑھایا جاتا تھا اور جب ان کی شادی ہوتی تھی تو وہ ہفتوں مائیوں بٹھائی جاتی تھیں اور پرانے زمانے کی دلہنوں کی طرح شرماتی تھیں ۔اکثر ان کی شادیاں ان کی خلاف مرضی بھی کردی جاتی تھیں ۔یہ لوگ موڈرن ہو چکے تھے لیکن الٹرا موڈرن نہیں بنے تھے ۔اخلاقی اقدار کے لحاظ سے یہ لوگ وکٹورین تھے اور اپنی نیٹو روایات کے بھی بڑی

شدومد سے پابند۔ ظاہری طور پر انہوں نے مغربیت کا رنگ قبول کرلیا تھا لیکن اصلیت میں بڑے سخت ہندوستانی تھے۔ ان لوگوں نے ایک بہت بڑے دوراہے پر اپنے مکان بنا رکھے تھے۔ یہ برطانوی نوآبادیاتی سماج تھا جو جاگیردارانہ نظام کے تعاون سے بدلتے ہوئے ہندوستان میں پرانی بنیادوں پر کھڑا کیا گیا تھا۔ اس طرح کا معاشرہ مصر اور ترکی کے پاشاؤں کے یہاں بھی موجود تھا۔ رضا شاہ اور مصطفیٰ کمال کے لائے ہوئے انقلاب کے بعد ان ممالک میں سماج بالکل مغربیت زدہ ہوگیا تھا۔ اسی طرح کا دوغلا ماحول ملایا اور انڈونیزیا کے اوپری طبقے میں موجود تھا۔ شنگھائی اور ہانگ کانگ اور کلکتہ اور بمبئی ایک ہی سلسلے کی مختلف کڑیاں تھیں مگر ہندوستان کے معاشرے میں یہ خصوصیت ابھی باقی تھی کہ یہاں کی اپنی دیسی تہذیب کی اقدار اس قدر پائیدار تھیں اور ان کی کشش اتنی شدید تھی کہ یہ لوگ ترکوں یا مصریوں یا ایرانیوں کی مانند یورپ کی مکمل نقالی کرنے لئے تیار نہیں تھے انیسویں صدی میں جو سیاسی شعور یہاں پیدا ہوا تھا اس کی وجہ سے ہندوستان تہذیب کی تجدید کی زبردست تحریک چلی تھی۔ اب ہندوستانی کی تجدید کی زبردست تحریک چلی تھی۔ اب ہندوستانی آرٹ اور ہندوستانی معاشرے پر زیادہ زور دیا جارہا تھا۔ اب مغرب زدہ کالے صاحب لوگ کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔ کانگریس کی تحریک نے اس تجدید کی رو کو زیادہ تقویت پہنچائی تھی لیکن فرقہ پرست عناصر ہندو پراچیین سنسکرتی اور اسلامی عہد زریں کا ذکر کررہے تھے۔ متحدہ قومیت اور خالص ہندوستانی تہذیب کے تصور میں رخنہ پڑ چکا تھا۔ اب یہ سوال سامنے آرہا تھا کہ ہندوستانیت دراصل ہے کیا چیز؟ ایک سیاسی پارٹی کا کہنا تھا کہ مسلمان

علیحدہ قوم ہیں۔ ان کی روایات کے ڈنڈے مشرقِ وسطیٰ سے ملتے ہیں۔ ہندوستان سے انہیں کوئی مطلب نہیں۔ دوسری سیاسی پارٹی کا کہنا تھا کہ اس ملک کی اصل قوم ہندو ہیں، مسلمان غیر ملکی ہیں۔ ''گلفشاں'' کے شاگرد پیشے میں رہنے والی مرزاپور کی قمر النساء اور رم دیا سے اس مسئلے پر کسی نے رائے نہ لی کہ ہندوستان کے اصل باشندے تو تم لوگ ہو، تمہاری اس سلسلے میں کیا رائے ہے؟

بہر حال طاعت اور رزملا اسی اوپری طبقے کی پروردہ لڑکیاں تھیں جن کو مغرب اور مشرق کے ملے جلے ماحول نے پروان چڑھایا تھا چنانچہ جب یہ دونوں لا مار ٹینئر سے نکل کر رگھو ماما کے یہاں گئیں تو وہاں بھی اسی طرح گھل مل گئیں جس طرح وہ لا مار ٹینئر کی یورپین فضاؤں میں گھلی ملی ہوئی تھیں۔

ہر تہوار کے روز رگھو ماما کے آنگن میں ساری لڑکی جمع ہوتیں۔ کڑاہی چڑھائی جاتی۔ چٹائیوں پر بیٹھ کر چھپی ہوئی ساریوں میں لپکا ٹانکا جاتا۔ ڈھولک پر جے امبے گوری میا گایا جاتا۔ کیرتن اور قوالی ہوتی۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا کہ دروازے پر بارات آنے والی ہے اس خوش باش خاندان میں بیس پچیس ہندو لڑکیاں تھیں، اتنی ہی مسلمان اور دو لڑکیاں عیسائی تھیں جن میں سے ایک لال باغ کے پادری صاحب کی بیٹی تھی اور فراک پر دوپٹہ اوڑھ کر آتی تھی۔ اس بشاش گھریلو ماحول کے ساتھ ساتھ رگھبیر ماما کھلاؤ سونے کا نوالہ اور دیکھو شیر کی نگاہ کے نظریے میں یقین رکھتے تھے۔ پرانے مدرسہ فکر کے کاستھ تھے اور خود ان کو مکتب میں مولوی صاحب نے قمچیاں مار مار کر پڑھایا تھا لہٰذا وہ بھی پڑھاتے پڑھاتے لڑکیوں کو ادھ موا کر دیتے۔ بہت سخت قوم پرست تھے۔ ترکِ موالات کے زمانے میں جیل کاٹ چکے

تھے۔اب منتظر بیٹھے تھے کہ کب مہاتما گاندھی حکم دیں اور کب وہ ستیہ گرہ شروع کریں۔جنگ چھڑے ایک سال ہو چکا تھا۔کانگرس کی حکومت مستعفی ہو چکی تھی۔ سیاسی حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔

مارچ کا مہینہ آیا اور لڑکیاں امتحان کے لئے بنارس جانے کو تیار ہوئیں۔کمال اور ہری شنکر' نرملا اور طلعت کو اسٹیشن پہنچانے کے لئے آئے۔تم چلو۔ ہمارے پرچے ختم ہو جائیں تو ہم بھی آتے ہیں پیچھے پیچھے بہت دنوں سے رام نگر کے آم نہیں کھائے۔کمال نے کہا۔یہ ان دونوں کا پرانا وطیرہ تھا۔گرمیوں کی چھٹیاں آئی نہیں اور دونوں نے نکل گھر سے راہ جنگل کی لی سارے ملک کی خاک چھانتے پھرتے تھے جانے کہاں کہاں جاتے۔اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا جلسہ ہے' حیدرآباد دکن جا رہے ہیں۔ اندرا نہرو نے میٹنگ بلائی ہے' الہ آباد کا قصد ہے۔فلاں دوست کلکتے میں اکیلا بور ہو رہا ہے ذرا وہاں تک ہو آئیں۔

''بنارس سے کہاں جاؤ گے؟''نرملا نے پوچھا۔

''ارے ہم سنیاسی آدمی۔ ہمارا کیا پوچھتی ہو۔ جدھر منہ اٹھایا نکل گئے۔ ''کمال نے منہ لٹکا کر کہا۔لڑکیاں پلیٹ فارم پر اپنے سوٹ کیسوں کے پاس کھڑی باتیں کر رہی تھیں۔رگھو ماما سفر کا انتظام کرتے بھاگے بھاگے پھر رہے تھے۔

''ایسے بڑے سنیاسی ہی تو ہو۔گلہ بھگت کہیں کے۔''نرملا نے ہنس کر کہا۔

''کاشی کی پاٹ شالاؤں میں بڑی منوہر کنیائیں پڑھتی ہیں۔''شنکر نے آنکھ بند کر کے کہا۔

''شرم کرو بھیّن۔''طلعت نے کہا۔''یہ سامنے تمہاری اسٹوڈنٹ لوگ کھڑی

ہیں، کیا کہیں گی کہ مولوی صاحب ایسی افسوسناک باتیں کرتے ہیں۔"

ہری شنکر فوراً پلٹ کر بڑی سنجیدگی سے حمیدہ بانو کے پاس گیا اور نہایت رعب اور وقار کے ساتھ اس کو سمجھانے لگا امتحان کے لئے غالب کی کون کون سی غزلیں پڑھے۔ ٹرین آئی اور یہ دلچسپ قافلہ بنارس کی طرف روانہ ہو گیا۔

## ۳۸

چمپا احمد نے بیسنٹ کالج کے کلاس روم کے دریچے میں آ کر نیچے نظر ڈالی۔ لو چل رہی تھی۔ دور سڑک پر ایک بگولہ اڑتا ہوا جا رہا تھا۔ سارے میں املتاس کے زرد پتے تیرتے پھر رہے تھے۔ نیچے کالج کا وسیع، بے رونق میدان گرمی کی سہ پہر میں پڑا تپتا تھا۔ جانے بارش کب ہوگی، چمپا نے سوچا۔ سفید کھادی کی ساریاں پہنے لڑکیوں کی ایک ٹولی کالج کی دوسری عمارت کی طرف جا رہی تھی۔ کلاس روم کے ڈائس کے اوپر سے مسز اینی بیسنٹ کی بڑی روغنی تصویر مسکرا رہی تھی۔ یہ مسکراہٹ بھی چمپا کو بہت اداس معلوم ہوئی۔ گھنٹہ بجا اور لڑکیاں برابر کے کمرے سے نکل کر باہر آئی۔ لیلا بھارگوا کے ہمراہ اس نے زینہ طے کرنا شروع کیا۔ قریب کے ایک برآمدے میں ہائی سکول کے امتحان کا کوئی پرچہ کیا جا رہا تھا۔ چھتری سنبھال کر وہ اور لیلا سڑک پر نکل آئی۔ ابھی انہیں کسی پروفیسر سے ملنے یونیورسٹی جانا تھا۔ تانگے پر بیٹھ کر وہ یونیورسٹی کی طرف روانہ ہوئیں۔

یہ چمپا کی زندگی کا معمول تھا۔ بسنت کالج، یونیورسٹی، گھر

'جاڑے' گرمیاں' برسات' پھر جاڑے ۔ بنارس کا شہر' اپنا مکان' محلّہ' رشتے دار' کتابیں وہ اٹھارہ سال کی تھی لیکن بوڑھوں کی طرح سوچتی شاعروں کی طرح محسوس کرتی تھی' بچوں کی طرح ہنستی یا رنجیدہ ہوتی تھی ۔ کائنات کا سارا بوجھ اس کے کندھوں پر تھا۔ اس کے والد متوسط طبقے کے ایک شریف آدمی تھے ۔ ماں بھی متوسط طبقے کی ایک شریف خاتون تھیں۔ ان کے یہاں کوئی گلیمر نہ تھا' کوئی افسانے نہیں تھے' نہ کوئی روائتیں ۔ سیدھے سادے لوگ تھے جس طرح کے سیدھے سادے لوگ ہندوستان کے شہروں میں بستے ہیں۔ چمپا کے والد وکالت کرتے تھے ۔ مراد آباد کے رہنے والے تھے ۔ چمپا کی ننہیال بنارس میں تھی' وہیں چمپا کے والد پریکٹس کرتے تھے اوسط درجے کی آمدنی تھی ۔ ان کے یہاں ٹیلیفون نہیں تھا' نہ موٹر کار' نہ فریجڈیر اور وہ لوگ کوٹھی میں نہیں رہتے تھے۔ چمپا اپنے ماں باپ کی اکلوتی لڑکی تھی ۔ اس کا سارا جہیز تیار رکھا تھا۔ دھڑا دھڑ پیغام آرہے تھے ۔ گھر والوں کا خیال تھا کہ چمپا بی۔ اے پاس کرلے تو اس کا بیاہ کردیں گے ۔ چمپا نے کسی کانونٹ اسکول میں نہیں پڑھا تھا۔ نہ وہ گرمیوں میں مسوری جاکر رولرا سکیٹنگ کرتی تھی ۔ اس کی ننہیال زیادہ خوشحال تھی' گو وہ بھی مڈل کلاس ملازمت پیشہ لوگ تھے ۔ چمپا کے ایک ماموں بہت زیادہ خوشحال تھے اور لکھنو میں رہتے تھے جہاں وزیر حسن روڈ پر ان کی کوٹھی تھی ۔ چمپا کے والد سیاست میں ہلکی پھلکی دلچسپی رکھتے تھے ۔ اس کے ایک چچا مراد آباد سٹی مسلم لیگ کے صدر تھے ۔ ۱۹۳۷ء میں لکھنو میں جب دھوم دھام کا مسلم لیگ کا اجلاس ہوا تو اس میں چمپا کے والد اور چچا دونوں شرکت کے لئے گئے تھے ۔ راجہ صاحب محمود آباد جب بھی بنارس آتے

کے والدان کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتے اور پاکستان کے مطالبے پر تبادلہ خیالات کرتے۔ پاکستان بنا تو مراد آباد تک کا علاقہ تو اس میں ضرور شامل ہوگا' کیا وجہ کہ مغربی اضلاع میں مسلمان زیادہ طاقت ور ہیں۔ چمپا کے والد اظہار خیال کرتے۔

''اے واہ۔ مراد آباد پاکستان میں شامل ہو جائے اور ہم کاشی والے کہاں جائیں۔'' چمپا کی والدہ چمک کر کہتیں۔

''اجی تم پوربیوں کا کیا ہے۔ چلو تم کو بھی بلا لیں گے۔'' ان کے والد حقے کا کش لگا کر اطمینان سے جواب دیتے۔ ان مبہم اور جذباتی بنیادوں پر یہ لوگ سیاست سے کھیل رہے تھے۔

ویسے بھی بنارس میں روز کوئی نہ کوئی آل انڈیا قسم کا ہنگامہ رہتا۔ یہ شہر ہندو مہا سبھا کا گڑھ تھا اور ہندی اتھوا ہندوستانی کی تحریک کا صدر مقام۔

اسی بنارس میں پنچ گنگا گھاٹ تھا جہاں کبیر رہے تھے اور یہیں سارناتھ تھا۔ جہاں شاکیہ منہ گوتم نے دھرم کا چکر چلایا تھا اور یہیں وشویشور کا مندر تھا۔ یہ شو پوری تھی۔ شو ــــــــــ خدائے مسرت کا شہر۔

چمپا بیسنٹ کالج میں' جو بسنت کالج کہلاتا تھا' سیکنڈ ایر میں تھی۔ اس سال اس نے انٹر کا امتحان دیا تھا اور اب اسے ازابلا تھوبرن کالج جانا تھا کیونکہ اس ادارے میں تعلیم حاصل کرنے سے لڑکیوں کی سماجی حیثیت یکلخت بے انتہا بلند ہو جاتی تھی۔ چمپا کے والد والد ایک اچھے مسلم لیگی کی حیثیت سے اسے علی گڑھ بھیجنا چاہتے تھے مگر اماں نے کہا نہ۔ یہ ہرگز نہیں ہونے کا۔ بیٹا تو آئی۔ ٹی۔ میں پڑھیں

گی جیسے رانی پھول کنور اور رانی صاحب بلاری کی بیٹیاں آئی۔ٹی میں پڑھت ہیں۔چمپا کی اماں کو یہ بھی معلوم تھا کہ آئی۔ٹی میں پڑھنے والی لڑکیوں سے آئی۔سی۔ایس لوگ شادی کرتے ہیں اور پھر ان کے بڑے بھائی لکھنو میں رہتے تھے اور وہاں کے سارے بڑے بڑے لوگوں سے واقف تھے۔

چمپا کالج سے لوٹ کر آتی تو اپنے چھوٹے سے کمرے میں بیٹھ کر' جو چھت پر تھا' افق تک پھیلے ہوئے شوالوں کے کلسوں کو دیکھا کرتی یا انگریزی ناول پڑھتی' وہ جین آسٹن پر عاشق تھی اور قرون وسطیٰ پر اور انیسویں صدی کے کیٹس اور روزٹی وغیرہ۔جب وہ یونیورسٹی لائبریری میں امیندر ناتھ ٹیگور اور نندلال بوس کی تصاویر دیکھتی تو اسے بے حد اچھا لگتا۔یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ چمپا احمد بھی ایک رومینٹک روح تھی۔

لیلا بھارگوا کے ساتھ وہ یونیورسٹی پہنچی۔یہاں بھی امتحان امتحان کا ماحول ہر طرف طاری تھا گہما گہمی' چہل پہل۔کچھ چہروں پر پریشانی تھی کچھ پر اطمینان۔یہ سب جانے پہچانے چہرے تھے۔یہ لڑکے اور لڑکیاں سب اسی کی دنیا کے باسی تھے۔مجمعے میں چمپا کو تقویت محسوس ہوتی۔ہجوم اس کے ساتھ ہے۔ہجوم اس کی حفاظت کرے گا۔یہ لوگ سارے اس کے بھائی بند تھے۔یونیورسٹی کے مختلف کالجوں کی طالبات' لیکچرار لڑکیاں' مدراسی اور بنگالی بوڑھے پروفیسر' مہاراشٹر کی سائنس دان خواتین' سنسکرت اور اور فارسی کے عالم فاضل۔یہ سب جو تیزی سے اور مصروفیت سے ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔یونیورسٹی علم کا گھر ہے۔علم میں تعصب کس طرح داخل ہوتا ہے' یہ اسے معلوم نہ تھا۔تعصب اور نفرت اور تنگ نظری'

شکوک اور ہٹ دھرمی' ان بھوتوں سے وہ ابھی روشناس نہ ہوئی تھی۔ اسے صرف اتنا معلوم تھا کہ اس کے آس پاس کی دنیا میں بڑا زبردست شور مچ رہا ہے اور یہ شور س کے دل کی اندرونی خاموشی میں مخل ہوتا ہے تو بڑی تکلیف محسوس ہوتی ہے۔

سامنے ایک بڑے چبوترے پر شامیانے کے نیچے ہائی سکول کا میوزک کا پرچہ ہو رہا تھا۔ چاروں طرح طرف سے لڑکیوں کے ہلکے ہلکے گنگنانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ انہیں لڑکیوں میں تیز وطرار اور بشاش لڑکیوں کا وہ گروہ شامل تھا جو لکھنو سے آیا تھا۔ چمپا اور ریلا مسز چنتامنی دیگر سے باتیں کرنے مصرف رہیں جو ان کی ہسٹری کی استاد تھیں سامنے سرسوتی کا مرمریں مندر تھا۔ ہندو لڑکے اور لڑکیاں فاؤنٹین پن اور کتابیں سنبھالے آتے' دیوی کے سامنے سر جھکا کر دعا مانگتے اور اپنی اپنی امتحان گاہ کی طرف روانہ ہو جاتے۔

اتنے میں گھنٹہ بجا۔ شامیانے کے نیچے سے لڑکیوں نے نکلنا شروع کیا۔ دو لڑکیاں بچوں کی طرح اچھلتی کودتی سیڑھیوں پر سے اتریں اور بھاگ کے ایک اور گروہ سے جا ملیں جس کے وسط میں ایک سورداس جی کھڑے تھے اور سب لڑکیاں جلدی جلدی ان کو بتلا رہی تھیں کہ تھیوری کے پرچے میں انہوں نے کیا لکھا۔ یہ دونوں لڑکیاں فراک پہنے تھیں اور باقی کی ساری لڑکیوں کے مقابلے میں بہت کم عمر تھیں۔

اتنے دونو جوان لڑکے' جو شکل وصورت سے ان دونوں بچیوں کے بھائی معلوم ہوتے تھے' مجمعے میں کہیں سے نمودار ہوئے۔ رام نگر اسٹیٹ کی ایک کار آن کر رکی اور یہ چاروں اس میں جا بیٹھے۔ دوسرے لمحے کار دھول اڑاتی ہوئی نظروں سے

اوجھل ہوگئی۔

لکھنو سے آئی ہوئی لڑکیوں میں ایک لیلا بھارگوا کو پہچانتی تھی۔اس نے قریب آن کر کہا: 'نمستے' لیلا دیدی۔ہم لوگ امتحان کے بعد اپنے یہاں ایک پارٹی کر رہے ہیں۔آپ ضرور آیئے گا۔''

''نمستے بینا۔یہ چمپا ہیں۔''

اس نے دوبارہ نمستے کیا۔''آپ بھی آیئے گا چمپا دیدی۔''

''ضرور''

''تم لوگ تو میرس کالج والے ہو۔تم سب کے ناچ گانے کی اتنی دھوم سنی ہے۔خالی پارٹی دے رہی ہو۔تمہارا ناچ نہیں دیکھیں گے ________؟''چمپا نے پوچھا۔

''چمپا دیدی کاشی اور لکھنو کا مقابلہ کروانا چاہتی ہیں ______؟''ایک اور لڑکی نے قریب آکر کہا۔

''اچھا'یہ بات ہے۔''بینا ماتھر نے جواب دیا۔''تو پھر ہو جائے فیصلہ۔کہا کی بھیرویں بہتر ہے' کہاں کا دادرا' کہاں کا کتھک چلئے آیئے میدان میں۔''

''رہی۔؟''

''رہی۔''

اب ان کے آس پاس لڑکیوں کا ہجوم لگ گیا۔بنارس کی لڑکیاں لکھنو والیوں پر چوٹیں کر رہی تھیں' مگر لکھنو والوں سے باتوں میں کون جیت سکتا تھا؟ وہیں طے کیا گیا کہ بسنت کالج میں ان لوگوں کو بنارس کا کتھک دکھایا جائے گا مگر اس سے

پہلے وہ سب لکھنو کی لڑکیوں کے ہوسٹل پر دھاوا کریں گی۔

ان سب خوشدلی کی باتوں کے بعد چمپا اور ریلیا پھر تانگے پر بیٹھیں اور اپنے گھروں کی طرف روانہ ہو گئیں۔

## ۳۹

بنارس پہنچ کر طاعت اور نرملا اور ساری لڑکیاں جس جگہ پر ٹھہری تھیں وہ ایسی عجیب وغریب جگہ تھی جس کا ذکر آج سے دس سال بعد حمید بانو اپنے افسانوں میں کیا کرے گی (اگر اس نے افسانے لکھے)۔ یہاں پر یقیناً اس کی ہیروئن رہے گی یا ہیرو اس کی چھت پر سے کود کر گھوڑے پر سوار ہو گا وغیرہ ____ اور اس جگہ پر ایک ایسی ناقابل بیان دنیا آباد ہو گئی تھی جس کی طرح ناقابل بیان دنیا وسیع سیاہ سمندر میں گھرے ہوئے جہاز پر متضاد راستوں کی سمت جانے والے مسافروں کے اکٹھے ہونے سے آباد ہو جاتی ہے۔

یہ ایک وسیع احاطے کے وسط میں بنا ہوا ایک بہت بڑا سنگ سرخ کا سہ منزلہ محل تھا جس کی مالکہ ایک لاولد برہمن رئیس زادی تھیں جو کانگرس ورکر تھیں اور مستقل یاتراؤں پر جاتی رہتی تھیں۔ محل اسی طرز کا تھا جس طرز کے عام ہندوستانی محل ہوتے ہیں۔ وسط میں ایک زبردست آنگن تھا جس کے چاروں طرف دالان در دالان اور کمرے تھے اور بے شمار گلیارے اور کوٹھڑیاں اور صحنچیاں اور تہ خانے اور شہ نشین اور ان گنت طاق اور طاقچے ________ مالکہ مکان نے، جن کو سب پنڈ

تائن صاحب کہتے تھے، فخر یہ بتلایا کہ جب سلطان عالم قید فرنگ کے عالم میں لکھنو سے کلکتے لے جائے جا رہے تھے تو مہاراجہ بنارس نے ان کو اسی مکان میں بصد تکریم ٹھہرایا تھا۔ یہ بات سن کر حمید بانو بہت متاثر ہوئی اور اس نے پنڈ تائن کو سلطان عالم کے عہد سے تعلق رکھنے والی چند مستند حکایات سے مستفید کیا۔ پنڈ تائن سے حمید بانو کی خوب گٹھی، وہ خود بھی بزبان ہندی افسانے لکھتی تھی مگر لڑکیوں کی آمد کے تیسرے روز ہی وہ ایک اور یاترا کے لیے جگن ناتھ پوری چل دیں اور جاتے جاتے اپنی رہائش کے کمروں کی کنجیاں بھی لڑکیوں بھی لڑکیوں کے حوالے کرتی گئیں۔ اپنی قیمتی بنارسی ساریاں انہوں نے لڑکیوں کو زبردستی تحفے میں دیں ۔صبح شام تک اس قدر خاطر داری میں لگی رہیں کہ اگر ان کا بس چلتا تو لڑکیوں کی طرف سے پرچے بھی خود ہی کر آتیں پنڈ تائن اگر ایسی عجیب وغریب نہ ہوتیں تو بات نہ بنتی ۔اس افسانوی محل کی مالکہ کو بھی اتنا ہی غیر حقیقی ہونا چاہیے تھا۔

دن بھر محل میں ایسا ہنگامہ رہتا گویا بہت سی باراتیں ٹھہری ہوئی ہیں (محل کا نام ''چندن نوا'' تھا) ہر طرف لڑکیوں کی ٹولیاں نظر آتیں آنگن میں ٹہل ٹہل کر پڑھا جا رہا ہے، کسی شہ نشین میں الٹا لیٹ کر مطالعہ کیا جا رہا ہے۔ باغ کے ایک کونے میں ایک شکستہ مندر تھا۔ اس کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر امتحان کی تیاری ہو رہی ہے۔ موسیقی کے پرچوں کے زمانے میں ہر کونے کھدرے سے گنگانے کی آوازیں آتیں ۔ رگھو ماما ذمے داری کے شدید احساس کے ساتھ ادھر ادھر انتظامات کرتے پھرتے یا لڑکیوں کو ڈانٹتے پھٹکارتے پھر ہڑونگے پن میں لگ گئیں، جایئے پڑھیے۔ کھانے کے لیے دسترخوان بچھتا تو برہمن رسوئیا، جو بے انتہا

موٹا تھا' ہنکارا بھرتا اندر آتا۔ اس کے پیچھے پیچھے اس کا اسسٹنٹ رسوئیا دہی کی بالٹی اٹھائے ہوتا۔ پتیل کی ایک بڑی سی ڈوئی میں وہی بھر بھر کر چیف رسوئیا لڑکیوں کی پلیٹوں پر بہت بلندی سے دہی ٹپکاتا' پھر تھالیوں اور کٹوریوں میں کھانا پروسا جاتا۔ رات کو آنگن میں تاروں بھرے آسمان کے نیچے محفل جمتی۔ جب امتحان شروع ہوئے تو ہر روز پرچے کرنے جاتے وقت جب لڑکیاں محل کے صدر دروازے سے نکلتیں وہاں کانتی دیدی دہی اور ماش تیل لیے کھڑی ملتیں اور وہ ہر لڑکی کو باری باری دہی مچھلی کا شگون کرواتیں۔

موسیقی کا امتحان بہت کڑا تھا۔ اس سے لڑکیاں تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ حالانکہ میرس کالج کا سیکنڈ ایر کا نصاب یہاں بھی تھا مگر بہر حال یہ دوسری یونیورسٹی تھی اور ممتحن حضرات میں نارائن راؤ دیا شامل تھے جن کا نام سن کر ہی ڈر کے مارے جان نکلتی تھی۔

(جس روز امتحان تھا تیز دھوپ پڑ رہی تھی۔ ایک سرخ رنگ کی اداس عمارت کی چھت پر دو کمرے بنے تھے۔ ایک میں نارائن راؤ دیاس بیٹھے تھے۔ لڑکیاں چھت کی منڈیروں کے سائے میں کھڑی جلدی جلدی مشکل راگوں کو نیچی آواز میں دہرا رہی تھیں۔ کمرے میں بیٹھے ہوئے ایک ممتحن اس قدر خفا معلوم ہوتے تھے۔ گویا ابھی سب کچھ چبا جائیں گے۔ کسم سکینہ گھبرا گھبرا کر بٹول کے سنترے کھا رہی تھی کہ حلق خشک نہ ہو۔ منڈیر پر ایک چیل آنکھیں نیم وا کیے غنودگی کے عالم میں یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی جیسے سوچتی ہو ان سب باتوں سے کیا فرق پڑتا ہے؟ پھر وہ چیل سارناتھ کی طرف اڑ گئی)

تھیوری آف میوزک کے پرچے کے روز کمال اور ہری شنکر آن دھمکے۔ طلعت اور زرملا پرچہ کر کے شامیانے سے باہر نکلیں تو انہوں نے سرسوتی کے مندر کے نیچے دو لڑکیوں کو مسز ولیسکر سے باتیں کرتے دیکھا۔ ان لڑکیوں کے قریب ہی سے کہیں سے کمال اور ہری شنکر نمودار ہوئے۔ ان لڑکیوں میں سے ایک کی بہت پیاری شکل تھی اور اس کا رنگ دھوپ میں کندن کی طرح دمک رہا تھا۔ دونوں لڑکے رام نگر کے دیوان صاحب کے یہاں ٹھہرے تھے جو طلعت اور کمال کے قرابت دار تھے' پھر تیز دھوپ میں دریا پار کر کے وہ چاروں رام نگر پہنچے اور "پالش کی ہوئی سڑکوں" پر سے گزرتے ہوئے طلعت کو ایک دم قدیر کا خیال آیا جو بچپن میں ان کو مختلف قسم کی معلومات سے مستفید کرتا رہتا تھا۔

"مجھے قمرن کے لیے ساری اور چوڑیاں خریدنی ہیں۔" طلعت نے با آواز بلند کہا۔

"ابھی تمہاری خریداری کی مہم شروع نہیں ہوئی۔" کمال نے پیچھے مڑ کر پوچھا۔

"نہیں۔ پیسے لاؤ۔"

اب دونوں لڑکوں نے غرا کر دونوں لڑکیوں کو دیکھا۔

"تمہارا خیال ہے ہم مہاجن ہیں۔ کوٹھی چلتی ہے ہماری؟" کمال نے غصے سے کہا۔

"ہم تو دو مفلس قلاش برہمچاری و دیارتھی ہیں۔ خود دان پن پر گزر کرتے ہیں۔" ہری شنکر نے کہا۔

"لیکن اس کے باوجود ہم دل بادشاہوں کا رکھتے ہیں۔" کمال نے کہا۔

"صحیح کہتے ہو۔" ہری شنکر نے گلا صاف کر کے صاد کیا۔

"اور اگر تم ہم کو بتلا دو کہ وہ مہا سندر روپ وتی کون ہے جو سرسوتی کے مندر کے سائے میں کھڑی تھی تو بنارس کی ساری چوڑیاں تم کو خرید دیں گے۔" کمال نے کہا۔

"کون مہا سندر روپ وی۔" طاعت اور نرملا نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"تم نہیں جانتیں اس دیوی کو جو دیوی کے استھان کے پاس کھڑی مسکراتی تھی؟" کمال نے مایوسی سے پوچھا۔

"بالکل نہیں، مگر پیسے لاؤ۔"

"اگر تم اس کا پتا چلا دو۔" ہری شنکر نے کہا۔

"بھین تمہارے لیے تو لڑکیوں کے پتے چلاتے چلاتے ناک میں دم آ گیا ہے۔" نرملا نے جو عمر میں بڑی اور نسبتاً سمجھ دار تھی چڑ کر جواب دیا۔

اسی طرح جھگڑا کرتے وہ رام نگر پہنچے اور دن بھر خس کی ٹیٹوں کے پیچھے بیٹھ کر انھوں نے دن گزارا اور آم کھائے اور رشتے داروں سے گپیں ہانکیں اور دیوان صاحب کی بیگم صاحب نے فوراً کاشی کی بہت سی رئیس زادیوں سے ہری شنکر کی بات طے کر دی اور سب بہت بشاش ہوئے۔

جب امتحان ختم ہوئے تو لڑکیوں نے گھومنے پر کمر باندھی۔ ماما اور کانتی دیدی کی قیادت میں ان کے غول کے غول گلی کوچوں میں گھستے پھرے۔ چوڑیوں کی دکانوں کی دکانوں کے سامنے یہ لوگ دھرنا دے کر بیٹھ رہیں۔ انھوں نے ان

گنت چوڑیاں خرید ڈالیں۔شام پڑے کشتیوں میں بیٹھ کر جب وہ گنگا کے دھارے پر دنیا بھر کے گانے گاتیں حمید بانو موقع ومحل کی مناسبت سے پاٹ دار آواز میں۔اے آب رود گنگا ______ والی نظم شروع کر دیتی۔سب لڑکیاں مل کر اسے اٹھاتیں۔ انہوں نے شہر میں جا کر تازہ ترین فلم دیکھا جس کا نام ''خزانچی''تھا'پھر ایک روز بھری دوپہر یا میں وہ سب سارناتھ پہنچے۔ جہاں کے ایک معبد کے مرمریں فرش پر دیوؤں کی روشنی رقصاں تھی اور ایوان میں چھوٹے بڑے سنہری مجسمے پرنس گوتم سدھارتھ کے رکھے تھے اور ماحول کے تقدس سے مرعوب ہو کر سب لڑکیوں نے دوپٹوں اور ساری کے آنچلوں سے سر ڈھانپ لیے اور سب نے بدھ کی موجودگی میں اپنے آپ کو بے انتہا پاکیزہ محسوس کیا۔

''یہاں کس قدر سکون ہے۔''طلعت نے کہا'وہ سب ہال میں دیوار سے ٹک لگائے چپ چاپ بیٹھی تھیں۔

''ہاں آں۔''حمید بانو نے سر ہلایا'پھر وہ بڑے پراسرار طریقے سے مسکرائی۔ گویا اب کسی زبردست حقیقت کا انکشاف کرنے والی ہے۔

''بات یہ ہے۔''اس نے کہا'' کہ ہم سب اتنی گھام میں مارے مارے پھرنے کے بعد یہاں آ کر بیٹھے ہیں اس لیے خواہ مخواہ سکون محسوس ہو رہا ہے۔''طلعے کو حمید بانو کی یہ حقیقت پسندی بہت کھلی۔

''مگر یہ واقعہ ہے کہ مہا تما بدھ کے چہرے کو دیکھ کر سکون ملتا ہے۔''طلعت نے سوچ کر کہا۔

''اجی تم کی اجانو یہ باتیں۔''حمید بانو نے بزرگی سے کہا'' دراصل ہم

مسلمانوں کو یہ سب نہیں سوچنا چاہیے۔'' پھر وہ سر جھکا کر غور و خوض میں محو ہو گئی' وہ پانچوں وقت کی نماز پڑھتی تھی اور بڑی رومان پرست تھی مگر اس ذہنی کش مکش کا حل تلاش کرنے کی اس کی عمر نہ تھی کہ جب وہ کلمہ گو ہے تو اسے بتوں سے بھی الفت کس واسطے ہے۔ دیر و حرم کے مسئلے پر وہ کچھ دیر اور غور کرتی مگر اتنے میں معاً طاعت اٹھی اور اس نے بڑے مجسمے کے سامنے جا کر رقص کرنا شروع کیا' پھر بینا ماتھر بھی اس رقص میں شامل ہو گئی۔ چند لمحوں بعد سب لڑکیاں گھیرا باندھے ناچ رہی تھیں اور ان سب میں حمید بانو پیش پیش تھی۔ دو جاپانی بھکشو جو ایک ستون کے پاس وزیٹرز رجسٹر کھولے بیٹھے تھے ذرا اچنبھے سے یہ منظر دیکھتے رہے۔

باہر عمارت کے سائے میں کھڑے کھڑے ہری شنکر مہایان بدھ ازم کی تاریخ پر کمال کو ایک لیکچر دے رہا تھا اور کمال نے قریب کے ایک ستوپ کے پتھروں پر ہاتھ رکھ کر سوچا میں اس لمس کے ذریعے اس دوسرے وقت میں موجود ہوں وہ وقت جو گزر چکا لیکن اب بھی ہے۔ اسے یہ سوچ کر ایک لمحے کے لیے چکر سا آ گیا' پھر اس نے آنکھیں کھول کر ہری شنکر کو دیکھا جو بڑی اہمیت کے ساتھ ایک جاپانی بھکشو سے کچھ انٹ سنٹ اڑا رہا تھا اور جاپانی بھکشو ہری شنکر کی علمیت سے بہت مرعوب نظر آتا تھا۔ چاروں طرف سرخ ریت پھیلی ہوئی تھی اور دھوپ میں ستوپ کھڑے تپ رہے تھے اور ایک راستہ چکر کاٹتا نیچے سے اوپر جاتا تھا اور ستوپ کے چاروں طرف گھوم کر وہ راستہ پھر نیچے لوٹ آتا تھا۔ کمال نے ہری شنکر کے ساتھ ساتھ اس پر چلنا شروع کیا۔ اب لڑکیاں باہر آ چکی تھیں اور حمید بانو قریب سے کانتی دیدی سے کہتی ہوئی گزر رہی تھی: میں خواب میں یہاں کئی بار آ چکی ہوں۔

مجھے لگتا ہے میں اس جگہ سے واقف ہوں۔ پہلے بھی یہاں آ چکی ہوں میں نے یہ سرخ ریت والا تپتا ہوا راستہ پہلے بھی دیکھا ہے۔

گڈ اولڈ حمید بانو ______ کمال نے مسکرا کر دل میں کہا۔ یہ لڑکی بڑی ہو کر ضرور افسانہ نگاہ بن جائے گی اور روحانیات میں دلچسپی لے گی اور شاید تھیوسو فیکل سوسائٹی میں شامل ہو جائے۔

''حمید بانو ______ ظہر کا وقت ہے' چلو نماز پڑھ لیں۔'' رفیعہ باجی نے ستوپ کی سیڑھیوں سے اترتے ہوئے آواز دی اور حمید بانو ہڑ بڑا کر سرخ ریت والے راستے پر سے اتری اور ایک آم کے درخت کی طرف چلی گئی جہاں چند لڑکیاں پہلے سے ستانے کے لیے جا بیٹھی تھیں۔

کمال نے اس منظر کو دیکھا۔

ستوپ اور میوزیم کی عمارت اور بڑا مندر جس کا عظیم الشان سنہرا گھنٹہ دور سے نظر آ رہا تھا اور لوگ چاروں اور پھر رہے تھے اور ان کے سائے زمین پر لرزاں تھے۔

سائے قائم رہتے ہیں۔ انسان ختم ہو جاتا ہے۔ سائے میں بڑی طاقت ہے۔ ہم عمر بھر مختلف سایوں کا تعاقب کرتے ہیں مگر سایہ ہاتھ نہیں آتا' وہ اپنی جگہ امٹ ہے۔ سائے کی اور وقت کی آپس میں سازش ہے۔

''چار بج رہے ہوں گے ______'' گھبیر ماما نے پھاٹک کے سائے کو زمین پر دیکھ کر وقت کا اندازہ لگاتے ہوئے اظہار خیال کیا۔ ''اب واپس چلنا چاہیے۔''

''چلولڑکیو'' کانتی دیدی نے آواز لگائی۔

لکھنو واپس جانے کے دن قریب آئے اور روانگی سے ایک روز قبل چندن نواس کے آنگن میں صدر دالان کے نزدیک اسٹیج بنا اور اسے کیلے کے پتوں سے سجایا گیا۔محل کے وسیع لق و دق اینٹوں کے فرش والے صحن میں چھڑکاؤ ہوا تھا اور بڑی سی چاندنی بچھائی گئی تھی اور پچھلے دالان میں گرین روم تھا اور اگلے دالان میں جاجم ٹانگ کر پردہ بنایا گیا تھا جس کے پیچھے ساز رکھے تھے اور بینا ماتھر میوزک ڈائریکٹر بنی بیٹھی تھی اور سورج بخش سریواستوا جلدی جلدی سب رکھے تھے اور بینا ماتھر میوزک ڈائریکٹر بنی بیٹھی تھی اور سورج بخش سریواستوا جلدی جلدی سب باجوں کے سر ٹھیک کروا رہے تھے۔باقاعدہ ڈراما کرنے کی کسے فرصت تھی۔وقت کے وقت طے کیا گیا تھا کہ راج رانی میرا ہوگا۔یہ اس لیے کہ اس میں زیادہ ڈائیلاگ وغیرہ کی ضرورت نہ تھی۔سارا کام میرا کے بھجنوں کے ذریعے چل سکتا تھا اور لڑکیاں ایسی ماہر فن تھیں کہ اسٹیج پر ادھر سے ادھر چلتی رہی۔طلعت جنرل رول ادا کررہی تھی۔جہاں ایکٹروں کی کمی پڑی وہاں یہ جھٹ سے موجود۔ایک سین میں وہ اکبر اعظم کی وزیر بنی۔دوسرے میں میرا کی سہیلی۔تیسرے میں جہاں میرا سے رانا کی شادی ہوتی ہے وہاں جلدی سے اکبر اعظم کی مونچھیں مستعار لے کر وہ پنڈت بن گئی اور منڈپ میں جاکر اڑنگ بڑنگ اوم سواہا کہہ کر اس نے میرا بائی کی شادی کرادی۔

پھر بہت سی لڑکیاں راس لیلا کے ناچ کے لیے چھن چھن کرتی آئیں۔انہوں نے دنیا بھر کے زیور پہن رکھے تھے۔حد یہ کہ رفیعہ باجی جیسی موٹی خاتون بھی ماتھے

پرنقرئی بور سجا کر متھرا کی گوالن بنی تھیں ۔حمید بانو نقلی موتیوں اور پنیوں کا مکٹ پہنے بڑے اسٹائل سے بانسری اٹھائے کھڑی رہی ۔نرملا ستار سنبھالے والا ان کے پیچھے سے گویا بیک گراؤنڈ میوزک دے رہی تھیں ۔

سامنے آڈینس تھا ۔کھلے آسمان کے نیچے جگمگاتے تاروں کی چھاؤں میں بہت سے لوگ بیٹھے تھے ۔جانے کون کون ۔بسنت کالج اور یونیورسٹی کی لڑکیاں، لیکچر اور پروفیسر صاحبان، بہت سے لڑکے، ان ہی میں اگلی قطار کے سرے پر چمپا احمد اور لیلا ابھار گوا بیٹھی تھیں ۔ہری شنکر اور کمال چاندنی کے فرش پر براجمان تھے ۔رگھو ماما ٹک کر ڈراما دیکھنے کے بجائے خوش خوش گھبرائے گھبرائے پھر رہے تھے ۔

چمپا اور کمال اور ہری شنکر تینوں اس سے الگ الگ آنکھوں سے سامنے کا تماشا دیکھا کیے ۔

لڑکیاں اس سمے دنیا مافیہا سے بے خبر صرف اس اسٹیج پہ موجود تھیں اور بے حد خوش تھیں ۔

لڑکیاں سوانگ رچنے کے بے حد شوقین ہوتی ہیں ۔بچپن میں وہ پلنگ کھڑے کر کے ان پر پلنگ پوش کے پردے لگا کر گھر گھر، کھیلتی ہیں ۔گھروندا سجا کر تصور کرتی ہیں یہ سچ مچ کا مکان ہے ۔ہنڈکلیا ان کے نزدیک بڑا اہم دعوتی کھانا ہوتا ہے ۔گڑیاں گڈے ان کے لیے جاندار انسان ہیں ۔جب ذرا بڑی ہو جاتی ہیں تو اپنا بناؤ سنگھار کر کے کس قدر مسرور ہوتی ہیں ۔باہر جانے سے پہلے گھنٹہ بھر آئینے کے سامنے صرف کریں گی ۔جوتوں اور کپڑوں کا انتخاب ان کے لیے آفاقی اہمیت کا حامل ہے ۔سجنا، بہروپ بھرنا ان کے لیے بے حد ضروری ہے ۔رادھا اور کرشن کا

ناچ ناچتی ہیں تو تصور کرتی ہیں کہ واقع ورندا بن میں موجود ہیں۔ساری عمران کی اپنی ایک نازک سی دنیا بسانے میں گزرتی ہے اور یہ دنیا بسا کر وہ بڑے اطمینان سے اس میں اپنے آپ کو پجارن یا کنیز کا درجہ تفویض کر دیتی ہیں۔اول دن سے ان کے بہت سے چھوٹے بڑے دیوتا ہوتے ہیں جو ان کی رنگ بھوم کے سنگھاسن پر اطمینان سے آلتی پالتی مارے بیٹھے رہتے ہیں۔ باپ' بھائی' شوہر' خدا' بھگوان' کرشن' بیٹے' پرستش کرنا اور خدمت کرنا ان کے مقدر میں لکھا ہے۔جب رنگ بھوم کا ڈائریکٹر ان سے کہتا ہے کہ تم مہارانی ہو دل کی ملکہ ہو' دنیا کی حسین ترین لڑکی ہو' روپ وتی ہو تو یہ بے چاریاں بہت خوش ہوتی ہیں۔

لڑکیاں بے حد مضحکہ خیز ہوتی ہیں۔ڈرامے کرتی ہیں۔

یہ کس مسخرے نے کہا ہے کہ عورت کا کام دلوں کو توڑنا اور دنیا پر حکومت کرنا ہے۔سب جھوٹ ہے۔گپ۔بکواس۔یہ تو کہیں سے کہیں پہنچ جائیں۔کتنی ہی ودوان بن جائیں' کتنی ہی ودوان بن جائیں' کتنی ہی بڑی سلطنت کا تاج ان کے سر پر ہو' ان کی اوقات وہی رہے گی۔پجارن۔کنیز۔

لاحول ولاقوۃ

کمال راس لیلا دیکھتا رہا۔سامنے گوپیاں اب کرشن کی آرتی اتار رہی تھیں۔ دالان میں نرملا اور بینا ماتھر زور زور سے گاتی رہیں:

''موہن سنا دے میٹھی تان۔مدھر' رس بھری' رسیلی' پیاری پریم کی تان۔''

واہ____ کیا بات ہے۔

اری مورکھ لڑکیو تم کو خبر بھی ہے پریم کی تان کتنی بڑی مصیبت کا گھر ہے۔کبیر

یہ گھر ہے پریم کا' خالہ کا گھر نا نہہ ______ کمال کو کبیر داس کا ایک دوہا یاد آیا۔
اس نے پہلو بدل کر سگریٹ سلگا لیا۔

۴۰

بیساکھ کا مہینہ گزرا' جیٹھ کا' اساڑھ میں رزلٹ نکلا۔ چمپا احمد پاس ہو گئی تھیں اور حسب توقع فرسٹ ڈویژن انہوں نے حاصل کیا تھا۔ اب ان کے سفر کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ ساریاں خریدی گئیں۔ ہاؤس کوٹ تیار ہوئے۔ لکھنو ماموں میاں کو خط لکھا گیا۔ جولائی میں چمپا بیگم آ رہی ہیں۔

ایک روز شام کو وہ لیلا بھارگوا کے ہمراہ بازار سے گھر جاتے ہوئے چندن نواس کے سامنے سے گزری۔ اس کے قدم آپ سے آپ رک گئے۔ باغ پر ہولناک سناٹا طاری تھا۔ محل سنسنان پڑا تھا۔ تیسری کے ایک کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ شاید پنڈتائن اپنی یاترا سے لوٹ آئی ہوں گی۔ باقی ساری عمارت اندھیر اور خاموشی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ جب وہ وہاں سے آگے بڑھی تو سے لگا جیسے بہت سی آوازیں اس کا پیچھا کر رہی ہیں۔ لڑکیوں کے قہقہے، گھنگرووں کی جھنکار' تان پورے کی گونج اور سب سے بڑی سناٹے کی آواز۔

اسے وقت کے بھوت نے ستانا شروع کر دیا تھا۔

لیلا کو اس کے گھر پر اتارنے کے بعد وہ حسب معمول اپنے مکان کی سمت بڑھی۔ مہری نے تانگے سے اتر کو چھوٹا سا پھاٹک کھولا' وہ اندر داخل ہوئی اور آنگن

میں جا بیٹھی ۔ باہر گلی بی سنسان پڑی تھی ۔ برابر کے تین چار مکانوں میں کئی ریڈیو اکٹھے بج رہے تھے ۔لکھنو سے خبریں سنائی جارہی تھیں ۔ چمپا کے والد بیٹھک میں کسی موکل کے ساتھ مصروف گفتگو تھے ۔

''ڈاک میں تمہارا یہ لفافہ آوارہا۔'' اس کی ماں نے ایک نیلے رنگ کا چپٹا سا لفافہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا اور باورچی خانے کی سمت چلی گئیں ۔

شام کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں اس نے خط کھولا' پھر برآمدے کی بتی جلا کر اسے پڑھنا شروع کیا۔ اجنبی زنانہ لکھائی تھی اور کسی اجنبی کا خط تھا۔ مسوری سے آیا تھا اور انگریزی میں تھا اور مائی ڈیر چپا کہہ کر اسے بڑی بے تکلفی اور اپنائیت سے مخاطب کیا گیا تھا۔ اس میں لکھا تھا مجھے یہ معلوم کر کے بےحد خوشی ہوئی کہ تم اس سال ہمارے کالج آرہی ہو۔ اس کے بعد اس کالج کے متعلق مختلف تفصیلات سے اسے مطلع کیا گیا تھا' اگر وہ فلاں فلاں چیزوں میں دلچسپی رکھتی ہے تو اسے فلاں فلاں کلب خوش آمدید کہیں گے' اگر وہ آؤٹ ڈور لڑکی ہے تو اسپورٹس کی ڈائریکٹر جے مالا اپا سوامی سے اسے ملنا چاہیے۔ ٹینس کی سیکرٹری لیلا شری ناگیش بھی اس کی مدد کر کے بےحد خوش ہوگی' اگر وہ مغربی موسیقی کی شوقین ہے تو میوزک ورکشاپ اس کی منتظر ہے ۔ ڈراما گلڈ اس کی اداکارنہ صلاحیتوں سےبہرہ ورہونے کی ۹ خواہش مند ہے (اگر اسے اسٹیج سے دلچسپی ہے)' وغیرہ وغیرہ۔ پھر اسے سارے ہوسٹلوں کے متعلق انفارمیشن دی گئی تھی اور فیکلٹی کے متعلق ۔ اخیر میں لکھا تھا کی نئی لڑکی کی حیثیت سے مکتوب الیہ کو اس کے چارج میں دیا گیا ہے اور مکتوب الیہ کی وہ آفیشیل ایڈوائزر ہے۔ لہٰذا سولہ تاریخ کو جب وہ کالج پہنچے تو اسے راقم

الحروف فلورنس نکلسن ہال کی سیڑھیوں پر ملے گی اور اس کے سارے پرابلمز کا حل تلاش کرے گی۔

نیچے راقم الحروف کا نام لکھا تھا تہمینہ رضا، تاراہال، مسوری۔

چمپا ہکا بکا کھڑی سوچتی رہی کہ یہ تہمینہ رضا کون ہے اور اسے میرا پتا کس طرح معلوم ہوا اور اس قدر دوستی کا خط اس نے کیوں لکھا ہے۔ یہ خط اسے بڑا افسانوی معلوم ہوا، یعنی اس طرح کی باتیں محض ناولوں میں ہوتی تھیں۔ اسے لگا وہ اب بڑی انوکھی فضاؤں اور بڑی عجیب و غریب دنیا کی طرح سفر کرنے والی ہے۔

اس کا یہ خیال غلط نہ تھا۔

۴۱

بنارس سے لوٹ کر ساری لڑکیاں اپنے گھروں کو چلی گئیں اور ایک ہفتے بعد سب آخری بار ملنے کے لئے اسکول میں جمع ہوئیں۔ بڑا کلاس روم کھلوایا گیا۔ لارڈ مہری سب کی خاطریں کرتی آگے پیچھے دوڑتی رہی۔ لڑکیاں ڈیسکوں پر چڑھ کر بیٹھ گئیں اور دفعتاً سب خاموش ہوگئیں، جیسے بولنا جانتی ہی نہ ہوں۔ ان میں سے بڑی لڑکیاں سوچ رہی تھیں، اب جانے ہمارا کیا حشر ہوگا۔ ان میں سے اکثر کی شادی ہونے والی تھی۔ چند کو ابھی کالج میں پڑھنا تھا۔ دفعتاً حمید بانو نے، جو بے حد ڈریمٹیک واقع ہوئی تھی، مس پردھان کی نئی فلم کا گانا شروع کر دیا: ہنس لے جی بھر بھر کر ہنس لے۔ جانے کون کہاں پھر جائے۔ اس کے بعد دوسرا تازہ فلمی گانا

گایا گیا: رک نہ سکو تو جاؤ تم جاؤ ________ اور اس کے بعد تیسرا ______ اور جینے والے ہنستے ہنستے جینا۔ سورج کبھی نہ ڈوبے تیرا ______ وغیرہ۔ یہ سب گانے کی وجہ سے خوب رقت طاری ہوئی اور سب کی سب خوب چھکو پھکو روئیں۔

واقعی لڑکیوں کی کس قدر بیوقوف قوم ہے۔

مگر کتنی عجیب بات تھی کہ ان میں سے دو تین لڑکیوں کے علاوہ ساری لڑکیوں کو طاعت نے عمر بھر نہ دیکھا' وہ سب جانے کہاں غائب ہو گئیں۔ جو اتنی اچھی ہجولیاں تھیں۔

یہ ہمیشہ ہوتا ہے۔ جب ہم سب اکٹھے ہوتے ہیں تو کبھی خیال بھی نہیں آتا کہ الگ الگ ہو جائیں گے' اور جب بچھڑ جاتے ہیں تو لگتا ہے جیسے کبھی ملے ہی نہ تھے۔

## ۴۲

ہندوستان کا بہترین گرلز کالج ______!

ازابلا تھوبرن ________!!

''چاند باغ۔''!!!

لکھنو کی فیض آباد روڈ پر ایک بہت بڑا پھاٹک ہے اور بہت دور ہی سے ایک بے حد طویل و عریض دو منزلہ عمارت نظر آ جاتی ہے جس کے یونانی طرز کے بلند و بالا پورٹیکو کے ستون دور سے دکھلائی پڑتے ہیں۔ اس پورٹیکو کا فرش مرمریں ہے۔

سامنے لان پر پام کے درخت لگے ہیں۔ اس عمارت میں چمکتے ہوئے شفاف شیشوں والے طویل اور بڑے بڑے دریچے ہیں اور جھلملاتے ہوئے فرش اور چوڑے مرمریں زینے۔ اونچی چھتوں میں جھاڑ فانوس آویزاں ہیں۔ اس کا "براوزنگ روم" جہاں لڑکیاں بیٹھ کر فرصت کے وقت میں علم چرتی چگتی ہیں' اپنی آرائش کی وجہ سے کسی برطانوی لارڈ کا ڈرائنگ روم معلوم ہوتا ہے۔ اس میں بیش قیمت نوادر سجے ہیں اور نایاب کتابیں رکھی ہیں اور مشہور پینٹنگز سے اس کی دیواریں مزین ہیں۔ ساری عمارت میں جگہ جگہ ایرانی قالین بچھے ہیں۔ یہ عمارت ایڈمنسٹریشن بلڈنگ کہلاتی ہے۔ اس کے عقب میں' وسیع کیمپس پر' دور دور فاصلے پر اتنی ہی بڑی چار عمارتیں اور بکھری ہوئی ہیں۔ یہ سب عمارتیں ایک دوسرے سے شفاف فرش والے کوریڈورز سے ملحق ہیں جن کے اوپر پھولوں کی خوبصورت بیلیں پھیلی ہیں۔ یہ کوریڈور کئی فرلانگ لمبے ہیں۔ ان عمارتوں میں سے تین میں ہوسٹل ہیں جو نشاط محل' نونہال منزل اور میلتری بھون کہلاتے ہیں۔ یہ بھی اس قدر شاندار ہیں گویا کسی بڑی ہندوستانی ریاست کے گیسٹ ہاؤس ہوں۔ چوتھی عمارت فیکلٹی کی ہے جنہوں نے اپنے کمرے اور سیٹنگ روم دلہن کی طرح سجا رکھیت ہیں۔ کیمپس کے وسط میں ڈائننگ ہال کی عمارات ہیں اور ایک سرے پر ہسپتال ہے جس کی انچارج ایک نیگرو نرس ہے۔ پہلو میں کالج کا مشہور عبادت خانہ ہے جو موڈرن طرز میں تعمیر کیا گیا ہے۔ جس طرح کے عبادت خانے سویڈن اور کیلے فورنیا میں بنائے گئے ہیں۔ یہ بے انتہا اسٹریم لائنڈ جگہ ہے اور اس میں بیٹھ کر خدا سے لو لگاتے وقت خواہ مخواہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ یسوع مسیح بھی کسی امریکن یونیورسٹی

کے پریذیڈنٹ یا نیو انگلینڈ کے رحمدل اور خلیق پروفیسر ہیں۔اس کالج کی عمارات کا طرزِ تعمیر اسی قسم کا ہے جیسا امریکن یونیورسٹیوں کا ہوتا ہے۔بیروت کی امریکن یونیورسٹی کے بعد یہ مشرق میں امریکنوں کی بنائی ہوئی سب سے عظیم الشان درس گاہ ہے۔

چاند باغ______!!

پورنماشی کی راتوں میں جب چاندنی کیمپس پر برستی ہے تو لگتا ہے یہ سارا سماں بے حد غیر حقیقی ہے۔ ہرے سبزہ زار۔ پھولوں کے کنج سفید کے جھنڈ۔ عمارتوں کے روشن دریچے۔ اس وقت کیمپ کے مختلف گوشوں سے موسیقی کے سر بلند ہوتے ہیں۔بیتھووِن۔شوپاں۔ویبر۔جارج گریشوں۔یا کسی کوریڈور میں سے کوئی لڑکی سائے کی طرح گزر جاتی ہے۔نیگروزنس ہسپتال کے شیشوں والے برآمدے کی کھڑکی کھول کر آسمان کو دیکھتی ہے جس پر بیت لحم کا اکیلا ستارہ کہرے میں چھپا جھلملا رہا ہے۔چیپل میں سے برقی آرگن کی گہری گونجتی ہوئی آواز اوپر اٹھتی ہے۔اندر قربان گاہ یک اوپر منقش لیمپ جلتا رہتا ہے۔سناٹے کے سارے پرتو قوسِ قزح کے رنگوں کی طرح سارے میں پھیل جاتے ہیں۔سوا سو سال ادھر یہاں رمنا تھا۔یہاں کے باغات میں ہرن کلیلیں بھرتے پھرتے تھے اور بارہ سنگھے اور نیل گائیں اور اودھ پوری کے حکمرانوں کے بجرے ندی کے اس کنارے پر آن کر لگتے تھے اور شہر کی اونچی سوسائٹی یہاں آن کر مینڈھوں اور ہاتھیوں کی لڑائی کا نظارہ کرتی تھی، وہ پرانا برگد کا درخت، جو کیمپس کے اس کونے میں کھڑا ہے، اس کی پتیاں اس سے بھی پچھلے پہر کی ہوا میں اسی طرح سرسراتی ہوں گی۔

اسی سال سے یہ درس گاہ قائم ہے۔۱۸۶۲ء میں جو خوش بارش نوجوان لڑکیاں لمبی آستینوں کے بلاوز پہنے اور گاؤن کی وضع سے ساریاں باندھے یہاں سے فارغ التحصیل ہو کر نکلی تھیں ان کی قبروں پر نئے قبرستان بن چکے۔ جو لڑکیاں کل یہاں آنکھوں میں خواب لے کر گاتی گنگناتی آئی تھیں آج وہ نانیاں دادیاں ہیں یا دنیا کے بہت سے دکھ انہوں نے اٹھائے ہیں یا بڑی معمولی' عام زندگیاں گزار رہی ہیں۔

اس لئے بے چاری لڑکیو' تم جو ہال میں گھس یوجین او نیل کی ریہرسل کر رہی ہو خوش ہو لو کیونکہ کل تم بھی مر چکی ہو گی۔ چونکہ زندگی کی جس جنگ میں حصہ لینے کے لیے تم یہاں سے نکلو گی اس کے محاذ پر کام آنے والوں کے لئے کوئی پیتل کی تختیاں دیواروں پر نہیں لگائی جاتیں۔

اس چیپل کی سفید سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر سوچوں کون کہتا ہے کہ سامی مذاہب کا نظریہ کائنات غلط ہے۔ صراط مستقیم صرف ایک ہے۔ سیدھی اور تنگ۔ ایک پیدائش سے ایک موت کی طرح جانے والی' جس کے بعد کوئی واپسی نہیں۔ اس لیے بے چاری لڑکیو' تم جو پھولوں کے کنج میں گربا ناچ رہی ہو' چاہے تم کسی خدا کی عبادت کرتی رہو (اور چونکہ تم عورت ہو لہٰذا ملحد مشکل ہی سے بنو گی) یاد رکھو کے جب تم چاندنی کی اس دنیا سے باہر چلی جاؤ گی تو پھر کبھی لوٹ کر نہ آؤ گی۔ دوسرے تمہارے جگہ لے لیں گے۔ ان سب جگہوں پر وہی سب ہو گا جو تمہارے وقت میں ہوتا تھا لیکن دنیا بدل چکی ہو گی۔ دنیا لحظہ بہ لحظہ بدلتی رہتی ہے۔

تم بدل جاؤ گی۔

کیا تم کو معلوم ہے کہ وہ تمہاری سوشیولوجی کی چہتی پروفیسر' بگلے کے ایسے سفید بالوں والی کمر خمیدہ بڑھیا' جو کھٹ کھٹ کرتی مسکراتی گیلری میں سے گزر رہی ہے' ۱۹۰۲ء میں تم سے زیادہ حسین تھی اور فلاڈلفیا کا گلاب کہلاتی تھی؟

یہ سارے جشن' یہ ساری تقریبات' رسوم' تہوار' کارنیول' مورس ڈانسنگ کے مقابلے' اسپورٹس کے ہنگامے' یہ سب تم سے پہلے ہو چکا ہے اور تمہارے بعد بھی ہوتا رہے گا۔

یہ کیمپس اس کارگہ شیشہ گری' جسے دنیا کہتے ہیں' ایک بے حد چھوٹا سا ماڈل ہے۔

نشاط محل کے پیچھے ڈچ وضع کے باغ کے برابر سے ایک سایہ دار راستہ سوئمنگ پول کی طرف جاتا ہے جو آم کے جھنڈ میں گھرا ہوا ہے۔ یہ جولائی کا مہینہ ہے اور بھانت بھانت کی لڑکیاں سارے میں پھیلی ہوئی ہیں: مرہٹی ' گجراتی' بنگالی' مدارسی' اڑیہ' نیپالی' پنجابی' پٹھان' یورپین' امریکن' برمی' سنگھالی' ملک کا کوئی خطہ نہیں جہاں کی زبان یہاں نہ سنی جاتی ہو۔ مذہباً یہ لڑکیاں ہندو ہیں اور مسلمان ہیں اور سکھ ہیں اور عیسائی ہیں اور بودھ اور یہودی۔ دنیا کا کوئی عقیدہ نہیں جس کا پیرو یہاں موجود نہ ہو۔

اس کالج کی طالبات اپنی سادگی کے لئے مشہور ہیں۔ عام طور پر یہ لوگ سفید ساریاں پہنتی ہیں اور جس طرح کے فیشن یہ کرتی ہیں سارے صوبے میں ان کی نقل کی جاتی ہے۔

اس ارسٹو کریٹک کالج میں سیاسیات کا تذکرہ بالکل نہیں ہوتا۔ محض دنیا میں

گریس فل اور متوازن طریقے سے زندگی بسر کرنے کے فن پر توجہ دی جاتی ہے۔
''ہم دینے کے لیے لیے ہیں۔'' یہاں کا موٹو ہے۔
پہلے یہاں مغربیت کا بہت زور تھا لیکن قوم پرستی کی تحریک کے زیر اثر وہ زور اب کم ہوتا جا رہا ہے۔ اب یہاں ٹیگور جینتی منائی جاتی ہے اور عید اور دیوالی کا مشترکہ تہوار بہت دھوم سے منعقد ہوتا ہے جب مسلمان لڑکیاں سارے میں چراغاں کرتی ہیں اور ہندو لڑکیاں غرارے پہن کر اتراتی پھرتی ہیں۔
اس کالج کی بہت قدیم روایات ہیں اور رسوم اور ان کے اپنے گانے ہیں۔ ان کی ایک ایسی پر اسرار دنیا ہے جس میں کوئی باہر والا داخل نہیں ہوسکتا۔

## ۴۳

حسب وعدہ سولہ تاریخ کو تہمینہ رضا، چمپا احمد فلورنس نکلس ہال کی سیڑھیوں پر ملی۔ چمپا ذرا پریشانی سے چاروں اور دیکھ رہی تھی کہ اس کی ہم عمر ایک لڑکی نے آگے بڑھ کر پوچھا: ''تم چمپا احمد ہو______؟''
''ہاں''
''آؤ، میرے ساتھ چلو۔''
اور دوسرے لمحے چمپا چاند باغ کی دنیا میں شامل ہوگئی۔ اس رات ہال میں نئی لڑکیوں کو کالج کی روایات کے متعلق ایک لیکچر دیا گیا۔ انہیں یہاں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے روشناس کرایا گیا۔ شروع کے چند ہفتے چمپا کو بریک ان

ہونے میں لگے۔ جبھی اس کو اس قاعدے کا علم ہوا کہ ہر سال کالج کے دفتر کی طرف سے نئی لڑکیوں کے پتے سینئر طالبات کو بھیج دیے جاتے ہیں اور موخر الذکران کی ایڈوائزر مقرر کی جاتی ہیں۔ کالج میں داخل ہونے والی ساری لڑکیوں کو چندن خاص سینئر طالبات کی طرف سے اس طرح کے خط ملے ہوں گے جیسا چمپا کو ملا تھا۔

تہمینہ کی بہن طلعت آرا، جو فرسٹ ایر میں داخل ہوئی تھی، بڑی بے تکلفی سے اس سے کہنے لگی: "ارے چمپا باجی، ہم نے تو آپ کو بنارس میں بھی دیکھا تھا۔"

اور نرملا سر یواستوا نے سوچا کہ اب کمن بھیا اور بجین صاحب کی تو پانچوں گھی میں اور سر کڑاہی میں۔ ان کی دیبی تو یہیں آن پہنچی۔

چمپا دوسری لڑکیوں کے ساتھ گلفشاں، بھی گئی۔

یہاں سب اس سے بڑی اپنائیت سے ملے۔ تہمینہ کے بھائی کمال رضا نے، جو یونیورسٹی میں پڑھتا تھا، بے حد اخلاق اور مودبانہ طریقے سے اس سے گفتگو کی اور طلعت کی تقلید میں اسے چمپا باجی کہہ کر مخاطب کیا۔ سنگھاڑے والی کوٹھی نے بھی اسے خوش آمدید کہا۔ شنکر سر یواستوا اس کے لیے خود چاء کی کشتی اٹھا کر لایا۔

ایک کو تیسرے پہر وہ گلفشاں پہنچی۔ تہمینہ اور طلعت پچھلے برآمدے کے سائڈ روم میں کھڑکی کے پاس تخت پر چڑھی بیٹھی تھیں۔ پیاز ارمرچوں کا ٹوکرا نیچے رکھا تھا۔ نرملا آلو چھیل رہی تھی۔ غالباً شام کو ان کے ہاں کوئی دعوت تھی۔

چمپا بھی تخت کے کنارے بیٹھ کر آلو چھیلنے میں مصروف ہو گئی۔

اسی وقت بھیا صاحب اندر آئے، وہ بھی روایتی ہیروؤں والی شان سے۔ ٹینس

ریکٹ ہاتھ میں لیے بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔ بھیا صاحب عموماً گھر میں نہیں آتے تھے، خصوصاً جب تہمینہ کی سہیلیاں موجود ہوں کیونکہ تہمینہ کے کراؤڈ سے ان کی کوئی خاص نہیں بنتی تھی۔ تہمینہ کے اصل کامریڈ تو کمال اور ہری شنکر تھے۔

مگر بھیا صاحب بہر حال بھیا صاحب تھے۔

چمپا بیٹھی آلو چھلت رہی۔ اس نے اپنی انگلیاں نہیں کاٹیں۔

بھیا صاحب شام کے ڈنر کے متعلق تہمینہ سے کچھ پوچھنے آئے تھے۔ اس سے بات کرکے وہ الٹے پاؤں واپس چلے گئے۔

مگر اپنے کمرے میں جا کر انہوں نے گنگا دین کو بلایا۔ ''یہ نئی بٹیا کون ہیں جو اندر بیٹھی ہیں۔''

''پتا نہیں سرکار۔'' گنگا دین ہڑ بڑا گیا۔ بھیا صاحب نے آج تک لڑکیوں کے متعلق کوئی استفسار اس سے نہیں کیا تھا۔ آخری بڑی بٹیا سے ان کا بیاہ ہونے والا تھا۔ ''بڑی بٹیا کے پاس چاند باگ کی سبہئے بابا لوگ آوت ہیں۔''

''اچھا جاؤ۔''

کمال آیا۔ اس سے کیا پوچھتے۔ طاعت کی طبیعت کی تیزی سے وہ ذرا خائف رہتے تھے، اگر اس سے اشارتاً بھی معلوم کرنا چاہا تو وہ سارے میں ڈھنڈورہ پیٹتی پھرے گی۔ کیا مصیبت تھی کہ چونکہ وہ تہمینہ سے آفیشیل طور پر منسوب تھے لہٰذا دنیا جہان کی کسی اور لڑکی کو نظر بھر کر دیکھنا ان پر حرام تھا۔ یہ کیسی قید تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ وہ بے حد تنہا تھے۔

بھیا صاحب اپنی ذات کے رومانس میں آپ محصور ہو کر رہ گئے تھے۔

چمپا کو سجاتا نے بتایا: ''یہ مہاشے تہمینہ کے فیانسے ہیں مگر تہمینہ ان کو مستقل نو لفٹ کیسے رکھتی ہے۔''

اوہ۔ کس قدر ٹپکل صورت حال تھی۔ دو کزن جو ایک دوسرے سے منسوب تھے۔ گلفشاں کی قسم کے ناموں والی کوٹھیوں کے باسیوں کے متعلق جتنے افسانے اس نے پڑھے تھے ان میں یہی ہوتا تھا۔

مگر یہ افسانے قریب سے دیکھو تو ان میں کچھ بھی نہیں رکھا تھا۔ جو دوسروں کی زندگی کو افسانہ سمجھتا ہے وہ دراصل خود بھی تو ایک کہانی ہے جسے دوسرے پڑھ رہے ہیں۔ یہ بات چمپا کو اس وقت معلوم نہ تھی۔

۴۴

برسات نکلی۔ کاتک پورنمائش آئی' پھر ماگھ پوس کی ہوائیں چلیں' کمروں میں آتش دان جلے' باغوں پر کہرہ چھایا' رات کے پھولوں پر شبنم کے قطرے جمے' چاند باغ میں کرسمس کے تہوار کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ امیروں نے اس سال کے فیشن کے اوورکوٹ سلوائے۔ غریب غربا پالے میں ٹھٹھر کر جاں بحق تسلیم ہوئے۔ بڑے لوگوں نے شکار کے لیے کاپسی اور ترائی کا رخ کیا۔ کلکتے کی رونق دوبالا ہوئی۔ جاڑے نکلے۔ بسنت آئی۔ سرسوں پھولی۔ کونپلیں پھوٹیں۔ بہار کی خوشبوؤں کسے فضائیں مہکیں۔ انڈر گریجویٹ شعراء نے انگریزی میں جدید طرز کی نظمیں لکھیں۔ گرمیاں آئیں۔ تہ خانے آباد ہوئے۔ خس کی ٹٹیاں لگیں۔

اضلاع کے کمپنی باغ چنبیلی کے پھولوں سے مہکے۔ لچیوں کی کھانچیاں اتریں۔ لو چلی۔ گومتی کی ریت میں خربوزے پکے۔ ساون آیا۔ امریوں میں جھولے پڑے۔ اے لیجئے ایک سال نکل گیا۔ عمر عزیز کا ایک سال ختم ہوا۔ اب دیوالی آ رہی ہے۔ کھانڈ کے کھلونوں کی ٹوکریں برآمدے میں لاکر رکھی گئی ہیں۔ نرملا اپنے گھر کے آنگن میں رنگوں سے نقش و نگار بنانے میں جٹی ہے۔

طلعت پچھلے برآمدے کی سب سے نچلی سیڑھی پر لوٹ لگاتی رہی۔ یہاں سے باغ کا منظر بہت خوبصورت معلوم ہو رہا تھا۔ آسمان کی تیز نیلاہٹ سے آنکھیں چندھیا گئیں۔ نیلاہٹ، جو دور نیچے جا کر درختوں کی ہریالی میں کھو گئی تھی اور شفاف سناٹا سارے میں پھیلا تھا۔ برابر کی کوٹھی میں مسز ٹیگور کے یہاں طبلہ بج رہا تھا۔ اندر شاید بھیا صاحب وائلن بجا رہے تھے۔ اس نے زمین پر کان رکھ دیا۔ یا جوج ماجوج کی طرح میں زمین پر کان بچھائے لیٹی ہوں۔ ٹھنڈک۔ سکون (جو سارا ناتھ کے مندر میں بھی ملا تھا) یا جوج ماجوج تھے۔ یا کون تھے؟ بہر حال۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے کھٹ میٹھی تپتیا گھاس توڑی اور آرام سے اسے چباتی رہی۔ گملے، جو سیندوری رنگ میں رنگے گئے تھے، ان میں صبح پانی پڑا تھا اور اس کی وجہ سے ان کا رنگ بہہ کر نیچے آ گیا تھا۔

ایک سال نکل گیا۔ بھیا صاحب یونیورسٹی چھوڑ چکے تھے اور اب مقابلوں کی تیاری کر رہے تھے۔ کمال اور ہری شنکر ایم۔ اے۔ فائنل میں آ گئے تھے۔ اپی نے بی۔ اے کر لیا تھا۔ طلعت اور نرملا خود اب سیکنڈ ایر میں تھیں۔ بھیا صاحب کچھ سڑی ہو گئے تھے کیا۔ یہ چمپا باجی سے عشق کر رہے تھے اور وہ بھی ان کو پسند کرتی

تھیں۔ چمپا باجی پر تو ساری دنیا ہی جان دے رہی تھی۔ کمال اور ہری شنکر کا ان کی تعریفیں کرتی تھیں۔ چمپا باجی پر تو ساری دنیا ہی جان دے رہی تھی۔ کمال اور ہری شنکر کا ان کی تعریفیں کرتے منہ نہ تھکتا، وہ لوگ طلعت سے کہتے: جب تم بڑی ہو جاؤ گی تو تم کو احساس ہو گا کہ چمپا کیسی عجیب و غریب ہستی ہیں۔ اچھا بھائی ہوں گی۔

اپی کی ان سے اب بھی ویسی ہی ملاقات تھی۔ اپی بڑی وضعدار آدمی تھیں۔ بہت خندہ پیشانی سے ملتیں۔ ان کا بہت بڑا دل تھا۔ زیادہ عجیب و غریب اور قابل قدر ہستی کون تھا۔ اپی یا چمپا، جی ____؟ مگر یہ ان لوگوں کو کون بتانے جائے۔ میں نے یہ حساب لگایا ہے' طلعت نے سوچا کہ زیادہ یہ بس ہے ساری بات یہ سوچ کر اسے بڑا دکھ ہوا۔ گویا حسن کی اتنی بھارت قیمت لوگوں نے لگا رکھی ہے۔ افسوس کے ساتھ اس نے اور کھٹ مٹھیا گھاس توڑی اور اسے چبانے میں مصروف رہی۔

کمال وہ دہرہ دون کی ایک سڑک پر منہ لٹکائے چلا گیا، وہ حسب معمول دیوالی کی چھٹیوں میں چکر پر نکلا ہوا تھا۔ اس کے پرانے لا مارٹینئر کالج کا ایک جواں سال انگریز پروفیسر، جو چند سال قبل اوکسفرڈ سے آیا تھا، سادھو ہو کر گھر سے نکل بھاگا تھا۔ اسے پکڑنے کے لیے کمال کو بھیجا گیا تھا، کیونکہ کمال اس کا پسندیدہ شاگرد رہ چکا تھا۔ اس نے ہری شنکر کے ساتھ ہردوار کی ساری گپھائیں چھان ماریں، چکراتا اور رشی کیش اور ہری کی پوڑی کے مندر، ہمالیہ کی پہاڑیوں کو خوب کھوجا۔ تب ایک روز جوگ مایا کے ایک مندر کے پاس پروفیسر صاحب اسے مل گئے اور انہوں نے ہاتھ جوڑ کر اس سے التجا کی کہ بھائی، اب کہ میں جنجال سے نکل

آیا ہوں، مجھے واپس مت لے جاؤ، مجھ پر رحم کرو میاں ۔ میں بہت مزے میں ہوں
اور کمال نے کہا: ''لکھنو میں افواہ ہے کہ یہ پبلسٹی حاصل کرنے کا ایک ریکٹ چلایا
ہے آپ نے ____''

''بھائی'' وہ ہاتھ جوڑے مصر رہے'' خدا کے لیے چلے جاؤ بھائی ۔'' اور اس
کے بعد برہمنوں کی طرح زور سے کھنکھارتے ہوئے، اپنا گیروا لباس سنبھالتے
'ایک چشمے کو پھلانگ کر جنگل غائب ہو گئے تھے ۔ اب کمال منہ لٹکائے موہنی روڈ پر
چل رہا تھا۔ ہری شنکر حسب معمول اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ سامنے رسپنا بہہ رہی
تھی۔

''یار! ہری شنکر۔'' کملا نے کہا۔

''ہاں یار۔''

''یار یہ پروفیسر ________ ہملٹن ٹھیک تو کہتا تھا۔ ہم لوگ کس جنجال
میں گرفتار ہیں، خدا کی قسم، اس روز انہوں نے تیاگ کے مسئلے پر کافی غور وخوض کیا
اور سخت فلسفیانہ موڈ ان پر طاری رہا۔

''آؤ کوٹھیوں کے نام پڑھیں ۔ ناموں کے انتخاب سے مکینوں کی سائیکولوجی
آشکار ہوتی ہے'' چلتے چلتے رک کر ایک پھاٹک کے قریب جاتے ہوئے ہری شنکر
نے کہا۔

''ہم کبھی مکان بنا کر نہیں رہیں گے ۔ کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ۔'' کمال نے
کہا۔

''ٹھیک کہتے ہو۔ دیکھو بورژوا ای کس قدر افسوسناک طور پر sloppy ہے۔

ذرا یہ نام پڑھنا ____ "

"خوابستان' ____ لاحول ولاقوۃ"

"مگر تم خود بھی 'گلفشاں' اور 'خیابان' میں رہتے ہو۔"

"جانتا ہوں۔"

"یار کمال۔"

"ہاں یار۔"

"ذرا سوچو۔ لوگوں نے مکان بنا رکھے ہیں۔ یہاں سے وہاں تک۔ ایک سے ایک خوبصورت ساری دنیا میں مکان بنے ہوئے ہیں۔"

"ہاں یار۔ بڑی عجیب بات ہے۔"

وہ دونوں ایک پھاٹک کی پلیا پر بیٹھ گئے اور پھر اس مسئلے پر غور و خوض کرنے لگے۔ دراصل ان کو پروفیسر کے دنیا تج دینے نے بے حد مضطرب کر دیا تھا۔ ایک صحیح الدماغ انسان، سائنس دان اور لے کر چل دیا جنگل کو۔ حد ہے۔

"اس کا مطلب کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا۔"

اندھیرا پڑے تک وہ ڈالن والا کی خاموش معطر سڑکوں پر مکانوں کے نام پڑھتے پھرے۔ "بستر ن" "دولت خانہ" "شیم روک" "آشیانہ" "راج محل۔" کمال کے والد کا مکان خیابان بھی سامنے موجود تھا۔

ان مکانوں کے باغوں میں لگے ہوئے پہاڑی پھلوں کے درختوں کی مہک سارے میں اڑ رہی تھی اور دنیا بڑی حسین جگہ تھی۔

وہ دونوں منہ لٹکا کر پھر ایک پھاٹک کی پلیا پر بیٹھ گئے اور نہر کے پانی کو دیکھتے

رہے جو سڑک کے کنارے کنارے بہہ رہی تھی۔ پانی تھی۔ پانی میں ایک ٹوٹا پھوٹا جوتا دھارے کے زور سے اچھلتا کودتا بہتا چلا جا رہا تھا۔

چمپا احمد نے نشاط محل ہوسٹل کے سیج ڈرائنگ روم میں آ کر روشنی جلائی اور کتاب کھول کر اسٹینڈرڈ لیمپ کے نیچے بیٹھ گئی۔

تہمینہ رضا گلفشاں کی برساتی کی سیڑھیوں پر بیٹھی رہام اوتار کو ہندی پڑھاتی رہی۔

انگریز سادھو اطمینان سے ٹانگیں پھیلائے ہماوت کے جنگل میں ایک چٹان پر پڑا سو رہا تھا۔

## ۴۵

دو سال اور نکل گئے۔ اگست ۴۲ء کا اندولن بھی پرانی بات ہو چکی۔ پنڈت جی اور مولانا اور سارے نیتا قلعہ احمد نگر میں قید تھے۔ سارے میں برطانوی اور امریکن سپاہی گھومتے نظر آتے تھے۔ حضرت گنج میں اینگلو انڈین و یک آئی لڑکیوں کے پرے ٹہلتے۔ دنیا کا رنگ تیزی سے بدر رہا تھا۔ دیواروں پر سے 'کوئٹ انڈیا' کے الفاظ مٹتے جا رہے تھے۔ سوسائٹی میں ہر طرف فوجی نظر آتے۔

گلفشاں کے سید حامر رضا نے بھی امپیریل سروس کے مقابلوں میں ناکام ہونے کے بعد نیوی میں کمیشن لے لیا۔ تہمینہ ایم۔ اے۔ فائنل میں آ چکی تھی۔ چمپا ایم۔ اے۔ پریویس میں تھی اور کیلاش ہوسٹل میں رہتی تھی۔ طلعت اور نرملا بڑی دھوم

دھام کی انڈر گریجویٹ طالبات تھیں۔ چمپا بھی اب عرصے سے اس ہجوم میں موجود تھی جو شہر کا فیشن ایبل اسمارٹ انٹلکچول سٹ کہلاتا تھا۔ اس ہجوم میں غفران منزل کی رخشندہ اور کنور پی چو اور گنی کول اور کرن بہادر کا نجو

اور اکرم دملیشور اور فیض آباد روڈ کی میر انالنی راجونش اور ارون راجونش اور فواد اور راحل بلگرامی اور علی اور ایلمر ریکسٹن سبھی شامل تھے۔ پھر گلفشاں اور سنگھاڑے والی کوٹھی کے افراد۔ چاند باغ اور یونیورسٹی۔ اتنے بہت سے نام' اتنے بہت سے چہرے۔ ان سب لوگوں کی بہت بڑی جتھے بندی تھی۔ چوروں کا ذہنی باورچی خانہ۔ بلیک' سفید چہروں کا سمندر چاروں اور ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ ان سب کے درمیان ان سب سے گھری ہوئی وہ تنہا کھڑی تھی' کیونکہ آخری تجربے میں معلوم ہوتا ہے کہ انسان بالکل' قطعا تنہا ہے۔ اس کے باوجود ہم چاروں طرف انسانوں سے مختلف قسم کے ایکویشن قائم کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔

جب یہ ایکویشن غلط ہونے شروع ہوجاتے ہیں تو یہ بھی پتا چلتا ہے کہ ہم بے حد معمولی ہیں۔ یہی بات چمپا نے دفعتا سید عامر رضا سے' جو بھیا صاحب کہلاتے تھے' کہی۔

اس روز بھیا صاحب مدراس کے لئے روانہ ہونے والے تھے' وہ اس سے ملنے کیلاش آئے' وہ اس وقت لائبریری جارہی تھی۔ اپنی سائیکل ہاتھ میں لے کر وہ ان کے ساتھ ساتھ سڑک پر نکل آئی۔ بھیا صاحب نے اس سے کہا: ''میں یہاں سے بھاگنا چاہتا ہوں اور شکر ہے کہ مجھے فرار کا موقع مل گیا۔ میرا تبادلہ مدارس کا ہو گیا ہے ـــــــ تم ـــــــ تم مجھ سے شادی کر کے میرے ہمراہ چلنے کو تیار

ہو۔؟''

بھیا صاحب ایک تو یوں بے حد حسین وجمیل تھے'نیوی میں شمولیت نے اور سونے پر سہاگے کا کام کیا۔گویا چارلس بوائیر کو یونیفارم پہنا دیجئے۔

چمپا کا چہرہ کسی نامعلوم جذبے کے تحت سرخ ہوگیا۔یہ ایک بہت اہم بات تھی جو اس نے سنی۔ایک آدمی اسے اپنی زندگی میں شامل ہونے کے لیے مدعو کررہا تھا اور وہ اس آدمی کو بے حد پسند کرتی تھی۔

مگر اس نے کہا:''کمال ہے ـــــ آپ کو یہ کہتے ہوئے شرم تو نہ آئی ہوگی۔''

''پھر تم نے مجھے باغ کے راستے پر کیوں چلایا تھا۔''انہوں نے غصے سے کہا۔

''میں نے آپ کو کسی باغ واغ کے راستے پر نہیں چلایا۔''

''تم ایمانداری سے کہہ سکتی ہو کہ تم نے مجھ میں دلچسپی نہیں لی۔ یہ جانتے ہوئے کہ تمہاری دوست تہمینہ سے میری شادی ہونے والی ہے۔''

وہ خاموش ہوگئی۔یہ بالکل صحیح تھا۔تب اسے پہلی مرتبہ معلوم ہوا اس میں بڑی خامیاں ہیں۔اصول اور بلند خیالات اور فلسفے علیحدہ چیز ہیں اور ہم اصل زندگی میں اپنے خیالات سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔خالص فلسفے اور اخلاق کے اصولوں کا جذبات اور امپلسز سے کوئی ایکولیشن نہیں۔ہم درحقیقت بے حد کمزور ہیں۔

بھیا صاحب نے گویا اس کے خیالات پڑھ لیے۔''تم بھی بے حد معمولی نکلیں۔''انہوں نے کہا۔

''میں نے غیر معمولی ہونے کا کس روز دعویٰ کیا تھا۔'' اب وہ بادشاہ باغ کے پھاٹک تک پہنچ چکے تھے جس میں یونیورسٹی پوسٹ آفس تھا۔ ''ٹھہریے آپ میرے ساتھ ساتھ کیوں چلے آ رہے ہیں۔ مجھے اپنے کام سے جانا ہے۔ آپ گھر تشریف لے جایئے۔''

''میرا کوئی گھر نہیں ہے۔''

''گھر تو ہم میں کسی کا بھی کہیں نہیں ہے۔'' چمپا نے اکتا کر کہا۔ ''اب میں اس سے آپ سے فلسفہ نہیں چھانٹنا چاہتی۔ آپ کا مکان موجود ہے' جو گلفشاں کہلاتا ہے۔ لاحول ولا۔ کس قدر ریوگس بوگس نام ہے ــــــ اور وہاں تہمینہ موجود ہے۔ واپس جایئے۔''

''تم بے حد معمولی ہو اور عام عورتوں کی طرح مجھ سے لڑ رہی ہو۔ تمہارے سارے ردعمل بہت معمولی ہیں۔ تم بھی بالآخر ٹائپ پر لوٹ گئیں ــــــ تمہارے جیسی ہزاروں لڑکیاں دنیا میں موجود ہیں۔ تم نے پہلے مجھ سے فلرٹ کیا اور اب آگے ساتھ دینے کی ہمت نہیں۔ حد ہے۔ ــــــ''

''عام مردوں کی طرح آپ بھی مجھ سے جھگڑ رہے ہیں!'' اس نے مسکرا کر کہا۔ ''لہٰذا یہ نظریہ ثابت ہو گیا کہ ہم میں سے کوئی دیوی دیوتا کا درجہ نہیں رکھتا۔ خدا حافظ'' وہ سائیکل پر بیٹھ کر تیزی سے ٹگور لائبریری کی سمت روانہ ہو گئی۔

''گلفشاں پہنچ کر بھیا صاحب تندہی سے پیکنگ میں مصروف ہو گئے۔ اسی روز تہمینہ ایم اے کا آخری پرچہ کر کے یونیورسٹی سے لوٹی تھی۔ سارے دن گھر میں کھچڑیاں پکتی رہی تھیں۔ بڑی بٹیا نے تعلیم ختم کر لی۔ بھیا صاحب نیوی کے افسر

بن گئے' اب پوسٹنگ پر جا رہے ہیں' اب آخر بیاہ میں کیا دیر ہے ۔ لوگو یہ بڑا اندھیر ہے' خالہ بیگم نے کہا' کہ لڑکی اور لڑکا گھر میں موجود' ٹھیکرے کی مانگ' اور شادی کا کوئی نام نہیں لیتا ۔ اسی کو کل جگ کہت ہیں ۔''

رات کو بھیا صاحب خاموشی سے موٹر میں بیٹھ کر اسٹیشن چلے گئے ۔

ان کے جانے کے بعد گنگا دین بھی نظروں سے اتر گیا ۔ نوکر چاکر اسے غصے سے دیکھتے ۔ بے مروت تھے دنوں جنے ______ حسینی کی بی بی نے زردہ چھانکتے ہوئے سوسن سے کہا اور اپنی لڑکی کی چٹیاں گوندھنے لگیں ۔ (ارے کمبخت نچلی بیٹھ ۔ انہوں نے لڑکی کو ایک چانٹا رسید کیا ۔ لڑکی زور زور سے رونے لگی ۔)

سارے گھر پر بدمزاجی کا دورہ پڑ گیا ۔ نواب تقی رضا بہادر نے اپنی بی بی سے کہا ______ اور بناؤ صاحبزادے کو اپنا بیٹا اور کرو لاڈ ۔ زمانے کا خون سفید ہو گیا ہے ۔ دنیا یہی کہے گی کہ لڑکی ہی میں کوئی خامی رہی ہو گی جب بچپنے کے منگیتر نے چھوڑ دیا ۔

کمال اور ہری شنکر' تہمینہ کے سامنے جاتے ہوئے کتراتے ۔ گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہو چکی تھیں ۔ چمپا بنارس لوٹ گئی ۔ اب حسب معمول پہاڑ پر جانے کا پروگرام بنا ۔ سارے گھر والے نینی تال کے لیے روانہ ہو گئے ۔ ہری شنکر کو اپنے بردکھوے کے لیے مرزا پور جانا تھا ۔ اس کے آج دھڑا دھڑ پیغام آ رہے تھے ۔ کمال اپنی پھوپھی کی دعوت پر مسوری چلا گیا ۔

جولائی میں پھر سب لوگ پہاڑوں سے اترنا شروع ہوئے ۔ گلفشاں' کے دروازے کھلے ۔ پروائی میں باغ کے پودے سرسرائے کہ ایک روز اچانک بھیا

صاحب آن پہنچے۔ تین دن وہ گلفشاں میں ٹھہرے اور تینوں دن اپنے کمرے میں بیٹھے رہے۔ روانگی سے ایک روز قبل وہ اماں بیگم کے کمرے میں گئے۔

''مبارک ہو۔ آپ کی بیٹا ایم۔ اے پاس ہوگئیں۔'' انہوں نے تخت کے کنارے پر بیٹھتے ہوئے بڑی پرسکون آواز میں کہا۔

اماں بیگم خاموش رہیں۔

''میرا خیال ہے اب آپ کو ان کی شادی کر دینی چاہیے۔''

''کس سے؟'' اماں بیگم نے زرا تلخی سے پوچھا۔

''مجھ سے' اور کس سے؟'' انہوں نے بھی اسی تلخی سے جواب دیا۔

''تم کو میاں شرم تو نہ آتی ہوگی اب یہ کہتے۔ چچا کی بیٹی کو چھوڑ کر غیر لڑکی کے پھیر میں پڑ گئے۔ ہم جدھر جاتے ہیں انگلیاں اٹھتی ہیں۔''

''یہ آپ نے کس طرح طے کرلیا کہ میں اپنے فرض سے غافل ہوں۔ میں پال پوس کر اس گھر میں اسی لیے پروان چڑھایا گیا ہوں کہ تہمینہ بیگم کا شوہر کہلاؤں۔ اب میں اتنا احسان فراموش بھی نہیں کہ آپ کی بیٹا کو جل دے جاؤں گا۔'' اتنا کہہ کر وہ باہر چلے گئے۔

سوسن نے جا کر تہمینہ سے کہا: ''بیٹا ــــــــ ہم تو امام باندی کو بلانے جا رہے ہیں' گانے کے لیے۔ کچھ سنا نہیں آپ نے' آپ کا بیاہ ہو رہا ہے۔''

''سوسن ــــــــ تم جا کر سب لوگوں سے کہہ دو کہ چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے میں ہرگز ہرگز بھیا صاحب سے بیاہ نہ کروں گی۔''

اتنا کہہ کر تہمینہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ سوسن ہکا بکا رہ گئی۔

گھر میں ایمرجنسی کا اعلان کر دیا گیا۔ چاروں طرف فون اور ٹرنک کال ہوئے۔ کمال کو مسوری تار دیا گیا کہ وہ بہن کو آ کر سمجھائے۔ ہر شخص نے اپنے بھر تہمینہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ تم لڑکی ہو۔ ایم اے۔ پاس ہو تو کیا ہوا؟ اور بڑے گھر کی بٹیا ہو تو کیا ہوا؟ ہو تو لڑکی۔ شادی کر لو۔ اس کے بغیر گزر نہیں۔ رشتے ناطے کے معاملات میں ایسی اونچ نیچ ہوتی ہی رہتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

مگر تہمینہ نے ایک نہ کے بعد ہاں کر کے ہی نہ دی' گو خالص لڑکیوں والے انداز میں وہ رات رات بھر رویا کرتی۔

چمپا بھی واپس آ چکی تھی۔ یہ اس کا کیٹنگ کالج میں آخری سال تھا۔

کمال نے مسوری سے آ کر گھر کا یہ نقشہ دیکھا' پھر وہ چمپا سے ملنے کیلاش گیا' وہاں معلوم ہوا کہ چمپا ابھی اپنے ماموں کے یہاں ہیں' اگلے ہفتے ہوسٹل آئیں گی۔ چمپا کے یہاں پہنچا تو وہاں بھیا صاحب سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی۔ پتا نہیں وہ چمپا سے اب کیا کہنے گئے تھے' وہ اٹھ کر چلے گئے۔ اسی روز وہ مدارس کے لیے روانہ ہوئے۔

رفتہ رفتہ حالات پھر نارمل پر آ گئے۔ تہمینہ کے سامنے بڑا مسئلہ تھا کہ اپنے وقت کا کیا کرے؟ لڑکیوں کے لیے ملازمت کی کوئی راہیں نہیں تھیں سوائے ایک محکمہ تعلیم کے۔ تنگ آ کر اس نے پھر یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا اور قانون پڑھنے لگی۔ چمپا اسی طرح اس کے گروہ میں شامل رہی۔ ان دونوں لڑکیوں نے نہایت رکھ رکھاؤ اور سلیقے کے ساتھ ایک دوسرے سے اپنی دوستی نبھائی۔ کبھی بھولے سے بھی بھیا صاحب کا ذکر نہیں کیا۔ دونوں اپنی اپنی جگہ یہ سمجھتی رہیں کہ بہت سنجیدہ اور

باوقار خواتین ہیں۔ کوئی کل کی لونڈیاں ہیں کہ جذبات کے چھچھورے پن میں مبتلا ہوں!

اور یہ واقعہ بھی ہے کہ وقتی طور پر جو باتیں ہم کو قیامت معلوم ہوتی ہیں وقت گزر جانے کے بعد خیال آتا ہے ہم کس قدر بیوقوف تھے کہ یوں مضطرب ہوئے۔

## ۴۶

قحط کی ریلیف ورک کے سلسلے میں کمال کلکتے جانے والا تھا کہ اسے جیجا جی کا خط ملا۔ لاج کی شادی کو ایک سال ہو چکا تھا، وہ اپنے شوہر کے ساتھ نئی دلی میں تھی جہاں جیجا جی گورنمنٹ آف انڈیا کے کسی محکمے میں انڈر سیکرٹری تھے۔ اب نرملا کی شادی کی فکریں کی جا رہی تھیں۔ جیجا جی نے لکھا تھا: تم کلکتے جا رہے ہو۔ سر دیپ نرائن کا لڑکا گوتم بھی آج کل وہیں ہے۔ اس کے لیے ہمارا ارادہ ہے کہ نرمل کی بات بھیجی جائے، وہ بھی تمہارے بنگال ریلیف اور اپٹا وپٹا کے چکر ہی میں وہاں گیا ہوا ہے یا شاید وشوا بھارتیہ میں کچھ کر رہا ہے۔ بہر حال تم ذرا اس سے ملنا اور معلومات حاصل کرنا کہ کس قماش کا لڑکا ہے۔ کچھ سنجیدگی بھی ہے مزاج میں یا تم سب کی طرف خالی بوہیمین ہی ہے۔

کمال نے خط جیب میں رکھ لیا۔ کمال کے آدمی ہیں جیجا جی بھی۔ انسان دیس میں مکھیوں کی طرح مر رہے ہیں، ملک تباہی کی اور جا رہا ہے، یہ شادی بیاہ کے قصے

لے کر بیٹھے ہیں۔(وہ بڑا جوشیلا اسٹوڈنٹ ورکر تھا اور تہمینہ اور بھیا صاحب کے قصے کے بعد سے شادی کے مسئلے سے شدت سے بور ہو چکا تھا) میں کلکتے میں قحط زدہ انسانوں کی لاشیں اٹھاؤں گا یا نرمل صاحبہ کے لیے دولہا تلاش کرتا پھروں گا' اس نے جھنجھلا کر طاعت سے کہا' مگر بہر حال فرض کے طور پر اس نے ان صاجزادے کا پتا نوٹ کرلیا جو جیجا جی نے خط میں لکھا تھا اور سفر پر روانہ ہوگیا۔اس کے ساتھ یونیورسٹی کے اور بہت سے لڑکے لڑکیاں تھے۔راستہ بھر یہ لوگ ٹیگور اور نذرالاسلام کے ولولہ انگیز گانے گاتے گئے۔ٹرین کی کھڑکی میں سے وہ وطن کے لہلہاتے کھیت دیکھتا رہا اور سوچا کیا۔ یہ میرا **ملک** ہے ____ یہ میرا **ملک** ہے ____ وطنیت اور انقلابیت اور قومی جوش اور برطانوی حکومت کے خلاف غم و غصے کے جذبات نے اس کے دل میں ایک عجیب وغریب کیفیت پیدا کردی۔ اسی روز کے اخبار میں ایک بنگالی آرٹسٹ زین العابدین کے بنائے ہوئے قحط کے مناظر کے اسکیچ چھپے تھے۔رکھا نے اخبار اس کی طرف بڑھا دیا۔کمال نے نظریں اٹھا کر رکھا کو دیکھا' وہ رو رہی تھی۔

سب نے مل کر پھر گانا شروع کر دیا: یہ جنگ ہے جنگ آزادی ____ آزادی کے پرچم کے تلے ___ ہم ہند کے رہنے والوں کی ____ ریل کی چھک چھک گیت کی ہم آہنگ معلوم ہوئی۔دوسرے کونے میں چند لڑکے زور زور سے بحث کر رہے تھے۔

کمال نے آنکھیں بند کرلیں اور سونے کی کوشش کی۔اس کے رفقاء اسی طرح بحثیں کرتے رہے ____ ٹرین بہار کے سرسبز علاقوں سے گزرتی بنگال میں

داخل ہوگئی۔

گنگا کے کنارے ایک چھوٹے سے خوبصورت ضلعے کے اسٹیشن پرٹرین رکی۔ لڑکوں نے کھڑکی کے باہر دیکھنا شروع کیا۔ چاروں اور تالاب تھے' اور سبزہ زار' اور بانس کے جھنڈ۔ دور سورج گنگا کی لہروں میں غروب ہو رہا تھا۔ اسٹیشن پر دو پالکیاں کھڑی تھیں۔ پلیٹ فارم پر دیہاتیوں کا مجمع تھا جو چاول کی تلاش میں کلکتے جانے کے لیے ٹرین پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ پلیٹ فارم کی دوسری طرف مقابل میں فوجیوں کی ٹرین کھڑی تھی۔ سکھ اور پنجابی سپاہی' جو برما جا رہے تھے' اردو کے فلمی رسالے ہاتھ میں لیے ادھر ادھر ٹہلتے پھر رہے تھے۔

ایک ہندوستانی میجر صاحب اپنی بیگم صاحب اور دو بل ٹیریر کتوں کے ساتھ فرسٹ کلاس کے ڈبے کے سامنے کھڑے ایک انگریز کرنل سے مصروف گفتگو تھے۔

''جب تک یہ فوجی ٹرین نہ چلی جائے آپ کی گاڑ روانہ نہیں ہوگی۔'' ایک گارڈ نے کمال کو بتایا۔

''اس کا مطلب ہے۔''

''جی ہاں۔ کوئی چار پانچ گھنٹے لیٹ ہوگی آپ کی یہ ٹرین۔ یہ وار ٹائم ہے جناب۔''

لڑکے اور لڑکیاں پلیٹ فارم پر اتر آئے۔

اردھوگوگو نے بوجے مادول۔ انہوں نے نذر الاسلام کا ایک اور گیت شروع کردیا ___ میجر صاحب کی بیگم صاحبہ دلچسپی سے ان لوگوں کو دیکھنے لگیں۔

''یہ کون لوگ ہیں۔ کتنی پیاری آواز ہے سب کی ____''

''کمیونسٹ ہیں سالے ____'' میجر صاحب نے منہ پھیر کر جواب دیا۔ ''چلو۔ کرنل ہمیں ریسٹوران کار میں مدعو کر گیا ہے۔''

وہ دونوں ٹہلتے ہوئے ریستوراں کار کی سمت چلے گئے۔

کمال اور اس کے ساتھ اب گاتے گاتے بھی تھک گئے۔ ٹرین چلنے کا نام نہ لیتی تھی۔

یکا یک ریکھا چیخ کر ایک طرف دوڑی۔ اس کے ساتھی بھی اس کے پیچھے پیچھے لپکے۔ پلیٹ فارم کے سرے پر کسانوں کا ایک چھوٹا سا کنبہ سہما اور سکڑا ہوا بیٹھا تھا۔ ایک نوجوان، جس کی چھوٹ سی چھدری سیاہ داڑھی تھی' مرا ہوا پڑا تھا۔ اس کی بیوی ایک سانولی سلونی دبلی پتلی لڑکی دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ اس کے دونوں بچے' جن میں سے لڑکے کی عمر نو سال کی تھی' ساتھ ساتھ چلا رہے تھے۔

''کمال ____'' نریندر نے آواز دی ____ ''ادھر آؤ ____ ہمارا لاشیں اٹھانے کا کام تو میاں یہیں سے شروع ہو گیا۔''

سسکیوں کے درمیاں اس نے بنگالی میں بتایا کہ وہ اور اس کا میاں ابوالمونشور رزق ڈھونڈنے کلکتے جا رہے تھے۔ انہوں نے ایک ہفتے سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ آمنہ بی بی نے بھی ایک ہفتے سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ فوجیوں کے ٹرین میں سے پھینکے ہوئے دو بسکٹ اور توس کے چند ٹکڑے جو اس نے جمع کیے تھے وہ اپنے بچوں کو کھلا چکی تھی۔ اتنا کہہ کر وہ بھی پلیٹ فارم پر لیٹ گئی اور ان سب کے سامنے اس نے بھی دم توڑ دیا۔

اینگلو انڈین اسٹیشن ماسٹر ان کی طرف آیا: ''آپ لوگ ادھر کیا گڑ بڑ مچاتا ہے۔ آج کل روز سو پچاس آدمی پلیٹ فارم پر مرتا ہے۔ ہم کس کس کا فکر کرے۔ یہ ریلوے اسٹیشن ہے اسپتال نہیں۔ یہ بنگالی ہمیشہ کا بھوکا ہے۔ بھوکا بنگالی! آپ کیوں فکر کرتا ہے۔''

''یہاں قبرستان کدھر ہے؟'' نریندر نے غصے سے ہونٹ چباتے ہوئے پوچھا۔

''ہم کو معلوم نہیں ______ کیوں کیا آپ ان لوگ کا کبر کھودے گا۔ دیٹ از ویری فنی ______ !!!''

لڑکیوں نے دھاڑیں مارتے ہوئے بچوں کو ساتھ لیا اور بازاری کی طرف چل دیں ______ لڑکے قبرستان اور کسی مسلمان مولوی کی تلاش میں آبادی کی طرف روانہ ہوئے۔

کمال لاشوں کے پاس بیٹھ گیا۔ اتنے میں فوجیوں کی ٹرین مہیب آوازیں نکالتی، دھواں چھوڑتی روانہ ہوئی۔ فرسٹ کلاس کا ڈبہ پاس سے گزرا جس میں سکھ میجر اور اس کی دلہن بیٹھے تھے۔ ان دونوں کو لاشیں نظر نہیں آئیں کیونکہ انہوں نے کھڑکیوں کی جھلملیاں چڑھا دی تھیں۔ فوجی ٹرین کے جانے کے چند منٹ بعد اس ٹرین کو بھی جنبش ہوئی جس میں کمال اور اس کے ساتھی سفر کر رہے تھے۔ گارڈ کمال کے پاس آیا: ''ٹرین جاتا ہے۔ آپ لوگ ادھر کیا کرنے لگا۔ آپ کا فرینڈ لوگ کدھر گیا۔''

''ہم اب کل صبح ہی جا سکیں گے۔'' کمال نے جواب دیا اور تھرڈ کلاس کے

ڈبے میں جا کر سارا سامان نکال کر پلیٹ فارم پر رکھنے کے بعد لاشوں کے پاس آن بیٹھا۔ یہ ٹرین بھی چلی گئی اسٹیشن دفعتاً سنسان ہو گیا۔

پلیٹ فارم کے سر پر اندھیرا تھا۔ گارڈ بہت نیک دل انسان معلوم ہوتا تھا۔ اس نے ایک لالٹین لا کر کمال کے پاس رکھ دی اور پھر اپنے دفتر کی طرف چلا گیا۔

کمال لاشوں کے پاس بیٹھا رہا۔ ہوائیں بانسو کے جھنڈ میں سائیں سائیں کرتی رہیں۔ کمال نے اپنے ہولڈ ال میں سے ایک چادر نکال کر لاشوں پر اڑھا دی۔ آمنہ بی بی، جس نے سرخ ساری پہن رکھی تھی اور ابوالمنصور، جس کی نیلی چارخانہ دار تہمد میں بہت سے پیوند لگے تھے، دونوں اس چادر میں چھپ گئے۔

کمال اسٹیٹس مین اٹھا کر لالٹین کی روشنی میں زین العابدین کے اسکیچ دیکھنے لگا۔ اس دیس کے مصور نے کیا اسی جوڑے کی تصویر بنائی تھی؟ چند قدم پر گنگا بہہ رہی تھی۔ اس کی لہروں پر ایک اکیلا نوکا چل رہا تھا جس میں چراغ جلتا تھا اور کوئی بڑی دلدوز آواز میں بھٹیالی گاتا جا رہا تھا جس کے الفاظ کمال کی سمجھ میں اچھی طرح نہیں آئے۔ درختوں کے پرے لارڈ کارنوالس کے عہد کی بنی ہوئی اونچے پیپل پاہیوں اور جھلملیوں کے برآمدے والی ضلع کے کلکٹر کی عظیم الشان کوٹھی تھی۔ اس سے ذرا فاصلے پر ضلع کے سب سے بڑے ہندو زمیندار کا محل تھا جہاں ریڈیو بج رہا تھا۔ رات کے سناٹے میں ہواؤں پر تیرتی ہوئی بی بی سی کے لائٹ پروگرام کی آواز یہاں تک صاف سنائی دے رہی تھی۔ کمال کا دل ڈوبتا چلا گیا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ یہ رابندر ناتھ اور سروجنی دیوی اور سرت چندر کا دیس تھا ناول نگاروں اور شاعروں کا محبوب موضوع۔

ہم سب مختلف قسم کی کتابوں کا موضوع ہیں۔ تاریخ کے ابواب' الفاظ' اعداد و شمار' رپورٹیں کانگریس اور مسلم لیگ کے لیڈروں کی تقاریر۔ کمیونسٹ پارٹی کے مینی فیسٹو۔ پچھلے ہفتے ڈاکٹر اشرف کہہ رہے تھے کہ قوموں کی خود مختاری کا مطالبہ دین لینن کے نظریوں کے مطابق ہے۔ پاکستان_____ تو کیا جو مسلمان ہے وہ آٹو میٹک طور پر پاکستان ہو جائے گا _____ یا کیا ہوگا_____ لینن' اسٹالین ' گورکی' ڈاکٹر اشرف' سجاد ظہیر' جناح صاحب' مہاتما گاندھی' پنڈت جی_____۔

کمال کے دماغ میں واقعات اور ناموں اور شخصیتوں کا جلوس منڈلا یا کیا لیکن ساری دنیا کا مرکز اس وقت یہ دو لاشیں تھیں۔ سارے واقعات اور نظریوں کے سلسلے کی کڑی آ کر اس مرکز پر ٹوٹ جاتی تھی۔ آمنہ بی بی اور ابوالمونشور_____ دو لاشیں۔

دوسرے روز صبح وہ سب پھر اپنے سفر پر روانہ ہوئے۔ شام کو ٹرین ہوڑہ پہنچی۔ لڑکے اور لڑکیاں اپنے اپنے جائے قیام کی طرف روانہ ہوئے۔ پرمود کمار کا گھر ان سب کا مستقر تھا جہاں ان سب کو دوسرے روز جمع ہونا تھا۔ کمال چیت پور روڈ کی طرف چلا جہاں اس کے ایک ماموں ''مٹیا برج والے نواب'' رہتے تھے۔

## ۴۷

چیت پور روڈ کے ایک مکان کے پھاٹک کے سامنے ایک بند گاڑی آن کر رکی۔ اس مکان کا طرز تعمیر کمپنی کے عہد کا تھا جس طرح کے مکان جا بجا کلکتے میں

نظر آتے ہیں۔ بڑے بڑے پیل پائے۔ چوڑا بر آمدہ۔ بر آمدے اور دروازوں پر وینیشین جھلملیاں۔ اندر کمروں میں مرصع سنہری فریموں میں انگریزی مناظر لگے تھے۔ کشمیری کڑھت کے پردے دروازوں پر پڑے ہوئے تھے۔ پیتل کے گملوں میں چینی پام سجا تھا۔ باہر باغ کی چھوٹی چھوٹی کیاریوں میں بیلا مہک رہا تھا۔

اوپر کی منزل سے لڑکیوں نے آواز لگائی: ''ارے کمن بھیا آ گئے لکھنو سے۔'' سارے گھر میں شور مچ گیا۔ نوکرانیاں اور نوکر باہر دوڑے۔ نیچے بر آمدے میں فرن کے پتے جھوم رہے تھے۔ نواب صاحب بھانجے کے استقبال کے لیے آرام کرسی سے اٹھے۔

یہ مکان پچاس پچپن سال قبل دت خاندان سے مٹیا برج والے نواب کمال رضا بہادر کے چھوٹے بہنوئی نے خرید لیا تھا۔ اس مکان میں ایک زمانے میں بڑی دھوم دھام سے برہمو سماج کے جلسے ہوا کرتے تھے۔ اوپر کی منزل کے ایک کمرے میں اب تک دت خاندان کے افراد کی دھندلی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ گروپ فوٹو گراف جس میں مہارشی ہارمونیم پر بھجن گاتے تھے۔ مالک مکان بابو منورنجن دت کے انتقال کے بعد' جو کینِنگ کالج لکھنو میں پروفیسر تھے' ان کی اولاد نے یہ مکان فروخت کر کے بالی گنج میں ایک بہت بڑی کوٹھی بنوالی تھی۔ ان کی اولاد میں اب کئی آئی سی ایس افسر تھے۔ کئی کمیونسٹ لیڈر۔ ان کی لڑکیاں زیادہ تر یورپ میں تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ بابو منورنجن دت کی ایک پوتی کی شادی اڑیسہ ایک مہاراجہ سے ہوئی تھی۔ موجودہ مالک مکان اور دت خاندان کی کئی پشتوں کی دوستی تھی۔

موجودہ مالک مکان لکھنو کے اجڑے ہوئے نواب تھے۔ وثیقہ پاتے تھے اور

کلکتے میں رہتے تھے۔ان لوگوں کا مشغلہ زندہ رہنا تھا۔

نواب کمال رضا بہادر سلطان عالم واجد علی شاہ کے ہمراہ مٹیا برج آئے تھے۔ ان کے خاندان کے بہت سے افراد بھی ان کے ساتھ تھے۔نواب علی رضا بہادر ان کی سب سے چھوٹی بہن کے میاں اور چچا زاد بھائی تھے۔انیسویں صدی کے اواخر کا کلکتہ بے حد موڈرن شہر تھا جس میں ان گنت کالج تھے اور سیاسی اور تہذیبی تحریکیں اور پریس اور اخبار۔نئے بنگالی ناولوں میں ہندو تہذیب کی تجدید کا پرچار کیا جا رہا تھا۔راجہ سریندر موہن ٹیگور نے ہندوستانی موسیقی کی احیاء کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔سوامی وویکانند یہاں سے باہر جا کر یورپ اور امریکہ میں ویدانت فلسفے کا پرچار کر رہے تھے۔ملک میں ہر طرف سیاسی اور تہذیبی تحریکوں کا چرچا ہو رہا تھا۔کانگریس بدرالدین طیب جی اور دوسرے لیڈروں کی قیادت میں بڑے بڑے اجلاس کر رہی تھی مگر نواب علی رضا بہادر کو ان سب ہنگاموں سے کوئی سروکار نہ تھا۔علی گڑھ میں ایم۔اے۔او کالج کھل گیا تھا مگر نواب صاحب کو انگریزی تعلیم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ان کے سوشل تعلقات مرشد آباد اور ڈھاکے اور عظیم آباد کے نواب خاندانوں تک محدود رہے۔ان کی اولاد اور خاندان والوں کی شادیاں لکھنو اور اودھ کے تعلقہ دار گھرانوں میں ہوا کیں۔لکھنو میں یہ لوگ کلکتے والے نوب کہلاتے تھے۔کلکتے میں انہیں لکھنو والے کہاں جاتا تھا۔ان کی زندگی کے مرکز صرف تین تھے: کلکتہ، پٹنہ (عظیم آباد) اور لکھنو۔اس سے آگے کی دنیا کی انہیں خبر نہیں تھی۔ان کا سارا وقت لکھنؤ دلی اور عظیم آباد کی ادبی اور شاعرانہ نوک جھونک میں صرف ہوتا تھا۔وثیقے کی آمدنی کا درجہ سے بے فکری سے گزر ہوتی تھی۔سر پر

برطانیہ کا سایہ سلامت تھا راوی چین لکھتا تھا۔

تب ان کے خاندان میں پہلی مرتبہ ایک عجیب بات ہوئی۔ نواب علی رضا کے داماد، جو لکھنو میں رہتے تھے، سرسید کی نیچری فوج میں جا شامل ہوئے اور انہوں نے اپنے بڑے لڑکے کو علی گڑھ بھیج دیا۔

نواب علی رضا کے دوسرے داماد پٹنے کے رہنے والے تھے، وہ بھی بے حد روشن خیال نکلے۔ پٹنے میں قانون کا بہت چرچا تھا۔ ان گنت ہندو مسلمان قانون پڑھ پڑھ کر بیرسٹر بن رہے تھے اور بڑا نام اس پیشے میں انہوں نے پیدا کیا تھا۔ چنانچہ نواب علی رضا کے پٹنے والے نواسے کو بھی اتنا پڑھایا گیا کہ وہ بہت زیادہ پڑھ گئے اور بیرسٹری کے لیے ولایت چلے گئے۔ یہ اس خاندان کے پہلے فرد تھے جو انیسویں صدی کے آخر میں ولایت گئے۔

نواب علی رضا کے لکھنو والے داماد انگریزی تعلیم کے تو قائل ہوئے ہی تھے، اب وہ سیاست میں بھی دلچسپی لینے لگے۔ سرسید مسلمانوں کو علیحدہ پلیٹ فارم پر جمع کر کے انگریزوں کا وفادار رکھنا چاہتے تھے۔ اس مسئلے پر ان کا سرسید سے اختلاف ہو گیا، وہ کانگریس کے ہم خیال ہو گئے۔ اب ان کے یہاں لکھنو کے گولہ گنج والے مکان میں لالہ بھائیوں کا مجمع رہتا۔ یہ سب لوگ ابھی گورنمنٹ کے وفادار بھی تھے اور صرف سیاسی مراعات اور سوشل ریفارم چاہتے تھے۔ ان گنت مسلمان اس تحریک میں شامل تھے۔

ہندوستان میں مسلمان کی سیاسی حیثیت کا مسئلہ بہت ٹیڑھا بنتا جا رہا تھا۔ ہندو، جو سوا سو سال سے انگریزی تعلیم سے روشناس ہو چکا تھا، اپنے گنجلک مابعد

الطبیعیاتی ذہن اور خالص تجریدی فلسفے کے باوجود پریکٹیکل تھا۔ مسلمانوں کے عہد میں فارسی پڑھ کر حکومت کے نظم ونسق میں حصہ لیا۔ مسلمان حکمران اور صوبے دار صرف فرمانوں پر دستخط کر دیتے تھے۔ دہی ایڈمنسٹریشن ہندو چلاتا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی آئی، تب بھی ہندو نے فوراً حالات سے سمجھوتہ کرلیا اور مغلوں کا کائستھ منشی پل کی پل میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے کلرک میں تبدیل ہوگیا۔ پچھلے سو سال سے ہندو اپنی ذات پات کے بندھنوں اور اپنے پراچین فلسفے کے باوجود مغربی تعلیم اور سائنٹیفک نظریہ فکر کے قریب تر ہو چکے تھے۔ سب سے پہلے مغرب کے فلسفے کا اثر کا انہوں نے قبول کیا۔ جب قوم پرستی کی تحریک شروع ہوئی، اس کا تدارک کرنے کے لئے انگریزی حکومت نے فوراً ملک کے پس ماندہ طبقوں کو، جنہیں ۵۷ء کے بعد ہر طرح سے کچلایا گیا تھا، اب اپنی عنایات سے نوازنا شروع کیا۔ ہندوؤں کے یہاں ایک بورژوازی بھی پیدا ہوچکی تھی جو لیڈرشپ اور لبرل سیاست کے لیے تیار تھی۔ مسلمان ابھی فیوڈل اسٹیج سے آگے نہ نکلے تھے۔ ان کے ذہن میں اب تک شہنشاہیت کے تصور موجود تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب ان کی اپنی بادشاہت کا خاتمہ ہوا تو اس کا جذباتی نعم البدل انہوں نے سلطان ترکی سے محبت میں ڈھونڈا، وہ ان کا خلیفہ تھا جو قسطنطنیہ میں رہتا تھا، پھر حیدرآباد دکن کے نظام سے ان کو عقیدت تھی کیونکہ اس گئے گزرے زمانے میں ایک اتنی بڑی ریاست کا مسلمان فرمانروا تھا۔ ان کی لیڈرشپ کے لیے جب ہز ہائی نس آغا خاں اور دوسرے نوابین آئے تو مسلمان عوام کو بہت اچھا معلوم ہوا کیونکہ نام اور خطابات بہرکیف عہد رفتہ کی یاد دلاتے تھے۔

انگریز اور فیوڈل طبقے کا گٹھ جوڑ بہت کامیاب ثابت ہو رہا تھا۔

بنگال میں مسلمانوں کے عہد میں معافی کی زمینوں کی آمدنی سے مدرسے قائم تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ان زمینوں پر اپنا قبضہ کرلیا تھا۔ مدرسے بند ہو گئے اور مسلمان پس ماندہ رہ گئے۔ ان کے مقابلے میں ہندو انگریزی پڑھ رہے تھے۔ مسلمان جاگیردار ختم ہو چکا تھا۔ مسلمان صنعت کار تباہ کردیا گیا۔ اس کی جگہ دوامی بندوبست کے نئے ہندو زمینداروں اور ہندو مڈل کلاس نے لی تھی۔ طبقاتی الٹ پھیر کے اس پس منظر کے ساتھ بنگال میں سب سے پہلے نشاۃ ثانیہ کی تحریک شروع ہوئی تھی۔ نئی ہندو بورژوازی قیادت کے لیے تیار تھی۔ ملازمتیں حاصل کرنے کی دوڑ میں بھی ہندو مسلمانوں سے آگے نکل گئے تھے۔ مسلمانوں میں خوف کی سائیکولوجی پیدا ہونی شروع ہوگئی تھی۔ اس خوف کو اچھے موقعے پر انگریز نے ہوا دی۔

وفادار انگریزی خواں مسلمانوں کا مڈل کلاس بننا شروع ہوا۔ مسلمان جولاہا اور کسان، جو ملک کی دھرتی پر محنت کرکے زندہ رہتا تھا، اس کے متعلق کسی نے بھی نہ سوچا۔ سب کو یہی فکر تھی اپنے لیے زیادہ سے زیادہ اقتصادی تحفظ اور ملازمتیں حاصل کر لی جائیں۔

پھر جنگ چھڑی اور ڈاکٹر انصاری آئے اور علی برادران اور خلافت تحریک چلی اور گاندھی آئے اور کانگریس نے علی الاعلان سواراج کا مطالبہ کیا۔ اب حالات تیزی سے بدلنا شروع ہوئے کھادی کی تحریک اور قوم پرستی۔ ایک عجیب جوش سارے ملک پر طاری ہوگیا۔

نواب علی رضا بہادر کے داماد تقی رضا بہادر، جو تعلقے دار تھے، کھلے بندوں قومی تحریکوں میں حصہ نہ لے سکتے تھے۔ اودھ کے تعلقہ داروں نے ۱۸۵۷ء میں اودھ کو بچانے کے لیے جم کر انگریزوں کا مقابلہ کیا تھا مگر بعد میں یہی تعلقہ دار انگریزوں کے جاں نثار ثابت ہوئے کیونکہ ان کے اور انگریزوں کے گٹھ جوڑ کے ذریعے کسانوں پر ان کا تسلط قائم رہ سکتا تھا۔ یہ لکھنؤ میں نواب سر ہار کورٹ ٹیلر کا زمانہ تھا۔ اس نے تعلقہ داروں والی عادتیں اختیار کر رکھی تھیں۔ یہ لکھنؤ کے تعلقہ داروں کا سنہرا دور تھا۔ ایک طرف آزادی کی آندھی چل رہی تھی دوسری طرف قیصر باغ کی بارہ دری میں دھوم کے مشاعرے ہوتے تھے۔ جان عالم کے عہد کی تجدید ہوئی تھی۔ یہ مہاراجہ محمود آباد اور ٹھا کر نواب علی اور رائے راجیشور بالی کا لکھنؤ تھا۔

اسی زمانے میں ان کے علی گڑھ کے تعلیم یافتہ بیٹے نواب ابو المکارم تقی رضا بہادر کے یہاں بڑی اللہ آمین سے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام اپنی دادی اماں کے ماموں نواب کمال الدین علی رضا بہادر کے نام پر کمال رکھا گیا۔

کمال کو اپنے بچپن کا زمانہ بڑے واضح طور پر یاد تھا جب وہ گھر میں بڑوں سے سیاست کے تذکرے سنتا۔ نواب ابو المکارم کا خاندان اب اگلے وقتوں کا جیسا نہیں تھا۔ اب اس گھرانے کے افراد سرکاری ملازمتیں بھی کر رہے تھے۔ بڑے چچا میاں یعنی بھیا صاحب کے والد بیرسٹر تھے اور کانگریسی لیڈر، مگر ان کا عین جوانی میں انتقال ہو گیا۔ پٹنے والے ماموں بھی کانگریسی تھے اور آئے دن جیل جاتے رہتے تھے۔ کمال کو ترک موالات کا زمانہ یاد تھا جب پٹنے والے ماموں اسے اپنے

ساتھ جلسوں میں لے جاتے اور وہ بڑے جوش وخروش سے اسٹیج پر کھڑے ہو کر اپنی توتلی زبان میں قومی نظمیں پڑھتا اور پولیس آ کر لاٹھی چارج سے جلسے کو منتشر کر دیتی۔ سیاست اب محض اخباروں تک محدود نہیں تھی، روزمرہ کی زندگی میں داخل ہو گئی تھی۔

جب ذرا اور بڑا ہوا تو اپنے ہندوستانی ہونے پر اسے ناز سا محسوس ہونے لگا۔ اس ناز میں زیادہ تر اپنے ماضی پر فخر کرنے کا عنصر شامل تھا۔ ہم یوں تھے۔ ہم وہ تھے۔ اسی قسم کی تقریریں لیڈر کر رہے تھے۔ سیلرز سوٹ کے بجائے چٹنے والی ممانی نے اس کے لیے کھادی کی شیروانی بنوائی۔ اس کے کزن جامعہ ملیہ میں پڑھتے تھے۔ اس نے بھی ضد کی کہ اسے دلی بھیج دیا جائے مگر اس کی کسی نے نہ سنی۔ بہر حال کرنل براؤنز دہرہ دون اور لا مارٹینر لکھنؤ کے برطانوی لڑکوں کے مقابلے میں وہ ہندوستانی تھا اور ہندوستان اس کا بہت پیارا وطن تھا۔

یہ ہندوستان کیا تھا؟ اس کا شعوری طور پر اس نے کبھی تجزیہ نہیں کیا۔ بچپن سے وہ اس ہندوستان کا عادی تھا جہاں وہ پیدا ہوا تھا، جہاں اس کے پرکھ پچھلے سات آٹھ سو سال سے پیدا ہوتے آئے تھے۔ اس ہندوستان میں سرسوں کے کھیت تھے اور رہٹ اور ستیلا دیوی کے مندر۔ ہندوستان بستی ضلع کا وہ مٹھ تھا جہاں وہ اپنے بابا کے ہمراہ گیا تھا۔ جہاں برآمدے میں تخت پر ایک موٹا بی۔ اے پاس مہنت بیٹھا تھا اور جس کو ممی نے دس کا نوٹ چڑھایا تھا اور جس نے آشیرباد دی تھی۔ ہندوستان اٹاوے کی وہ کائی آلود درگاہ تھی جس کی منڈیروں پر بہت سے قلندر اکڑوں بیٹھے رہتے تھے جن میں سے ایک نے کمال کو بوڑل کے سنترے کھلائے

تھے۔ ہندوستان قدیر ڈرائیور کی بوڑھی ماں تھی جو پیلے رنگ کی دھوتی پہنے مرزا پور کے اسٹیشن پر کمال کے لیے مٹی کے کھلونے لے کر آئی تھی۔ ہندوستان سول لائنز کی وہ سڑکیں تھیں جن پر صاحب لوگوں کے ڈوگ بوائیز شام کو کتوں کو ہوا کھلانے کے لیے نکلتے تھے۔ ہندوستان بوڑھا حاجی بشارت حسین خانساماں تھا جو جب کمال کو سیتلا نکلی تھی تو 'اپنی دوپلی ٹوپی اتار کر ایک ٹانگ پر ہاتھ جوڑ کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا اور گڑگڑا کر بولا تھا۔

"ماتا ____ اب معاف کرو ______ بھیا کو چھوڑ کر چلی جاؤ _____ ماتا تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔"

یہ _ _ _ _ _ سوتیلا کے سامنے ہاتھ جوڑنے والا مسلمان بوڑھا ______ ہندوستان تھا۔ اس کے علاوہ اس کی اماں اور خالائیں اور گھر کی دوسری بیبیاں بھی ہندو ستان تھیں۔ ان کی آپس کی بول چال' محاورے' گیت' رسمیں اور پھر پرانی کہانیاں' جو مغلانیاں سناتی تھیں: جودھیا کے راجہ دسرتھ کی دو بیبیاں تھیں۔ ایک کا نام تھا کیکی 'دوسری کا کوشیلیا _ _ _ _ _ _ _ ہندو پرانوں اور دیو مالا کے قصے' مسلمان اولیا کے قصے' مغل بادشاہوں کے قصے۔ یہ سب کمال کی ذہنی بیک گراؤنڈ تھی۔ ایک غرور اپنے ماضی پر، ایک تاسف اپنے حال پر' ایک امید اپنے مستقبل کے متعلق _____ ان تین عناصر سے اس کے ذہن کی تشکیل ہوئی تھی۔ گاندھی' جو دھوتی باندھے گھومتے تھے اور ملک کے سنتوں' کبیر اور تلسی داس اور تکا رام کی روایت پر پورے اترتے تھے' اس کسان کے لیے سمبل تھے جو خود بھی دھوتی

باندھے ننگا گھومتا تھا۔ نہرو اس ہندوستان کے نئی نسل کے سمبل تھے جس کی دل میں یہ سارے دریا امنڈ رہے تھے۔

اس ہندوستان میں ان گنت اسرار تھے ــــــ مذہب، فلسفہ، آرٹ، رمزیت، تصوف، ادب، موسیقی ــــــ کیا کچھ یہاں نہیں تھا۔ ایک طرف یہ زبردست عظیم الشان ورثہ تھا، دوسری طرف انگریزی تمدن تھا۔ صاحب لوگوں کا راج تھا۔ اسمبلی کے قانون تھے۔ گورنر کے دربار تھے۔ انگریز لڑکے، جو کرنل براؤنز اور لا مارٹینیر میں اس کے ساتھ شہسواری کرتے تھے۔ انگریز افسر، جو گلفشاں میں ڈنر کھانے آتے تھے، اس کی گولہ گنج والی حویلی کی شہ نشیں میں بیٹھ کر محرم کے جلوس کا نظارہ کرتے تھے۔ یہ انگریز، ہیلی بری کے افسروں کے جانشین، جن کو سکھایا گیا تھا کہ کن ہندوستانیوں کو، جب وہ تمہاری کوٹھی پر سلام کے لیے حاضر ہوں تو 'برآمدے ہی میں بٹھاؤ' کن کو ڈرائنگ روم میں بلانے کی عزت بخشو، کن کو صرف کھڑے کھڑے ہی ڈالی لے کر واپس کر دو، کن کے گھر خود بھی، جب وہ مدعو کریں، تو چلے جاؤ۔ کمال اس خوش قسمت طبقے میں پیدا ہوا تھا جسے انگریزوں سے برابری سے ملنے کا فخر حاصل تھا ــــــ ہندوستان کا فیوڈل طبقہ۔

۳۴ء میں پنڈت نہرو نے یہ خوش آئند امید ظاہر کی تھی کہ گو مسلم سیاست پر فیوڈل عنصر چھایا ہوا ہے، ان کا نچلا متوسط طبقہ انڈسٹریل طور پر پس ماندہ ہے لیکن چونکہ ان کے یہاں سماجی رشتوں کا شعور زیادہ پختہ ہے اس لیے یہ لوگ ہندو لوئر مڈل کلاس کے مقابلے میں سوشلسٹ راستے پر زیادہ تیزی سے گامزن ہوں گے۔ پنڈت نہرو یہ بھی کہتے تھے کہ ہمارے سرمایادار اور انڈسٹری کے کرتا دھرتا اور مل

مالک شدت سے رجعت پسند ہیں، وہ تو ابھی جدید زمانے کے سرمایہ دار بھی نہیں بنے ہیں۔ کانگریس پر ہندو اکثریت کا غلبہ ہے اور ہندو اکثریت فرقہ وارانہ ذہنیت کی حامل ہے۔ایسے میں مسلمانوں میں خوف کی سائیکولوجی کا پیدا ہونا ناگزیر ہے اور اس صورت حال کو برطانوی حکومت خوب اچھی طرح اپنے فائدے کے لیے استعمال کر رہی ہے۔ ملک کا فیوڈل عنصر یہ بھی نہیں چاہتا کہ عوام اقتصادی طور پر آزاد ہوں لہذا انہوں نے برطانوی حکومت سے سازش کر رکھی ہے۔ مڈل کلاس کی انٹل جنیسا میں فاشزم کے عناصر بھی پیدا ہو رہے ہیں۔ ان خطرات کا مقابلہ کرنے میں ہمیں اپنی پوری کوشش صرف کرنا چاہیے۔ پنڈت نہرو بہت زبردست سوشلسٹ تھے ان کو گاندھی جی کی روحانیت اور بات بے بات خدا کا حوالہ دینا کھلتا تھا۔ کمال اور اس کے ساتھ کی نوجوان نسل کی پنڈت نہرو پوری پوری ترجمانی کر رہے تھے۔

اس نئے باشعور ہندوستان اور برطانوی ہندوستان کے علاوہ ایک اور الف لیلوی دیس اسی ملک میں رہتا تھا جس کی جھلک کمال نے حیدرآباد دکن اور ریاست کشمیر اور بھوپال اور رام پور میں دیکھی تھی۔ یہ ریاستی ہندوستان تھا۔ یہاں سیاسی آزادی کے تصور کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا۔ یہ راجے مہاراجے برطانیہ کے فرزندان دلبند کہلاتے تھے اور کمپنی سے انیسویں صدی میں جو معاہدے انہوں نے کیے تھے ان کی بناء پر مطلق العنانی سے حکومت کرتے تھے۔ان ریاستوں میں خصوصاً حیدرآباد دکن مسلمانوں کے لیے خاص جذباتی اہمیت کا مالک تھا۔ ہزاگزالٹڈ ہائی نس حضور نظام کی مملکت، تہذیب، شعروشاعری نفاست، آداب محفل وغیرہ کا

سلسلہ چونکہ ایک خاص درباری اور جاگیردارانہ ماحول میں پھلتا پھولتا ہے لہٰذا یہاں پر مسلمانوں کی کلچر ابھی اپنی خالص حالت میں موجود تھی۔

جاگیرداروں' مڈل کلاس لیڈروں' ذہن پرستوں اور یونیورسٹیوں کے جوشیلے طالب علموں کی دنیا سے الگ ایک اور دنیا تھی جو اصل ہندوستان تھا۔ یہ دنیا آسام اور جنوبی ہند کے چاء کے باغات اور کانپور' بمبئی' کلکتے' احمد آباد اور ٹاٹا نگر کے کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں اور سارے ملک کے لاکھوں گاؤوں میں رہنے والے کسانوں پر مشتمل تھی۔ کانگریس نے عرصے سے زرعی اصلاحات کے لیے ایجی ٹیشن کر رکھا تھا۔ کسانوں کے سلسلے میں برطانوی حکومت نے مختلف صوبوں میں حکمت عملی اختیار کر رکھی تھی۔ بنگال میں' جہاں انہوں نے مسلمانوں سے حکومت چھینی تھی' وہاں مسلمانوں کو اقتصادی طور پر بالکل تباہ کر کے ہندوؤں کو ان کی جگہ طاقتور بنایا تھا۔ پنجاب انہوں نے سکھوں کے ہاتھوں سے لیا تھا لہٰذا یہاں مسلمانوں کی انہوں نے ہمت افزائی کی۔ جو صوبے سب سے زیادہ عرصے سے انگریزوں کے زیر نگین تھے وہ سب سے زیادہ تباہ حال تھے ____ بنگال' بہار' اڑیسہ' مدارس۔ بنگال میں مستقل قحط پڑتے تھے۔ پنجاب انگریزوں کے ہاتھ میں سب سے آخری میں آیا تھا لہٰذا سب سے زیادہ خوشحال صوبہ یہی تھا۔ یو۔ پی' جو ہندوستان کا دل تھا اور ملک کی ساری قرون اولیٰ' قرون وسطیٰ کی تہذیبوں کا گہوارہ' وہیں کا کسان سب سے زیادہ مفلوک الحال تھا۔ کسان' جو کانگریس تحریک کی طرف آ رہا تھا' سمجھتا تھا کہ سوراج کا مطلب زرعی اصلاحات ہے۔ جب اسے جنم جنم کے ظلم اور قرضے کے بوجھ سے نجات ملے گی۔

شہروں میں ٹریڈ یونین قائم ہو رہے تھے۔ ۱۹۲۹ئمیں حکومت نے بنگال، بمبئی، پنجاب اور یو۔ پی کے مزدور لیڈروں کو پکڑ لیا جن میں کمیونسٹ بھی شامل تھے۔ میرٹھ ٹرائل شروع ہوا۔ کمیونسٹ ______ یہ ایک نیا عنصر اب سیاسی منظر پر ظاہر ہوا۔ یہ زیادہ تر یورپ کی یونیورسٹیوں میں پڑھے ہوئے انٹلکچول تھے۔ ساری دنیا اقتصادی ڈپریشن چھایا ہوا تھا۔ ایک نئی جدوجہد بڑے پیمانے پر شروع ہو چکی تھی۔ اس طبقاتی جدوجہد میں امریکہ پیش تھا۔

پھر ۳۷ء میں، جب کمال ابھی لامارٹینئر ہی میں تھا، لکھنو میں دو اہم واقعات ہوئے مسلم لیگ کا آل انڈیا سیشن اور کانگریس حکومت کا قیام۔

اسے اب تک یاد تھا کہ اسے بیگم شاہنواز کی شخصیت نے بہت متاثر کیا تھا جو بہت چوڑے نقرئی بارڈر کی ساری اور لمبے لمبے بندے پہنے ڈائس پر کھڑی تقریر کر رہی تھیں۔

اسی سال کانگریس نے ۳۵ء کے آئین کے نکات منظور کر کے اپنی وزارت قائم کی۔ یہ ایک نیا انوکھا تجربہ تھا۔ پہلی مرتبہ ملک میں قومی لیڈر حکومت کے نظم و نسق میں شامل ہوئے۔ مسز وجے لکشمی پنڈت لوکل سیلف گورنمنٹ کی وزیر بنیں۔ سفید ساڑی اور چینی وضع کا بغیر آستین کا بلاؤز پہنے موٹر میں بیٹھی وہ کونسل چیمبر کی طرف جاتی نظر آتیں۔ اگلے سال جب ریڈیو اسٹیشن کھلا تو انہوں نے اس پر افتتاحی تقریر کی۔ اسی زمانے میں گومتی کے کنارے صنعتی نمائش منعقد ہوئی۔ کمال اندھیرا پڑے گلفشاں کی سیڑھیوں پر بیٹھا ہوتا۔ شام کے سناٹے میں ہواؤں کے ساتھ بہتی ریکارڈوں کی آوازیں اس کے کان میں پہنچتیں۔

ان میں سے ایک فلمی ریکارڈ اکثر بجتا ______

کایا ایک گھروندا ہے۔ کایا ایک گھروندا ہے ______

اسی زمانے میں کانگریس نے نیشنل پلاننگ کمیٹی بنائی۔ زراعت' صنعت' تعلیم' بے روزگاری وغیرہ کے لیے دس دس سالہ منصوبہ تیار کیا گیا۔ تبھی کانگریس نے چین میڈیکل مشن بھیجا' پھر جنگ چھڑ گئی اور ہندوستان کی رائے لیے بغیر برطانیہ نے اس ملک کو بھی جنگ کی بھٹی میں جھونک دیا۔ انگریزوں کی خاطر پچھلے ستر سال سے ہندوستانی فوج دوسرے ایشائیوں سے لڑتی تھی۔ ہندوستانی سپاہی افغانوں سے اور چینیوں کو مارنے کے لیے بھیجے گئے۔ عراق میں ترکوں اور عربوں سے لڑے اور اب ان کو پھر یورپین امپیریلزم کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ کانگریس حکومت نے استعفیٰ دے دیا۔ اب پھر گورنر کا راج شروع ہوا۔ کانگریس نے عدم تعاون کو تحریک شروع کی۔ زوالِ فرانس کے بعد جب اتحادیوں کی حالت بے حد خستہ ہو گئی تب کانگریس نے ایک بار پھر پیش کش کی کہ اگر مرکز میں مکمل آزاد قومی حکومت قائم کر دی جائے۔ تو وہ جنگ میں تعاون کرنے کے لیے تیار ہے۔ یہ پیش کش برطانیہ نے مسترد کی تب مہاتما گاندھی نے انفرادی ستیہ گرہ شروع کر دی۔ تیس ہزار مرد اور عورتیں جیلوں میں بند کیے گئے۔ ہری شنکر اور رکمال بھی جیل گئے۔ کچھ عرصے بعد ان کو دوسرے طالب علموں کے ساتھ رہا کر دیا گیا۔

۷/اگست ۴۲ء کو کوئٹ انڈیا ریزولیوشن پاس کیا گیا۔ ملک میں بغاوت شروع ہوئی۔ احمد نگر فورٹ پھر آباد ہوا۔ یونیورسٹی کے طالب علم اس میں پیش پیش تھے۔

دس ہزار ہندوستانی پولیس فائرنگ سے مارے گئے۔

اب بنگال میں قیادت کا سامنا تھا۔ چونتیس لاکھ انسان اب تک فاقے سے مر چکے تھے۔ چونتیس لاکھ ـــــــ انسان ـــــــــــــ

چونتیس لاکھ آمنہ اور ابوالمنصور ـــــــ

کمال دوسری صبح جلدی جلدی ناشتہ کرنے کے بعد چیت پور روڈ سے نکلا اور پرمودا کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

## ۴۸

پارک سرکس میں پرمودا کے گھر پر بہت سے لڑکوں اور لڑکیوں کا مجمع تھا۔ کلکتہ یونیورسٹی کے طالب علم' اپنا کارکن پارٹی کے افراد لکھنو والے بھی سب پہنچ چکے تھے۔

پرمودا کلکتے کے اسٹوڈنٹ لیڈر تھے۔ اس وقت ان کے مکان کے بڑے ہال میں بڑی سخت گہما گہمی نظر آ رہی تھی۔ ریلیف ورک کا منصوبہ بنایا جا رہا تھا۔ چندہ اکٹھا کرنے کے لیے جو پروگرام اسٹیج کیا جانے والا تھا اس کی ریہرسل جاری تھی کونے میں ہارمونیم رکھا تھا۔ ایک طرف دو لڑکیاں ٹیگور کی چترانگدا کے گانوں کی مشق کر رہی تھیں۔ ہال کے سرے پر شیشوں والا برآمدہ تھا۔ اس میں پرمودا کی بہن کا اسٹوڈیو تھا جو شانتی نکیتن کی آرٹسٹ تھیں۔ اسٹوڈیو میں ایک لڑکا سفید شال اوڑھے ایزل کے سامنے کھڑا ایک پورٹریٹ پر آخری ٹچ لگا رہا تھا۔ ڈرامے کے

بعد یہ تصویر بھی ریلیف فنڈ کے لیے نیلا کی جانے والی تھی۔

پرمودوا کی بہن ارونا دیدی ایک اور کینوس پر جھکی ہوئی تھیں۔

سب اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔

برش صاف کر کے ایک طرف کو رکھنے کے بعد ماتھے پر سے بال ہٹاتا ہوا یہ مصور لڑکا ہال کے دروازے میں آ کھڑا ہوا اور ہال کے منظر پر نگاہ ڈالی ان سب کو اس تندہی سے کام میں جٹے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ایک اداس سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

"دادا ادھر آؤ ____ "ایک لڑکی نے اسے آواز دی۔"دیکھو اب میرے قدم ٹھیک ہیں نا ____"

"تمہارے قدم تو کبھی ٹھیک نہیں ہوں گے۔" اس نے لڑکی کی طرف جاتے ہوئے کہا۔"تم بنگالیوں کی رومان پرستی نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔تم خالص کلاسیکل ڈانس کی آخر کیوں اہل نہیں۔"

"دادا یہ تو خالص بھرت ناٹیم کر رہی ہوں میں۔"

وہ اسے اسی اداسی سے کھڑا دیکھتا رہا۔

یہ لڑکا بھی یو۔پی کا رئیس زادہ تھا۔فی الحال وشوا بھارتی آیا ہوا تھا۔ایم۔اے اور لاء الہ آباد سے کر چکا تھا۔ابھی اس کے دماغ میں واضح طور پر نہیں آیا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔بہت سے پروگرام تھے: جرنلزم' سیاست' کتابیں لکھا کروں گا نہایت عالمانہ' ایسی ایسی تھیوریز پیش کروں گا کہ دنیا عش عش کر اٹھے گی' آرٹ کا نقاد بنوں گا۔سیاسی طور پر آپ بہت سخت اشترا کی واقع ہوئے تھے۔باپ کا کہنا

تھا (اور سارے باپوں کی طرح ) کہ آئی ۔سی ۔ایس میں بیٹھو وہ خود حکومت برطانیہ کے نائٹ تھے اور بڑی چوٹی کے بیرسٹر ۔بچپن میں اسے نینی تال پڑھنے کے لیے بھیجا گیا' پھر یونیورسٹی کی تعلیم ختم کرنے اور ادھر ادھر مارے مارے پھرنے کے بعد اس کے جی میں آئی کہ شانتی نکیتن چلو ۔اس نے باپ سے تجویز ا: بابا ______ ہمیں وشوا بھارتی بھیج دیجیے ۔باپ نے اسے گھور کر دیکھا ۔کیوں میاں صاحبزادے' آرٹسٹ بنوگے ۔دماغ تو نہیں خراب ہو گیا؟ دنیا کے سارے باپ یہی بات کہتے مگر چونکہ اکلوتا لڑکا تھا اس لیے باپ نے ضدی پوری کر دی۔ اب وہ دو سال سے بولپور میں تھا اور وشوا بھارتی کے دوسرے طالب علموں کے ہمراہ ریلیف کے کام کے سلسلے میں کلکتے آیا ہوا تھا۔

''یہ لکھنو سے لوگ آئے ہیں۔ ان سے نہیں ملے۔'' کسی نے قریب سے گزرتے ہوئے اس سے کہا' وہ ہال عبور کر کے اس کونے کی طرف چلا جدھر کمال دوسرے لڑکوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ دوسرا لڑکا اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا اور گانا ختم ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

چاروں طرف زور زور سے بنگالی بولی جا رہی تھی ۔

کمال نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا: ''نومشکار''

کمال نے گانا ختم کرنے کے بعد ہارمونیم بند کرتے ہوئے اس سے کہا۔

'' آداب عرض ۔!'' اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

کمال کی جان میں جان آئی۔ بنگالی بولتے بولتے اس کی حالت تباہ ہو چکی تھی۔

''گوتم نیلمبر ـــــ لڑکے نے اپنا تعارف کرایا۔''

''کمال رضا۔'' اسے اطلاع ملی۔ دونوں نے ہاتھ ملایا۔

دونوں کا ایک ہی حلیہ تھا۔ تنگ پائجامہ، کرتا تہہ و واسکٹ اوپر سے کشمیری شال۔ یہ حلیہ اس گروہ کے تقریباً سبھی نوجوانوں کا تھا۔

''میاں کہاں آ پھنسے۔ ان بنگالی بول بول کر ناطقہ بند کر رکھا ہے۔ آؤ باہر چلیں۔''

دونوں نے باہر ایک ریسٹوران میں جا کر قہوہ پیا اور پھر واپس آ گئے۔

''آؤ تم کو اپنی تصویر دکھاؤں۔'' گوتم نے ارونا دیدی کے نگار خانے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''یار تم ہری شنکر سے نہیں ملے'' کمال نے کہا۔

''ہری شنکر کون ہے۔'' گوتم نے بے خیالی سے پوچھا اور بڑے آرٹسٹوں والے انداز میں سگریٹ ہونٹ میں دبا کر تصویر مکمل کرتا رہا۔

''ہری شنکر ـــــ یار ہے میرا۔ بڑا باغ و بہار آدمی ہے۔''

''کہاں ہے بلاؤ۔'' گوتم نے نوابوں کی طرح کہا۔

''گھاس کھا گئے ہو، وہ یہاں نہیں ہے۔ لکھنو میں ہے۔ بیمار پڑا ہے بے چارہ۔''

''تم سب لکھنو میں کیوں رہتے ہو۔'' گوتم نے برش ایک طرف رکھ کر مڑتے ہوئے پوچھا۔

''اور پھر کہاں رہیں۔''

''ہاں یہ بھی ٹھیک کہتے ہو۔''

''تم نے اس کی ناک غلب بنائی ہے۔''

''ہونٹ بنانے بہت مشکل ہوتے ہیں۔''

''ماشاءاللہ کیا جواب دیا ہے۔ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ''

''سگریٹ لو۔''

''کیا تم آرٹسٹ ہو۔''

''اور کیا تمہیں گراس کٹ نظر آتا ہوں۔''

''ارے رے۔تمہارا ہی ذکر جیجا جی نے کیا ہے خط میں''

''جیجا جی ______ وہ کون بزرگ ہیں۔''

''ہماری لاج کے میاں۔''

''تمہاری لاج کون ہے۔''

''حد ہے۔جیجا جی تو تم کو جانتے ہیں۔''

''مجھ کو بہت سے لوگ جانتے ہیں۔''

''مغالطہً فائیڈ بھی ہو۔؟''

''ہاں۔تم نہیں ہو؟''

''ہوں تو سہی۔''

''ٹھیک ہے۔'' گوتم تصویر میں لگا رہا۔

''اگر رہ لیے شانتی نکیتن میں چار پانچ سال تو شاید لوٹ پیٹ کر آرٹسٹ بن جاؤ۔فی الحال تو اس کی کوئی امید ہے نہیں۔'' کمال نے تصویر کو غور سے دیکھتے

ہوئے اظہار خیال کیا۔

''خالی آرٹسٹ۔ ارے میرا ارادہ تو ہے کہ مدارس جا کر رام گوپال سے بھرت ناٹیم بھی سیکھوں گا'' گوتم نے الٹی میٹم دیا۔

''یہ ارادہ تو ایک زمانے میں اس خاکسار کا بھی تھا مگر جب میں نے اس کا اظہار کیا تو میری بہنیں ہنستے ہنستے لوغ گئیں اور انہوں نے بے انتہا میری ہوٹنگ کی۔ اصل میں لڑکیاں بے حد بوگس ہوتی ہیں ______ آرٹ کو سمجھنے کی ان میں صلاحیت نہیں۔''

تمہاری بہنیں بھی ہیں۔''

''ہاں ______ تمہاری نہیں ہیں۔''

''نہ''

''یہ بڑے افسوس کی بات ہے۔ بہنیں ہوں تو زندگی میں بڑے سکون اور نرمی کا احساس رہتا ہے۔''

''ہوں' پھر کیا ہوا۔''

''کیا ______؟''

''تم کہہ رہے تھے کہ ______''

''یار گوتم تم کو معلوم ہے میں بدھسٹ بھی ہو گیا تھا ایک زمانے میں۔''

''واقعی۔''

''چند سال گزرے میں سارناتھ گیا تو وہاں مجھے بڑا سخت سکون ملا تو میں نے سوچا کہ یار یہ بدھ ازم میں کچھ نہ کچھ ہوگا ضرور۔''

''ہوں۔''

''تم پارٹی میں ہو۔''

''پارٹی؟____ نہیں۔ ابھی میں اس قابل نہیں بنا۔ اس کے لیے بڑا پتہ مارنے کی ضرورت ہے''

''ہاں ٹھیک کہتے ہو______ ویسے تم کوئی ایسے ریوولیوشنری دکھلائی بھی نہیں پڑتے۔'' کمال نے کہا۔

گوتم نے غصے سے اسے دیکھا۔

''معلوم ہے مہاتما گاندھی نے تمہارے گرودیو سے کیا کہا تھا۔ کہ گھر میں آگ لگی ہے اور آپ بیٹھے چڑیوں کا گانا سنتے ہیں۔'' کمال نے کہا۔

گوتم نے برش جھٹک کر رکھا: ''بےوقوفی کی باتیں مت کرو جی۔ کیا تمہارے ہری شنکر میں بھی تمہارا ہی جتنا بچپنا ہے______؟''

''تم بھیا صاحب سے بھی ملنا۔'' کمال نے اس کی بات کی سنی ان سنی کر کے کہا۔

''وہ کون ہیں۔''

''میرے چچازاد بھائی۔''

''وہ بھی بہت قابل ہیں۔''

''ہاں''

''لکھنو ہی میں رہتے ہیں؟''

''ہاں، مگر آج کل محاذ پر گئے ہوئے ہیں۔''

''لکھنو بڑا بڑا اہل کمال پڑا ہوا ہے۔اس کا مطلب ہے۔''

''اور کیا''

''چلو فرپو چل کر چاء پئیں۔'' گوتم نے اٹھ کر تصویر پر کپڑا اڈالتے ہوئے کہا۔

''فرپو ____ تم سخت بورژوا معلوم ہوتے ہو۔''

''بکومت۔''

''اچھا ایک بات بتاؤ۔ میں ہر بات کے متعلق بہت واضح تصورات رکھنے کا قائل ہوں۔'' کمال نے کہا۔

''شوٹ۔''

''کلاس کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے ____ تم پرولتاریہ کے مستقبل میں یقین رکھتے ہو۔؟''

''ہاں''

''ہاتھ ملاؤ۔'' انہوں نے ہاتھ ملایا۔

''تم سمجھتے ہو فیوڈل سماج اپنی موت آپ مر جائے گا؟''

''ہاں۔''

انہوں نے دوبارہ ہاتھ ملایا۔

''تم کو وشواس ہے کہ تم کو فیوڈل سماج سے سچی دلی نفرت ہے اور تم اس کی بیخ کنی ہی کر کے دم لو گے۔''

''مجھے تو خیر وشواس ہے لیکن تم تو خود فیوڈل سماج سے تعلق رکھتے ہو۔''

''تم کو کیسے معلوم۔'' کمال نے گھبرا کر پوچھا۔ گویا اس کی کوئی بہت بڑی

چوری پکڑی گئی۔

"مجھے اس طرح معلوم ہوا کہ ابھی ابھی ہال میں کوئی ذکر کر رہا تھا کہ تمہاری مٹیا برج والوں سے رشتے داری ہے اور تم چیت پور روڈ والے نواب صاحب۔"

"ہاں ـــــ ہاں ـــــ خیر ـــــ" کمال شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ "وہ تو جو ہوا سو ہوا۔ تاریخ پر میرا کیا بس ہے، مگر اب میں پوری کوشش میں لگا ہوں کہ خود کو مکمل طور پر ڈی کلاس کر لوں۔"

"تمہارا ہری شنکر بھی فیوڈل ہے؟"

"ہے تو سہی، مگر وہ بے چارہ بھی کیا کر سکتا ہے۔"

"خوب" گوتم مسکرایا۔ "میں بڑا سخت مڈل کلاس ہوں۔" اس نے اطلاع دی۔

"رنج نہ کرو" کمال نے اسے دلاسا دیا۔ "ہم لوگ تو دراصل اس نئے سماج سے تعلق رکھتے ہیں جو اب جنم لے رہا ہے۔ جنتا کا سماج۔"

اس طرح کی خالص طالب علمانہ گفتگو کے بعد دونوں باہر آئے۔ کمال پر گوتم کا رعب پڑ گیا۔ گوتم میں بڑی گہرائی تھی اور وہ بہت زیادہ سمجھ دار تھا۔ بہر حال سینئر لڑکا تھا اور کمال ابھی متاثر ہونے والی اسٹیج سے نہیں نکلا تھا۔

لکھنو واپس پہنچ کر کمال نے چچا جی کو جو خط لکھا اس میں گوتم نیلمبر کی تعریفوں کے دریا بہا دیے۔

اسی سال گرمیوں میں گوتم لکھنو آیا۔ اپنی جائے قیام سے اس نے گلفشاں فون کیا، وہاں معلوم ہوا کہ سب لوگ ریڈیو اسٹیشن گئے ہوئے ہیں۔ ریڈیو اسٹیشن سے اطلاع ملی کہ ابھی ابھی سب لوگ کملا پسپال کے ہاں فیض آباد روڈ گئے ہیں۔ فیض

آبا درو ڈسوے پتا چلا وہ سب تو سنگھاڑے والی کوٹھی چلے گئے۔

سنگھاڑے والی کوٹھی ۔کیا بے تکام نام تھا۔اب مکانوں کے ایسے نام ہونے لگے۔ جیسے خربوزے والی حویلی اور تربوز والا قلعہ یا گاجر منزل ________اور مولی ہاؤس ______اسے بے حد ہنسی آئی۔ شاید لوگ سنگھاڑے بہت کھاتے ہوں گے یا کیا ہوتا ہوگا۔

اس نے سنگھاڑے والی کوٹھی فون کیا تو وہاں چمپا نے ریسیو اٹھایا۔

''ہلو______چمپا نے کہا''

''ہلو___ آداب عرض۔ دیکھیے میرا نام گوتم ہے___ گوتم نیلمبر___ اگر آپ لوگ ابھی وہاں سے کہیں اور تشریف نہ لے جاتے ہوں تو میں حاضر ہوں۔''

''آپ ضرور تشریف لائیے۔'' چمپا نے جواب دیا۔''اور اگر آپ سوشلسٹ ہیں تو ذرا تیار ہو کر آیئے گا۔آج ہم سب تلے بیٹھے ہیں کہ کوئی سوشلسٹ ملے تو اسے کچا چبا جائیں۔''

گوتم نے اس روز کا اخبار ابھی تک نہیں پڑھا تھا مگر اس نے فوراً جواب دیا

''بہت خوب___ حاضر ہوتا ہوں_____ آپ لوگ بھی تیار رہیے گا۔''

سنگھاڑے والی کوٹھی میں جب وہ سب لوگ جا کر ندی کے رخ برآمدے میں بیٹھ گئے تو گوتم نے سوال کیا''طاعت آراء بیگم آپ سب میں سے کون سی خاتون ہیں؟''

''جی میں ہوں۔فرمایئے۔''

''دیکھیے مس صاحب کوئی لکھنے بیٹھ۔جائے تو اس کا قلم تھوڑا ہی پکڑا جا سکتا

ہے مگر یہ کہ آپ اگر ایسا نہ کرتیں تو کتنا اچھا ہوتا۔''

''آپ نے IPTA کی طرف سے جس قدر بوگس ڈرامے کلکتے میں پروڈیوس کیے ہیں ان کا احوال میں بھی کمال کی زبانی سن چکی ہوں۔ میں آپ کو مارجن دیتی ہوں کہ پندرہ منٹ تک ہم سب پر اپنا عرب ڈالیے___ اتنا ہی وقفہ ہم آپ کو مرعوب کرنے میں صرف کریں گے۔ اس کے بعد نارمل ہو جائیے کہ نارمل رہنا ہی بہت مستحسن ہے۔ اچھا اب ڈالیے رعب۔ شروع کیجیے۔ سنا ہے آپ وشوار بھارتی کو نواز رہے ہیں_____ یہاں بھی ایک سے ایک بڑا آرٹسٹ پڑا ہے۔ ہر قسم کا اور یہ سب باری باری فرداً فرداً اور مجموعی طور ہر آپ کو امپریس کرنا چاہیں گے۔ پہلے آپ اپنے پولیٹیکل خیالات سے مطلع کیجئے___ ری ایکشنری تو نہیں ہیں؟ یا مہا سبھائی___''

''آپ چیلے بناتے ہیں؟'' نرملا نے پوچھا۔

''جی نہیں۔ کبھی کبھی بنا لیتا ہوں''

''گوتم___ آپ کا تخلص ہے؟'' طلعت نے سوال کیا۔

''جی نہیں۔ ماں باپ نے یہی نام رکھا تھا۔ طلعت بیگم۔ میں پھر کہوں گا۔ آپ ابھی اور پڑھیے اس کے بعد لکھنا شروع کیجیے گا۔ آپ کے علم میں افسوسناک کمی ہے۔''

''بھیا صاحب نہیں پہنچے۔'' کمال نے کہا ''انہوں نے فون کیا تھا کہ چاء یہیں پئیں گے۔''

''بھیا صاحب' اس وقت۔'' طلعت نے گھڑی دیکھ کر تندہی سے اعلان کیا۔

''رائیڈ نگ کے لیے گئے ہوئے تھے ۔ اب سوئمنگ سے واپس آتے ہوں گے ۔''مجمع اپنی جگہ پر ذرا نادم ہوا۔

''خدا کی پناہ ۔ یہ کون صاحب ہیں۔کوئی فلم اسٹار ہیں۔اشوک کمار وغیرہ ۔؟''گوتم نے سوال کیا۔

''بھیا صاحب_____ میں نے تم سے کہا نہیں تھا کہ ان سے ضرور ملنا۔ ''کمال بولا۔

''تعلق داران اودھ کے متعلق میری معلومات بہت محدود ہیں۔کیا آپ سب یہی رائیڈ نگ اور سوئمنگ وغیر کرتے ہیں۔میں دراصل سارے مڈل کلاس لوگوں کی طرح طبقہ امراء پر عاشق ہوں۔جنگ سے پہلے ولایت گیا تھا' اپنے بابا کے ہمراہ۔تو برٹش لارڈوں کو دیکھنے کی تمنا میں گھوما گھوما پھرتا تھا۔جہاں دور سے کوئی لارڈ نظر آیا اور میں لپکا اس کی طرف بعد میں معلوم ہوا کہ وہاں کے انڈر ٹیکر بھی وہی لارڈوں والا لباس پہنتے ہیں۔''

''ہم لوگ بھی انڈر ٹیکر ز ہیں۔''کمال نے کہا۔

''اور ماضی کی قبروں کے مجاور۔''ہری شنکر نے کہا۔

''لیکن تمہیں ہم کو پسند کرنا پڑے گا۔''کمال نے دوبارہ کہا''کیونکہ ہم لوگ اپنی دلکشی کے سہارے ہی پر زندہ ہیں۔''

''میں تم کو ضرور پسند کروں گا۔میرے دل میں بڑی وسعت ہے۔''اس نے بڑی تمکنت سے جواب دیا۔

## ۴۹

چمپا اب گروہ میں شامل تھی۔ اس نے گروہ کے قوانین سے سمجھوتہ کرلیا تھا۔ گروہ بہر حال ہمدرد تھا، کیونکہ خود تنہا تھا۔ ہم کتنے قابل رحم طریقے سے سہارے کے متلاشی رہتے ہیں۔ گروہ محض ایک اور کردار تھا۔ جس طرح ماحول ایک کردار تھا۔ تصورات کی مجسم شکل انسانی رشتے بڑے نازک، بڑی گنجلک بنیادوں پر قائم ہیں۔ برابر یہ رشتے ٹوٹتے بھی رہتے ہیں، اسی لیے میر انیس نے کہا تھا: خیال خاطر احباب چاہیے ہر دم۔ ہر طرف آبگینے تھے جو شیشے کے گھروں میں رکھے تھے۔ یہ ساری کارگہ شیشہ گری تھی۔ کمال نے اس سے کہا______ چمپا باجی چوروں کے ذہنی باورچی خانے میں اپنی اٹھک بیٹھک رکھیے۔ آپ ہمارا گھر رکھایئے، ہم آپ کا گھر رکھاتے رہیں گے۔ ہم کبھی آپ کو اکیلا نہ چھوڑیں گے۔ اپنے ذہن کو ذرا سا ڈسپلن کیجیے۔ یہی اصل چیز ہے۔ مصیبت ساری یہ ہے کہ آپ رومینٹک ہیں۔

مگر ڈسپلن کی زندگی میں گنجائش کہاں تھی؟ یہاں ہر طرف اس قدر انتشار تھا۔ کمال نے کہا ''اگر آپ آرٹسٹ ہوتیں تو ٹھیک تھا۔ آپ اس افراتفری کو اظہار میں ڈھال لیتیں، مگر آپ نہ لکھتی ہیں نہ کسی اور طرح سے اپنا اظہار کرتی ہیں۔ اسی لیے ڈسپلن آپ کے لیے بہت ضروری ہے۔''

''یہ لکھنے والے لوگ بڑے متوازن ہوتے ہیں؟'' چمپا نے پوچھا۔

''متوازن نہ ہوں مگر تخلیق کی Process کے دوران میں وہ اپنا آہنگ

تلاش کر لیتے ہیں۔''

چمپا باجی آپ تصویریں ہی بنایا کیجیے۔

''تم نے تو مجھے بالکل وکٹورین رومان پرست سمجھ لیا ہے۔نہیں کمال' ٹھیک ہے' میں بالکل خیریت سے ہوں۔ میں تم سب کے ساتھ رہوں گی۔ میں ت ہمینہ کے ساتھ رہوں گی۔''

''مگر ساتھ ہی یہ بھی طے کر لیجیے کہ جذبات اور ذہن کا آپس میں کیا ایکویشن ہونا چاہیے اگر یہ طے کر لیا تو بس سمجھے کہ بیڑا پار ہے۔''

''پھر وہی نظریے!''

''اچھا تو آپ تجربے کرنا چاہتی ہیں۔ چمپا باجی از خود تجربے نہ کیجیے گا۔ دنیا آپ کو خود ہی اتنے سبق دے گی کہ ہوش ٹھکانے آ جائیں گے۔''

اسی طرح لان پر بیٹھ کر سڑک پر ٹہلتے ہوئے یہ لوگ لمبی لمبی بحثیں کرتے۔ چمپا اس یونیورسٹی ماحول میں بے حد خوش تھی۔ کیلاش ہوسٹل' جہاں وہ ایم۔اے کے لیے رہ رہی تھی' ایک الگ مخصوص دنیا تھی۔ یہاں ایک بہت بڑے احاطے میں' جہاں یوکلپٹس اور مولری اور سیمل کے پروقار درخت کھڑے تھے' ایک پرانی وضع کی پیلے رنگ کی وسیع کوٹھی تھی جس میں مسز وانچو رہتی تھیں۔ اس کے قریب ہی ایک جدید طرز کی سیمنٹ کی عظیم الشان دومنزلہ عمارت تھی۔ اس میں لڑکیاں رہتی تھیں' یہ جگہ چاند باغ سے بہت مختلف تھی۔ یہاں لڑکیاں' جو زیادہ تر پوسٹ گریجویٹ طالب علم تھیں' بہت ہوشمند اور سینئر ہونے کے احساس کے ساتھ رہتی تھیں۔ چاند باغ میں سیاست کا دخل نہ تھا۔ یہ جگہ دھارے میں شامل تھی۔ چاند

باغ میں بھٹو ون اور رابسن کا راج تھا۔ یہاں ہر طرف مہاتما گاندھی اور نہرو اور قائد اعظم جناح اور کارل مارکس کا چرچا تھا۔ امریکہ کے اعلیٰ طبقے کی لڑکیوں کے مخصوص برائن مار اور اسمتھ کالج کی وضع پر چاند باغ کے ماحول کی تشکیل کی گئی تھی، وہاں سے نکل کر لڑکیاں جب یونیورسٹی میں آتیں تو کیلاش میں رہتے ہوئے خود کو ملک کی فضاؤں سے قریب تر محسوس کرتیں۔

اب چمپا اور تہمینہ اور نرملا اور طلعت عموماً اکٹھی وقت گزرتیں۔ ایک روز تہمینہ نے چمپا سے کہا: "سنو۔ آؤ adult سطح پر اس مسئلے کو دیکھیں۔ بھیا صاحب دسمبر میں مدارس سے آرہے ہیں۔ اس سال تم ایم۔ اے کرلوگی۔ روحانی طور پر اس قدر مہم پسند اور دلاور بننے کا ارادہ ترک کرکے ان سے شادی کرلو۔"

"بکومت۔"

"بکنے کا اس میں کیا سوال ہے۔"

"تم خود ہی نہ کرلو ان سے شادی۔"

"میں تمہاری پرچھائیں بن کر زندہ نہیں رہنا چاہتی۔"

"بکواس۔" تہمینہ نے جواب دیا، پھر کچھ دیر بعد بولی: "علاوہ ازیں بھیا صاحب ہی زندگی کا نصب العین نہیں ہونا چاہئیں۔ مرد اس لائق ہی نہیں کہ ان کو اتنا آسمان پر چڑھایا جائے۔"

"ظاہر ہے۔"

"زندگی کا نصب العین پارٹی ہے۔ کہو ہاں۔"

"ہاں ______" چمپا نے ذرا توقف کے ساتھ جواب دیا۔

طلعت دوسرے کمرے میں بیٹھی تھی۔ یہ مکالمہ اس کے کانوں میں پڑا تو وہ بہت خوش ہوئی۔ ''خدائی کا شکر ہے ان دونوں کی سمجھ میں بات آ گئی۔'' اس نے نرملا سے فون پر کہا۔ نرملا نے بھی خدا کا شکر ادا کیا۔

لیکن بھیا صاحب دسمبر میں لکھنو آئے اور چمپا کے سارے نئے نظریے پھر ہوا ہو گئے' وہ دن بھر خوش خوش پھرتی رہی۔

''وہ گلفشاں والے گلفام آئے ہوئے ہیں آج کل۔'' ہوسٹل میں لڑکیوں نے ایک دوسرے سے کہا۔

اسی اثنا میں گوتم نیلمبر بھی آن پہنچا۔ اس کو زراعت کے محکمے میں ایک بہت عمدہ ملازمت مل گئی۔ (اور لوگوں نے کہا: اپنے باپ کو بڑی حیثیت کی وجہ سے دیکھو کیسے تر نت ہی اسے نوکری مل گئی۔ بڑا کمیونسٹ بنا پھرتا تھا)

یہ زمانہ' جوان لوگوں نے اکٹھا گزارا' ان سب کی زندگیوں کا بہترین دور تھا۔ ایسا دور جو ایک بار چلا جائے تو پھر کبھی واپس نہیں آتا۔

## ۵۰

شانتا یہ بڑی پر سکون جگہ ہے۔ جھاڑوں پر کوئلیں بیٹھی ہیں۔ آموں کے باغ ہیں جن کے درمیان سے ایک مالینی کڑا بجاتی جا رہی ہے۔ بڑے شائستہ ریٹائرڈ کلکٹروں' اوسط درجے کے زمینداروں اور بیرسٹروں کی کوٹھیاں ہیں۔ گھاٹ پر ڈونگیاں کھڑی رہتی ہیں۔ سایہ دار راستوں پر سے لمبے لمبے زرد پھو درختوں سے

پیچے برستے ہیں۔ باریک نازک ٹہنیوں والے درختوں پر بڑے سبک پھول پتے کھلے ہیں جن کو دیکھ کر چینی پینٹنگز یاد آتی ہیں۔ اتوار کی صبح کولڑکیاں بری چھتریاں سنبھالے ایک دوسرے کے گھروں پر جاتی ہیں اور گھاس پر بیٹھ کر نٹنگ کرتی ہیں اور شدید اُتھلکچول گفتگو ان لوگوں کا دستور ہے۔ زندگی میں ہر طرف سلیقہ ہی سلیقہ ہے اور نفاست برآمدے کے سبز جنگلے پر پھیلی ہوئی بیل' ٹھنڈے فرش پر ستیل پاٹیاں ایک دیوار کے سہارے سے غلاف میں ملفوف طنبورہ رکھا ہے۔ کمروں کے اونچے اونچے دہرے دروازے ہیں جن پر جھلملیاں ہیں۔ چوڑی سیڑھیاں اونچی کرسی' بڑے سے گھاس کے سمندر میں یہ مکان ڈوبے ہوئے ہیں۔ چھتیں ڈاٹ کی ہیں۔ چھت کے اوپر چھوٹے چھوٹے اطالوی وضع کے ستونوں کے جنگلے ہیں۔ ایسے مکان سارے صوبے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ کس قدر استحکام ان کی بنیادوں میں ہوگا۔ برآمدوں کی سیڑھیوں پر کسی زمانے میں پنکھا قلی اونگھتے ہوں گے۔ بہرائچ میں' جہاں میں پیدا ہوا' میرا مکان بھی عین مین ایسا ہی تھا۔ میں مکانوں کی کتھا لے کر بیٹھ گیا۔ شانتا میں تفصیلات سے متاثر ہونے اور ان پر دھیان دینے کی عادت سے عاجز آ چکا ہوں مگر بتاؤ تو بھلا لوگوں نے مکان بنا رکھے ہیں اور ذرا ان کے نام تو سنو۔

نام بھی عجیب چیز ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر چمپا بیگم۔ اچھا نام ہے' ہے نا۔ کہو شانتا میری رائے سے اتفاق کرو' دیکھو تم اتنی دور ہو' تو میرا جی چاہتا ہے کہ ہر چیز میری آنکھوں سے دیکھو' میری ساتھ ساتھ رہو۔ جب نئے لوگوں سے ملتا ہوں تو سوچتا ہوں شانتا ہوتی تو فلاں کے لیے یہ کہتی' فلاں کو پسند کرتی' فلاں کا مذاق

اڑاتی۔ شانتا تم نے مجھے ڈانٹا بھی نہیں بہت دنوں سے' اب کیا میں تمہارے جذبہ مادری کو اپیل نہیں کرتا۔ بقول تمہارے بڑا ہو گیا ہوں۔؟ شانتا کاش تم یہاں ہوتیں اور ان سب سے ملتیں۔

بڑی دلچسپ بات یہ ہے کہ میں یہاں ایک قسم کے ان افیشیل بر دکھوے کے لیے بلایا گیا تھا۔ نرمل رانی جو بی۔ اے فرما رہی ہیں بجائے اس کے کہ روایتی لڑکیوں کی طرح کچھ شرماتیں ہارمونیم پر ان سے گانا سنوایا جاتا' انہوں نے مطلق شرما کر نہیں دیا نہ شاید انہیں علم ہے کہ خاندان والے ان سے میرا رشتہ طے کرنا چاہتے ہیں۔ بہر حال' انہوں نے مجھے میں کسی دلچپی کا اظہار نہیں کیا۔ ان کو باتوں ہی سے فرصت نہیں۔ ان کے بہت زبردست پروگرام ہیں' ڈاکٹریٹ کریں گی۔ نرملا اور طلعت دونوں انتہائی تیز ذہین لڑکیاں ہیں۔ خدا محفوظ رکھے' ہر وقت ٹرالی رہتی ہیں۔

''لکھ لی تقریر''

''نرملا نے برآمدے کے جنگلے کے نیچے سے اچک کر پوچھا۔''

''لکھ رہا ہوں۔''

''دکھلایئے۔''

''افواہ ______ بھئی اصل میں تقریر نہیں لکھی ایک ضروری خط لکھنا تھا وہ شروع کر دیا۔''

''یہ خط و کتابت کا کون وقت ہے۔ میں کہتی ہوں۔''

نہ وہ چین سے نکلے نہ جاپان سے نکلے

نہ ایران سے نکلے نہ انگلستان سے نکلے
محمد مصطفیٰ نکلے تو عربستان نکلے

محمد مصطفیٰ

کمرے میں سب نے مل کر اپنی پسندیدہ قوالی شروع کر رکھی تھی۔

"چلئے چل کر قوالی گائیے۔" نرملا نے دوسرا حکم لگایا۔

گویا سنگھاڑے والی کوٹھی میں آ کر "نہ وہ چین سے نکلے" گانا اس قدر اہم اور ضرور چیز تھی۔ گویا اس کی زندگی کا نصب العین ہی صرف یہ تھا کہ وہ نہ چین سے نکلے' گائے۔ اس نے نرملا کو اداسی سے دیکھا۔ بیوقوف لڑکی کس قدر خوش ہے۔

"چلو نرمل میں آتا ہوں' مگر ایک شرط پر۔"

"وہ کیا ______"

"اپنے بھیا صاحب سے ملواؤ"

عین اسی وقت اس نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ برساتی سیڑھیوں پر بھیا صاحب کھڑے تھے، گھبرائے ہوئے مسکرا رہے تھے۔ ان کا خیر مقدم کرنے کے لیے سب برآمدے میں آ گئے۔

"بڑے نروس طبعیت کے آدمی جان پڑتے ہیں" گوتم نے آہستہ سے کہا۔

"لڑکیوں سے گھبرا جاتے ہیں بے چارے۔ بڑے شریف آدمی ہیں۔" نرملا نے جواب دیا۔

"شریف آدمی ہیں تو ہم سب کیا لفنگے ہیں ______ واہ واہ۔" ہری شنکر نے احتجاج کیا۔

''ان کے لاشعور میں کوئی پیچیدہ گی ہے۔'' گوتم نے دوسرا اعلان کیا۔ ہری شنکر نے اسے مکا دکھایا۔

بھیا صاحب مجمعے پر نظر ڈال کر چمپا کی طرف چلے گئے۔ چمپا نے کرسی چھوڑ دی اور فرش پر بیٹھ کر ان کے لیے چاء بنانے لگیں۔

''یہ سلسلہ بھی ہے۔'' گوتم نے دفعتاً بور ہو کر پہلی بار سنجید گی سے کہا۔

''بھیا صاحب ناچتے بہت اچھا ہیں۔'' نرملا نے موقعے کو سنبھالنا چاہا' یہ تینوں باقی مجمعے سے الگ برآمدے کی سیڑھیوں پر جا بیٹھے تھے۔

''لاک ناچ یا کلاسیکل۔'' گوتم نے دلچسپی سے پوچھا۔

''اولڈ والز کے استاد ہیں۔'' نرملا نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

''تب میں ان کو معاف کر سکتا ہوں۔'' گوتم نے سر ہلا کر کہا، میں بہت کچھ معاف کر دیتا ہوں' میرا بہت بڑا دل ہے۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

اندر کوئی اور بحث چھڑ گئی تھی۔ ہری شنکر زور زور سے غل مچا رہا تھا۔

''افوہ تم لوگ کس قدر کی ٹر لگاتے ہو۔'' گوتم نے ایک آنکھ کھول کر کہا۔

''زندگی مختلف ادوار میں تقسیم ہے۔'' کمال نے گوہر افشانی کی۔

''خوب یعنی؟''

''یہ محض باتوں کا دور ہے۔''

''پھر عمل اور تخلیق کا دور کب آئے گا؟''

''میاں جب سے دنیا بنی ہے اگر پیغمبروں اور فلسفیوں اور سوچنے والوں نے باتیں نہ کی ہوتیں تو آج دنیا کی لائبریریوں میں گدھے لوٹ رہے

ہوتے ____ شکر کرو کہ ہم باتیں کرتے ہیں تم سنتے ہو۔ایک سے ایسا آنے والا ہے۔ جب تمہارے کان ہماری آواز سننے کو ترس جائیں گے۔'' کمال نے کہا۔

''تم وقت کی ہلاکت خیز کے قائل ہو؟''

''ہاں''

سورج ندی میں ڈوب رہا تھا اور چھتر منزل کے سنہری گنبد کرنوں میں نارنجی نظر آرہے تھے۔سامنے لہروں پر سے ایک کشتی سکون سے گزر گئی۔

''تم علامتوں کی رمزیت کے قائل ہو۔'' معاً گوتم نے کمال سے پوچھا۔

''ہاں''

''یہ سامنے جو ناؤ جارہی ہے یہ بڑی رمزیت کی حامل ہے۔'' گوتم معمولی سی بات کو بےحد ڈرامائی اور فلسفیانہ رنگ میں ادا کرتا تھا اور اس کا یہ انداز لوگوں کو بہت اچھا لگتا۔ہری شنکر بھی اس کے پاس آن بیٹھا۔

وہ سیڑھیوں پر جا کر کھڑے ہوئے جو ندی میں اترتی تھیں۔

دریا بہتا ہوا وقت ہے۔ پتھر Timeless become کی علامت ہے۔پتھر وقت کی منجمد شکل ہیں اور کائنات کا خاتمہ چوہے کی موت کی طرح یقینی ہے اور اتنا ہی غیر اہم ____ ویدانت لکھا ہے کہ۔

''یہ ندی ہماری زندگیوں کا سمبل ہے۔'' ہری شنکر نے آپنے آپ سے کہا۔

''مجھے دریاؤں سے عشق ہے' تم کو دریاؤں سے عشق ہے؟'' اس نے مڑ کر کمال سے بےحد سنجیدگی کے ساتھ پوچھا۔

''ہاں۔''

''میں ندی کے پانی کے پانی میں ڈوب کر مروں گا۔'' گوتم نے دوسرا اناؤنسمنٹ کیا۔

''گوتم! تم کیا پیٹی بورژوا اور رومان پرست ہوتے جا رہے ہو۔'' ان کے نزدیک آ کر اکڑوں بیٹھتے ہوئے طلعت نے تشویش سے دریافت کیا۔

''نہیں۔'' وہ چونک اٹھا۔ ''یہ وقت کا سحر ہے طلعت آرا بیگم۔'' اس نے انگلی ہوا میں لہرا کر جواب دیا ______ ''تم وقت کی طاقت نہیں جانتیں۔''

پل کے پار بہت دور سے نوبت بجنے کی آواز آ رہی تھی۔ شام کے سناٹے میں وہ چپ چاپ یہ آواز سنتے رہے۔

''آؤ بھوتوں کو ڈھونڈیں''

''آؤ۔''

وہ چاروں لان پر واپس آئے۔

''چمپا بیگم' بھیا صاحب' اپی۔'' گوتم نے بڑے اخلاق سے جھک کر ان کو مخاطب کیا ______ آئیے ہم سب چل کر بھوتوں کو ڈھونڈیں۔

وہ خاموشی سے موٹر کی طرف بڑھے۔ جھٹ پٹا وقت تھا۔ موٹر اب کاٹھ کے پل پر سے گزر رہی تھی۔

''ایک موڑ ہوتا ہے جہاں سے انسان کبھی واپس نہیں آتا۔'' عامر رضا نے اپنے آپ سے کہا۔

کمال نے موٹر روک لی۔ ''آیئے ذرا لہروں کو گنیں۔'' وہ پل کے اونچے جنگلے

پر جھک گئے۔

ان کے نیچے ندی کی لہروں پر رنگ برنگے بجروں کا ایک جلوس گزر رہا تھا۔ان میں جو لوگ بیٹھے تھے انہوں نے عجیب لباس پہن رکھے تھے: مند یلیں، جواہرات، مالائیں، آب رواں کے دوپٹے، تلواں پائجامے۔جواہرات کی چھوٹ سے ندی کا پانی جگمگا اٹھا۔

ان لوگوں نے ہاتھ اٹھا اٹھا کر ان لوگوں کو بلانا شروع ان کی آوازیں ان کی سمجھ میں نہ آئی۔چڑیوں کی چہکار کی طرح سریلی، مبہم، سارنگی کی چیخ کی مانند تیز، سریلی، ڈراؤنی۔ساحل پر کتے اور گیدڑ چلا رہے تھے۔شمشان گھاٹ کی لکڑیاں چرچرا رہی تھیں۔قبروں کے تابوت کے تختے چیرے جا رہے تھے۔

''یہاں سے بھاگو______ چلو آگے چلیں۔'' چمپا نے کہا، اسے لگا جیسے اس کی اپنی آواز گہرے پانیوں میں سے آ رہی ہے۔

''ان آوازوں سے بھاگ کر کہاں جاؤ گی؟ یہ آخری آوازیں ہیں۔'' گوتم نے جواب دیا لکڑیاں چرچرایا کیں۔

''میرا سر چکرا رہا ہے، مجھے بھوتوں سے بچاؤ۔'' عامر رضا نے پل کے جنگلے پر سر رکھ دیا۔چمپا اس کے پاس کھڑی تھی۔

''خوبصورت آدمی، اگر میں تمہارے دل کو جان سکتی۔''

''تم نہیں جانو گی۔مجھے کوئی نہیں جانے گا۔'' عامر رضا نے جواب دیا۔

موٹر پھر ایک دھچکے سے اسٹارٹ ہوئی۔کمال نے گانا شروع کر دیا تھا۔چاندنی کی روشنی ایک دم بہت تیز ہوئی۔اس میں ان سب کے چہرے دھلے

ہوئے سفید نظر آرہے تھے۔

''ہل ______ ہر طرف پل بنا رکھے ہیں۔'' گوتم غصے سے بڑبڑایا۔

''وہ سکندر باغ کی سڑک پر آ گئے۔ قریب سے ایک مغرق ہاتھی جھومتا ہوا گزرا۔ اس پر شاہ زمن غازی الدین حیدر سوار تھے۔ چمپا نے ان کی شکل کو غور سے دیکھا اور وہ بڑے مسخرے نظر آئے۔'' ان سے ہاؤ ڈو یو ڈو ہی کر لو کم از کم۔''

''یہ تو بڑے انگریز مشہور ہیں۔ دیکھو کیا ولایتی بادشاہوں والا جوڑا پہن رکھا ہے۔'' کمال نے کہا۔

شاہ زمن ہودے میں سر جھکائے بیٹھے بیٹھے رہے۔ موٹر پھر آگے نکل گئی۔ سب چپ چاپ تھے۔ گوتم اپنے پائپ کو ٹھونکتا بجاتا رہا' اگر مجھے کوئی یہ بتالا دے کہ یہ لوگ کیا سوچ رہے ہیں تو میں اس کو یہ بڑا انعام دوں۔ چمپا نے پھر اپنے آپ سے کہا۔ گھنٹوں میں نے ان سے دلیلیں چھانٹیں پر مجھے کبھی معلوم نہ ہوا کہ یہ لوگ چاہتے کیا ہیں ______ گروہ کی سنگت بیکار ہے۔ تنہائی اصل حقیقت ہے۔

کمال نے دفعتاً کار روک لی۔ سامنے لا رمارٹینئر کالج تھا۔

''یہاں انہوں نے مجھے کیا کیا نہیں پڑھایا۔''

مال اور حامر رضا اور رہری شنکر نے انگلیاں اٹھا کر یک زبان ہو کر کہا۔ ''تم اتنا پڑھتے کیوں ہو؟'' انہوں نے پلٹ کر گوتم سے سوال کیا۔

''یہ عجیب بگڑے دل ہیں۔ ان کو سمجھانا بیکار ہے۔'' طلعت نے کہا۔ گوتم چپکا رہا۔

وہ سب اتر کر عمارت کے قریب گئے اور کھڑکیوں میں سے اندر جھانکنے لگے۔ اندر کمرے اندھیرے اور سنسان پڑے تھے۔ صبح کو ان میں پھر پڑھائی ہو گی۔ چھتوں پر بنے ہوئے اطالوی Bas-relief کے گلابی، سبز اور نیلے رنگ نیم تاریکی میں جھلملا رہے تھے۔ دیوار پر زوفنی کا بنایا ہوا جنرل مارٹن کی ہندوستانی بیگم کا پورٹریٹ آویزاں تھا۔ طلعت کھڑکی کے شیشے سے ناک چپکائے کھڑی رہی۔ باقی لوگ سر جھکائے جھیل کی اور چلے گئے۔

''آؤ ــــــ ادھر آؤ ــــــ میرے قریب'' طلعت نے مڑ کر دیکھا۔ جنرل مارٹن کی ہندوستانی بیگم جھیل کے کنارے کھڑی تھی، اس نے اشارہ کر کے ان کو پھر بلایا۔

''مجھ سے باتیں کرو'' اس نے کہا۔ ''مجھ سے کوئی باتیں نہیں کرتا۔ دن بھر یہاں اتنا بڑا ہنگامہ رہتا ہے۔ کتابیں پڑھی جاتی ہیں۔ لیکچر ہوتے ہیں۔ میری طرف کوئی پلٹ کر دیکھتا بھی نہیں۔'' وہ سوں سوں کر کے رونے لگی۔ طلعت بڑی گھبرائی کہ اس کو کس طرح چپ کرایا جائے۔ ''سنو میری بات'' طلعت نے سمجھانے کی سعی کی۔ ''تم ابدیت کے نقطے پر دھیان دیا کرو ــــ وقت کے مختلف ٹکڑے دراصل ــــــ''

''وعدہ کرو کہ کبھی نہیں پڑھو گے؟ ــــــــ'' کمال اونچی آواز میں گوتم سے کہہ رہا تھا۔

''یہاں سے ہمارا ایک انگریز پروفیسر کتابیں چھوڑ کر ہمالیہ نکل بھاگا تھا، وہ اب بھی وہیں زندہ ہے یا اسے کسی شیر نے کھالیا یا چڑیوں نے اسے کی داڑھی میں

گھونسلے بنا لیے ہوں اور وہ کسی کھوہ میں بیٹھا رومنی کی موسیقی سنتا ہوگا۔'' ہری شنکر نے کہا۔

''اوم۔اوم۔اوم'' یہ آواز اب سارے میں گونج رہی تھی۔فضائیں اس آواز سے لرز اٹھیں۔ہری۔ہری۔ہری۔وہ جھیل کو پیچھے چھوڑ کر سرخ بجری والے راستے پر چلنے لگے۔چمپا نے ہاتھ بڑھا کر پھولوں کی ایک ٹہنی کو چھوا' ایک پتا ٹوٹ کر راستے پر آن گرا۔

''شنو' جو پتے کے گرنے میں نہاں ہے۔ہری۔ہری۔'' چمپا نے دہرایا۔

تہ خانے میں جنرل مارٹن پڑا سوتا ہے' اس کے اوپر سے دنیا گزرتی جا رہی ہے۔

لائبریری کی چھت پر سے ایک اکیلا چنڈول اڑتا ہوا نکل گیا۔کتابوں کے الفاظ جلوس بنا کر چاروں اور پھیل گئے۔لاطینی' فرانسیسی' انگریزی۔ بے معنی الفاظ۔ان کے معنی اگیا بیتال کی مانند منہ چڑا رہے تھے۔بہت سے الفاظ ٹیرس پر رکھی ہوئی توپ پر چڑھ کر بیٹھ گئے اور اپنی پتلی پتلی' کالی کالی ٹانگیں ہلانے لگے۔ توپ نے گرج کر اطلاع دی' میرا نام' لارڈ کارنوالس' رکھا گیا تھا اور میں سرنگا پٹم میں استعمال کی گئی تھی۔'' ٹیرس پر بیٹھے ہوئے پتھر کے شیر اور اوپر چھت کی منڈیر پر ایستادہ مجسمے زور زور سے قہقہے لگانے لگے' پھر طاعت کسی بات پر کھلکھلا کر ہنسی۔آؤ دلکشا چل کر پدمنی اچاریہ کے یہاں کافی پئیں۔سوتی ہوئی معطر سڑکوں پر سے گزر کر وہ دلکشا کی طرف بڑھے۔

کچھ دیر بعد کمال' جو راستے میں سے کہیں غائب ہوگیا تھا' ان سے آن ملا' وہ

سب دلکشا کے پھاٹک میں داخل ہوئے۔

"تم کہاں چلے گئے تھے۔" گوتم نے غصے سے پوچھا۔

"میں نے سنا تھا کہ بادشاہ غازی الدین حیدر کے یہاں بسنت کا تہوار بہت دھوم سے منایا جاتا ہے' اسی کی سیر دیکھنے چلا گیا تھا۔ فرح بخش میں عجب منظر تھا۔ ایک طرف ڈاکٹر مکلوڈ بیٹھے فارسی میں گفتگو کر رہے تھے۔ کمرے کے ایک کونے میں ایک انگریز تپائی پر بیٹھا بیگ پائپ بجا رہا تھا۔ پھر رجب علی فضل علی قوال نے بسنت کا خیال چھیڑا۔ برآمدے میں انگریزی بینڈ بج رہا تھا' پھر لندن کے بادشاہ کا جام صحت پیا گیا۔ بادشاہ کو انجینئرنگ کی دھت ہے۔ دنیا بھر کی مشینیں الم غلم جمع کر رکھی ہیں۔ ایک وہ طامس ڈینہم ان کو فنٹی چڑھاتا رہتا ہے۔ لیکے ایک اسٹیمر گومتی میں چھوڑ دیا۔ رابرٹ ہوم آرٹسٹ ایک صحنچی میں بیٹھا تصویر بنا رہا تھا۔ بشپ ہیبر بھی موجود تھے۔ مجھے دیکھ کر چھوٹتے ہی تبلیغ کرنے لگے۔ زینے کے سرے پر کھڑے بادشاہ انگریز مہمانوں کا استقبال کر رہے تھے' پھر وہ سب کو اپنی پکچر گیلری میں لے گئے۔ کھانا میز پر خالص انگریزی فیشن کا پیش کیا گیا۔ دربار میں بڑی انگریزیت ہے بھئی۔ میرا تو دم بولا گیا ______ پھر جب میں فرح بخش سے واپس آرہا تھا تو راہ میں صاحب ریذیڈنٹ ہے بھئی۔ میرا تو دم بولا گیا ______ پھر جب میں فرح بخش سے واپس آرہا تھا تو رراہ میں صاحب ریذیڈنٹ بہادر جوڑی دار پگڑی سر پیچ گوشوارے پہنے' ہندوستانی جامے میں ملبوس' جھالر دار پالکی میں بیٹھے چلے جاتے تھے۔ میں نے پوچھا: کہاں تشریف لیے جاتے ہیں؟ کہاں: بادشاہ کا جلوس ہے۔ کورونیشن ______ میں نے پوچھا: کون سے بادشاہ

کا؟ ایک کے دربارے تو میں ابھی آ رہا ہوں' بولے: وہ تو مر گئے ان کے بیٹے نصیر الدین حیدر اب تخت پر بیٹھے ہیں' عجب تماشا ہے۔ یار ہری شنکر یہ بادشاہ لوگ مر بھی جاتے ہیں ــــــ'' وہ خاموش ہو گیا۔

اب وہ سب دلکشا کے باغات میں داخل ہو چکے تھے۔ سارے میں پورنماشی کا اجالا سائیں سائیں کر رہا تھا۔ دور درختوں میں چھپی ایک پیلے رنگ کی کوٹھی تھی جس میں اندھیرا پڑا تھا۔ لان پر ایک مور سو رہا تھا۔ سامنے بڑے گھنے درخت کے نیچے بہت سے ڈبے اور کاغذ بکھرے پڑے تھے۔ آج یہاں چاند باغ کی بابا لوگ پکنک منانے آئی تھیں۔ مالی نے کہا۔ انہوں نے کوٹھی کے برآمدے میں جا کر پدمنی آ جا زدی' وہ اور اس کا میاں باہر آئے۔ ہلو۔ انہوں نے مسکرا کر کہا۔

''کافی بناؤ۔'' کمال نے حکم چلایا۔

کوٹھی کے پیچھے انگریز فوجیوں کی قبریں تھیں جو سنہ ستاون میں یہاں کھیت رہے' وہاں جھاڑیوں میں گھس کر انہوں نے پچیسویں مرتبہ ان کے کتبے پڑھے۔ لفٹنٹ پال' فورتھ پنجاب رائفلز۔ نوجوان کیپٹن مک ڈاہلڈ' ۹۳ ہائی لینڈرز۔ لفٹنٹ چارلی' ڈیش ووڈ۔

''ہلو ــــ ہاؤ ڈو یو ڈو ــــــــ'' ان تینوں نے سامنے آ کر بشاشت سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھائے۔

''ہلو چارلی۔ لو پائپ پیو۔'' گوتم نے ان کو تمباکو پیش کیا۔

پھر نواب قدسیہ محل نے چنبیلی کی جھاڑ میں سے نکل کر کہا: ''اگر کوئی مجھے دل کا چین دلا دے تو میں اسے اپنی پوری سلطنت بخش دوں۔''

''میں نے اکثر سوچا کہ تم نے زہر کیوں کھایا تھا۔''چمپا نے نواب قدسیہ محل سے اس طرح بے تکلفی سے بات کی گویا وہ بھی کالج کی ہم جماعت لڑکی تھی۔ لڑکیاں سب ایک دوسرے کو جانتی ہیں۔ چوبیس سالہ اور خوبصورت ملکہ اودھ نزاکت سے اپنے پائنچے سمیٹ کر ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔ باقی سب لوگ ٹہلتے ہوئے دلکشا محل کے عظیم الشان کھنڈر کی طرح چلے گئے۔

''ایک روز یہاں ایک فرانسیسی اپنا غبارہ اڑانے لایا تھا۔ بڑی خلقت جمع ہوئی۔ میرے سسرے شاہ زمن بھی تماشا دیکھنے آئے تھے۔ دیکھو اتنا مزا آیا کہ یہ فرانسیسی غبارے میں اڑی ہو؟''ملکہ نے چمپا سے پوچھا۔

''نہیں مگر تم نے زہر کیوں کھایا تھا؟''چمپا نے مصر رہی۔ صاف ظاہر تھا کہ ملکہ بات ٹال رہی تھی' وہ اپنی آرسی کو غور سے دیکھا کی۔

''تم تو بڑی سخی مشہور تھیں' تم سے زیادہ فیاض اور نیک دل بیگم لکھنو کے تخت پر نہیں بیٹھی۔ لاکھوں روپے تم نے غریبوں کو بخش دیے۔ تم مجھے بتاؤ۔ کہ اس سخاوت اور محبت کے بدلے میں دنیا نے تم کو کیا دیا_____ اللہ بتاؤ نا بھئی۔''

''جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے۔''ملکہ بے دھیانی سے گنگنا رہی تھی۔''یہ میرے بادشاہ کا مصرع ہے۔''اس نے چمپا کو مخاطب کیا۔''تم کو شعر پسند ہیں؟''

باغ بسنت کے سارے پھولوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا جیسے گندھیوں نے عطر کی ہزاروں شیشیاں انڈیل دی ہوں۔

''برکھا رت تھی اور تم دلکشا محل میں تفریح کے لیے آئیں' اور چونکہ بادشاہ تم سے ناراض تھے' تم نے لے کے سنکھیا پھانک لی_____ ذرا بتاؤ تو اس کا کیا مطلب

ہے ____ کیا مرد اس لائق ہوتے ہیں کہ ان کے لیے انسان جان پر کھیل جائے۔ان کی تو اتی سی بھی پرواہ نہیں کرنا چاہیے____اتی سی بھی_____ ''چمپا نے انگلی پر انگلی رکھ کے بتایا۔

قدسیہ محل نے کوئی جواب نہ دیا۔

''اے لو____وہ راجہ غالب جنگ چلے آتے ہیں۔آج پورنماشی ہے نا۔ بادشاہ یہاں تفریح کے لیے آتے ہوں گے۔مجھے دیکھا تو پھر خفا ہو جائیں گے۔ میں اب چل دوں۔''

''کہاں جاتی ہو_____؟''چمپا نے گھبرا کر پوچھا۔

''کہیں نہیں۔ہم سب یہیں موجود ہیں۔ہم اور تم الگ الگ کہاں ہیں؟ بلکہ اب تم بھی چلی جاؤ۔تمہارے اس وقت کے ساتھی تم کو بلاتے ہیں۔''

''چمپا_____باجی چمپا باجی____ ''رات کے سناٹے میں کمال کی آواز سنائی دی'وہ پتھر سے اٹھ کر دل کشا محل کی طرف چل پڑی۔کھنڈر کی سب سے اونچی سیڑھی پر کرنل اچاریہ بیٹھے گٹار بجا رہے تھے'سب لوگ آس پاس بیٹھے تھے۔

''لڑکیو'چلو کافی تیار ہے۔''پدمنی نے پکار کر کہا۔اندر کھنڈر کے ایوانوں میں نصیر الدین حیدر کے حرم کی انگیز بیگمات'بڑے بڑے جھالر دار سائے پہنے'کہنیوں کے بل بیٹھی بڑی محویت سے گٹار سن رہی تھیں۔پھر ان بیگمات نے مل کر پولکا شروع کر دیا'وہ سب سیڑھیاں اتر کر پدمنی کی کوٹھی کی طرف چلے گئے۔

چمپا پھر تنہا رہ گئی۔

''مادموزیل_____وزریت تری شارماں_____مادموزیل۔''اس نے

مڑ کر دیکھا۔ بادشاہ نصیر الدین حیدر کا فرنچ حجام سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ بڑے شولرس انداز میں اس نے اپنا جھالردار رومال نکال کر پتھر پر بچھایا اور دوزانو جھک کر اس سے کہا: ''تشریف رکھیے۔''

چمپا ٹکٹکی باندھے سامنے دیکھتی رہی۔

''مادموزیل ____ اپنے حسن پر جی بھر کے نازاں ہو لیجئے۔ جی بھر کر خوش رہیے۔ غم بیکار ہیں۔ آیئے میں آپ کو مردعورتوں کا گیت سناتا ہوں۔'' اس نے ایک جھنکار کے ساتھ گٹار بجانا شروع کر دیا جو کرنل اچاریہ وہیں بھول گئے تھے۔

مردہ عورتوں کا بیلڈ:

''مجھے بتاؤ کہ لیڈی فلورا اور خوبصورت ہائی پلیشیا''

اور تائیس کہاں چھپ گئیں؟

جون کہاں گئی جسے انگریزوں نے جلایا تھا؟

مادر خداوند ____ ان سب کا کیا ہوا؟

''لیکن ____ پچھلے برسوں کی برف کس نے دیکھی ہے!!''

''مادموزیل' یاد رکھیے' خوبصورت عورتیں دو مرتبہ مرتی ہیں۔ حسن پر نازاں ہو جیئے دولت اور شہرت اور عزت پر نازاں ہو جیئے۔ وقت بہت کم ہے' بہت جلد یہ سب آپ کے پاس سے چلا جائیگا۔ میری سنئے۔ میں پیرس کا حجام۔ میں نے بادشاہ کی ایسی حجامت بنائی کہ پورے چوبیس لاکھ روپے سے اپنا گھر بھر لیا۔ سارے لکھنو پر میری حکومت تھی۔ بادشاہ میرے تابع تھے۔ ملک کا اصل حاکم میں تھا اور اب کسی کو میرا نام بھی یاد نہیں۔'' اس نے اپنے ساٹن کے جوتوں کو اداسی سے

دیکھا اس کے خوبصورت چہرے سے پاؤڈر کی خوشبو آ رہی تھی۔

چمپا سیڑھیاں اترنے لگی۔ "یہ گٹار لیتی جائے ____ کرنل اسے یہیں چھوڑ گئے۔ اب میں جا کر کہیں اور مینڈ لاؤں گا۔ بون نوئی مادموزیل۔" اس نے جھک کر بڑے اسٹائل سے کہا۔

پدمنی کے لان پر بیٹھ کر کافی پینے کے بعد وہ موٹر کی طرف بڑھے۔ دور کھنڈر پر چمگاڈریں اپنے پر پھیلا رہی تھیں۔ ذرا فاصلے پر گومتی بہہ رہی تھی جس کے نزدیک مرگھٹ تھا۔ میلوں پھیلے ہوئے باغ کے چاروں طرف چھاؤنی کی خوبصورت کوٹھیاں تھیں۔ ذرا دور پر دل کشا کلب میں ناچ ہو رہا تھا۔ "آؤ چھتر منزل چل کرنا چیں۔" کمال نے تجویز کیا۔

"آج تم لوگ کیا رت جگا منانے نکلے ہو۔" پدمنی نے ہنس کر کہا۔

"ہاں۔ ایسی خوبصورت رات کو سو کر برباد کیا جائے؟" ہری شنکر نے جواب دیا۔ "تم بھی چلو۔"

وہ پھاٹک سے نکل کر کاسلز روڈ پر آ گئے۔ کنگ غازی الدین حیدر کی نہر پر سے گزرتے وہ حضرت گنج میں داخل ہوئے، پھر قیصر باغ کی طرف مڑ گئے۔

سامنے چاندی والی بارہ دری روشنی سے جھک جھک کر رہی تھی۔

"ارے آج تو یہاں بسنت کا میلہ ہے۔" طلعت نے خوش ہو کر کہا۔

"آج معلوم ہوتا ہے سلطان عالم اوپیرا بھی کر رہے ہیں۔" نرملا نے کہا۔ "چلیں اندر ____؟"

"کیسے چلیں۔ ہمیں مدعو تو کیا نہیں گیا ہے۔" کمال نے تذبذب کے ساتھ

کہا۔

"چلے چلو۔ چوبداروں کے پیچھے چھپ کر کھڑے ہو جائیں گے۔" شنکر نے جواب دیا۔

وہ چپکے سے عمارت میں داخل ہو گئے۔ اندر بارہ دری کا چاندی کا فرش جھل جھل کر رہا۔ اسٹیج پر راجہ اندر کے دربار کے ستونوں پر چاندی چڑھی ہوئی تھی۔ ہر طرف آئینے جھلملا رہے تھے ___ پکھراج پری گا رہی تھی:

رت آئی بسنت بہار
کھلے جرد پھوئیرون کے ہار
ہر کے دوار مالی کا چھورا
گر اڈارت گیندن کے ہار

وہ سب پنجوں کے بل چلتے اسٹیج کے پیچھے آن کھڑے ہوئے۔ طاعت نے چپکے چپکے ساتھ ساتھ گنگنانا شروع کر دیا۔

پھر دھن بدلی۔ اب پکھراج پری نے اپنی غزل شروع کی:

ہے جلوۂ تن سے در و دیوار بسنتی
پوشاک جو پہنے ہے مرا یار بسنتی
کیا فصل بہاری نے شگوفے ہیں کھلائے
معشوق ہیں پھرتے سر بازر بسنتی

ہال میں واہ واہ کے ڈونگڑے برسنے لگے، یہ سب چپکے سے ادھر سے نکل کر ایک دروازے میں آ گئے۔ سامنے علی نقی وزیر اعظم بیٹھے تھے۔ انہوں نے ان

سب کو دیکھا نہیں۔

پکھراج پری گائے جا رہی تھی:

موتی کانوں میں نہیں یار کی زلفوں کے قریں

جھالے بھادوں کے وہ ہیں اور یہ گھٹا ساون کی

او پیرا ہوتا رہا۔ یہ لوگ مجمع میں رل مل کر ادھر ادھر گھومتے رہے۔ ان سب کو روشندان میں سے جھانکتا دیکھ کر سبز پری نے، جو سنگھار کمرے میں کھڑی اسٹیج پر جانے کی تیاری کر رہی تھی، گھبرا کر کالے دیو سے کہا: "ادھر نظر ڈالو ______ آنے والے وقتوں کے بھوت ہمیں گھور رہے ہیں۔"

کمال نے ایک چوبدار سے پوچھا: "سبز پری کون ہے۔"

"ارے اس کو نہیں جانتے خداوند ______ چمپا بائی۔ شاہ زمن غازی الدین حیدر کے زمانے سے ان کی کمان چڑھی ہوئی ہے۔ چالیس کے پیٹے میں آ گئیں مگر وہی آن بان، وہی شان ہے۔ کیا قیامت کی چھب ہے کہ صلی علیٰ۔ ان سے بہتر سبز پری کا سوانگ اور کوئی نہیں بھر سکتا۔ اللہ نے گلے میں نور اتار دیا ہے۔ کیا گاتی ہیں۔ کیا آپ لکھنو کے باشندے نہیں؟" کمال جلدی سے وہاں سے ہٹ گیا۔

اتنے میں کالے دیو کی گرجدار آواز آئی:

لایا شہزادے کو میں جا کر ہندوستان

تو اپنے معشوق کو سبز پری پہچان

تو اپنے معشوق کو۔۔

اب شہزادہ گلفام اسٹیج پر آ چکا تھا۔ اس نے لہک کر گایا:

محلوں میں رہتا ہوں میں، عیش ہے میرا کام
شہزادہ ہوں ہند کا، نام مرا گلفام

پھر اس نے بڑی دلدوز آواز میں کہا:

صبح ہوتی ہے مری جان کوئی آن کے بیچ
بھیرویں مجھ کو سنا چل کے پرستان کے بیچ

وہ لوگ بارہ دری سے باہر آ گئے۔ اندر سے شاہزادے کی آواز آ رہی تھی:

اڑ کے تو جائے گی اک پل میں پرستان کے بیچ
ہاتھ پھیلا کے میں رہ جاؤں گا ارمان کے بیچ

باہر جل پریوں کا پھاٹک، چینی باغ، جلو خانہ ______ سب جگہیں روشنی سے بقعہ نور بنی ہوئی تھیں۔ کنج میں سری کرشن کا رہس ہو رہا تھا۔ جان عالم گیروا کپڑے پہنے، دھونی رمائے، ایک درخت کے نیچے بیٹھے تھے۔ میلے والے، شہر کے باشندے سب گیروا جوڑ پہنے تھے۔ درگا پرشاد کتھک مولسری کے سائے میں پھول کی تھالی کے کنارے پر ناچ ناچ کر بھاؤ بتا رہا تھا۔ فواروں سے معطر پانی ابل رہا تھا۔ باغ کی نشستیں سنہرے اور نقرئی روغن سے چمک رہی تھیں۔ ہر طرف پھول ہی پھول تھے۔

بارہ دری سے جوگن کی بھیرویں کی تانیں بلند ہو رہی تھیں:

تارکشی دوپٹہ تو اوڑھے کرن جو ٹانک کے
ہو شب ماہتاب میں کیا ہی صنم جھلا جھلی

آئی، بہار ساقیا! جام شراب دے پلا
پھول کھلے، پھلے شجر، ابر اٹھا، ہوا چلی
بہکے زمین شعر میں پاؤں امانت اپنا کیا
جب ہوئی لغزش اک ذرا، نکلا زبان سے یاعلی

جوگن کی آواز رفتہ رفتہ چاندنی میں ڈوبتی گئی۔

یہ لوگ میلے والے کے ہجوم سے نکل کر پھر سڑک پر آ گئے۔ موٹر میں بیٹھ کر نواب سعادت علی خاں کے مقبرے سے آگے نکلے۔ جدھر روشن الدولہ کی سرخ رنگ کی عمارات تھیں سڑک کے اس پار چھتر منزل کے محلات نیم تاریکی میں استادہ تھے۔ اندر والٹس کی آوازیں آ رہی تھیں۔ موٹروں کی قطاریں کھڑی تھیں۔ پھاٹک کے اندر جا کر انہوں نے کار روکی۔ لکھنو کا اعلیٰ فیشن ایبل طبقہ سیٹر ڈے نائٹ منا رہا تھا۔

''آج شاید گورنر بھی آیا ہوا ہے۔ ابھی ایک اے۔ ڈی۔ سی کو میں نے اندر جاتے دیکھا'' ہری شنکر نے اظہار خیال کیا۔

''کون والا اے۔ ڈی۔ سی، وہی سی جو اطالوی جگلو معلوم ہوتا ہے۔'' طلعت نے بے دھیانی سے پوچھا۔

''بکومت ______ تم ہر ایک پر اعتراض کرنے کو تیار ______ سی ہے تو ہوا کرے، تم سے مطلب؟'' کمال نے ڈانٹا۔

وہ اندر جا کر لاؤنج میں بیٹھ گئے۔ عامر رضا نے مشروبات کا آرڈر دیا۔ مس ایڈن نے لکھا تھا: ''الف لیلیٰ کی زبیدہ نے اپنے نشاط باغ کو خلیفہ کے تصویر

خانے سے ہارنے کی شرط بدی تھی، وہ نشاط باغ مجھے یقین ہے یہی رہا ہوگا۔'' کمال اکتاہٹ کے ساتھ ستونوں کے نارنجی نقش ونگار دیکھتا رہا۔

فلور پر مشہور نام تیر رہے تھے جو 'اون لکر' میں چھپتے تھے اور گرمیوں میں مسوری، نینی تال، شملے اور دارجلنگ میں جگمگاتے تھے۔

''ان کا بھی ایک زمانہ ہے۔'' گوتم نے آہستہ سے کہا۔

باہر سیڑھیوں کے نیچے گومتی آہستہ خرامی سے رواں تھی، وہ سب اٹھ کر باہر آ گئے۔ ٹیرس سنسان تھا۔ سیڑھیوں پر نصیرالدین حیدر شاہ بادشاہ ننگے پاؤں بیٹھے تھے، انہوں نے اپنا ایک جوتا لہروں میں پھینک دیا تھا، جب وہ ذرا بہتا ہوا دور نکل جاتا تو یہ تالی بجاتے تا کہ چوبدار آئے۔ جب کوئی چوبدار نہ آتا اور محض ہال روم کے قہقہوں کی آواز سنائی دیتی رہتی تو خود اٹھ کر پانی پر جھکتے اور جوتا نکال لیتے، تھوڑی دیر بعد دوسرا جوتا پانی میں پھینک دیتے، اسی طرح وہ بیٹھے اپنا دل بہلاتا رہے تھے۔ دیر تک یہی تماشا ہوتا رہا۔ آخر گوتم نے آگے بڑھ کر ان کو بھی سگریٹ پیش کیا۔

''نہیں۔ ہم مشکبو گڑگڑی پیتے ہیں۔ کوئی ہے۔''

''معاف کیجئے گا۔ ہم لوگ ہیں۔'' گوتم گھبرا کر کہا۔

''تم لوگ کون۔'' انہوں نے بے دماغ ہو کر پوچھا۔

''بس ہم ہی لوگ۔'' وہ خاموش ہو گئے۔

''ان کو یہیں چھوڑ دو ــــــ کیا کریں گے ہم ان کا۔ آؤ چلو۔ یہاں سے۔'' کمال نے چپکے سے گوتم سے کہا۔

نصیر الدین حیدر بادشاہ کو پانی کے کنارے تنہا اپنے جوتوں سے کھیلتا چھوڑ کر وہ پھر سڑک پر آئے اور پرانے شہر کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ یہاں کہارنیں اور پالکی برادر اور مہریاں اور یکے والے گھوم رہے تھے۔ سبزی فروش، بساطی، کمہار، شہر کی اصل آبادی، اصل اہل زبان، وہ میڈیکل کالج کے سامنے سے گزرے جس کے اندر انسان مر رہے تھے اور پیدا ہو رہے تھے۔ اس کے آگے گنجان پر اسرار شہر تھا۔ حویلیاں، پھاٹک، احاطے، چھتے، پیچ در پیچ تنگ و تاریک گلیاں جن کے اندر ایک دنیا آباد تھی، آصف الدولہ کا چوک، نخاس، اکبری دروازہ، سبزی منڈی، حسین آباد، گول دروازہ، کٹوریہ پارک، بڑا امام باڑہ، مچھی بھون، رومی دروازہ۔

آصف الدولہ کا لکھنو لکھنو کا دل، سڑکیں اور گلیاں اب سنسان پڑی تھیں۔ یکلخت بارش کی پھوار شروع ہوگئی۔ بہار کی بارش جو چند منٹ برس کر کھل گئی۔ آسمان پر سے اندر کے ایراوت ہاتھی کی طرح ایک بادل جھومتا ہوا نکل گیا۔ سامنے ایک بالا خانے پر روشنی ہو رہی تھی۔

''میرا ہمیشہ جی چاہا کہ اوپر جا کر کمرہ دیکھوں'' طلعت نے کہا۔

''ارے یہ تو تنویر کا مکان ہے جو ریڈیو اسٹیشن آتی ہے۔'' نرملا نے کہا' نیچے اس کی اسٹوڈی بیکر کھڑی تھی۔ ''اس کے پاس چلیں۔ بڑی پیاری لڑکی ہے بے چاری۔ سرمایہ دارانہ نظام کی شکار۔ چلو اس کے پاس چلیں۔'' طلعت نے مصر رہی۔

''بکومت۔'' چمپا نے ڈانٹا۔

''ارے بجیا' آپ کو تو اس طبقے کو سوشیولوجیکل نقطۂ نظر سے۔''

''بحث مت کرو۔ خاموش رہنا سیکھو۔'' گوتم اور کمال موٹر سے باہر اترے کھڑے تھے اور رات کی تازہ ہوا ناک میں داخل کر رہے تھے۔

دکانوں کے برآمدے میں سے ایک بوڑھا ہندو جامدانی کا انگرکھا پہنے لکڑی ٹیکتا گزرا۔ ان نوجوان لڑکوں کو ایک بالاخانے کے نیچے موٹر روکے کھڑا دیکھ کر اس نے آہستہ سے لاحول ولاقوۃ کہا اور آگے بڑھ گیا' پھر وہ لوہے کے پل پر سے گزرتے ڈالی گنج ہوتے فیض آباد روڈ پہنچے۔ سامنے چاند باغ تھا' دوسری طرف بادشاہ باغ۔

''آؤ پروفیسر بنرجی کے پاس چلیں۔'' انہوں نے نعرہ لگایا۔

وہ بادشاہ باغ کے شاہی پھاٹک میں داخل ہوئے جو کیلاش ہوسٹل کے پہلو میں کھلتا تھا۔ باغات یہاں بھی معطر تھے۔ نہر کے سرے پر سرخ بارہ دری چاندنی میں نہائی کھڑی تھی۔ ٹیگور لائبریری کی عظیم الشان جدید وضع کی عمارت پر سکوت' پر جلال نظر آ رہی تھی۔ الفاظ میں بڑی طاقت ہے _____ عمارت نے کہا_______ میرے اندر آؤ' میں تمہارے دکھ بھلا دوں گی۔

''الفاظ دکھ بھلاتے نہیں' دکھ اور گہرا کرتے ہیں۔'' گوتم نے جواب دیا۔

''خاموشی سب سے افضل ہے۔ اسی لیے لوگ منی ہو جاتے ہیں۔ خاموش رہے ہیں' ہری شنکر نے کہا۔''

''وہ نہر کے پل پر جا کر بیٹھ گئے۔ یونیورسٹی کی عمارات پر چاندنی برسا کی۔

نصیر الدین حیدر کا بادشاہ باغ۔

بے چارے نصیر الدین حیدر۔

پھر انہوں نے پروفیسروں کی کوٹھیوں کی طرف چلنا شروع کیا' دور درختوں میں چھپے ہوئے اپنے لان پر پروفیسر بنرجی خاموشی سے ٹہل رہے تھے۔

''یہ جانے مسائل کا حل کس طرح سوچ لیتے ہیں؟'' کمال نے منہ لٹکا کر کہا۔

''شب بخیر ــــــ پروفیسر ــــــ'' انہوں نے سڑک پر کھڑے ہو کر آہستہ سے کہا اور واپس آ گئے۔ یونیورسٹی کا سارا فاصلہ طے کرتے کواڈرینگل میں سے گزرتے وہ اس سڑک پر پہنچ گئے جو یونیورسٹی روڈ کے متوازن ٹہلتی ہوئی موتی محل برج پر جا نکلتی تھی۔ اس کے سرے پر رجسٹرار آفس تھا۔ سامنے کبوتر والی کوٹھی تھی جس میں وائس چانسلر رہتا تھا۔ برج پر آن کر انہوں نے ایک بار چاروں اور نظر ڈالی اور پھر کچے راستے پر اتر گئے جو سنگھاڑے والی کوٹھی طرف جاتا تھا۔

آدھی رات کا گجر بجا۔ گوتم نے ایک آنکھ کھول کر ندی کے بہتے پانی کو دیکھا' وہ سنگھاڑے والی کوٹھی کی سیڑھیوں پر برآمدے کے ستون سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا' چمپا' طاعت' نرملا اور تہمینہ دوسری سیڑھی پر موجود تھیں۔ کمال اور ہری شنکر اور عامر رضا پانی میں ٹانگیں لٹکائے ہوئے تھے۔ ندی بہہ رہی تھی۔ ندی کے سامنے دوسرے کنارے پر امام باڑہ نجف اشرف اور موتی محل اور چھتر منزل خاموش کھڑے تھے۔ کشتی سامنے سے گزر گئی۔

وقت کا سحر زائل ہو چکا تھا۔

صبح ہوتی ہے مری جان کوئی آن کے بیچ
بھیرویں مجھ کو سنا چل کے پرستان کے بیچ

گوتم نے آہستہ سے دہرایا۔

''افوہ ــــــ گوتم بھائی ــــــ تم تو اندر سبھا کے شعروں پر اتر آئے۔ کس قدر ڈیکیڈنٹ ہو!''طلعت کہہ رہی تھی۔

وہ انگڑائی لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''چلو یار اب محفل برخاست کی جائے۔ساری رات یہیں بیٹھے بیٹھے گزر دی ــــــ''کمال کی آواز آئی۔

وہ سب منتشر ہو کر اپنی اپنی نیندوں کی طرف روانہ ہو گئے۔

میں شانتا کا خط بھی مکمل نہ کر سکا۔گوتم نے اپنے جائے قیام کی طرف جاتے ہوئے اداسی سے سوچا۔

## ۵۱

پروفیسر بنرجی بین الاقوامی شہر کے مالک ماہر اقتصادیات تھے' ان کی کوٹھی پر بھی بڑی اداسی چھائی رہتی اور مکمل سکون۔ان کا گھر سچ مچ علم کا مسکن تھا۔ پرامن' خوبصورت اور خاموش۔سہ پہر کو اکثر لڑکے اور لڑکیاں سائیکلیں لیے ان کے گھر پہنچتے۔پروفیسر ان کو سیمل کے درخت کے نیچے کرسی بچھائے بیٹھے نظر آجاتے یا اندر چاء کی میز پر بیٹھے ہوتے اور کھانے کے کمرے کے خنک اندھیرے میں سائیڈ بورڈ پر رکھے چاندی کے برتن جھلملایا کرتے' اس وقت وہ اپنے شاگردوں سے بڑ اداس آواز میں باتیں کرتے۔پروفیسر کے یہاں کی مجلسوں میں گوتم نیلمبر خاص اہمیت حاصل کر چکا تھا' اس کے بغیر اب محفل مکمل نہ سمجھی جاتی۔

جاڑوں میں لان پر دھوپ میں اور گرمیوں میں درختوں کے نیچے بیٹھ کر گھنٹوں باتیں ہوتیں مذہب' فلسفہ' سیاست' عمرانیات' آرٹ' ادب۔ ذہن کی دنیا وسیع تھی بڑی پرکشش' بڑی تکلیف دہ اور انتہائی پرخطر۔

''پروفیسر ______'' ایک روز چمپا نے پوچھا'' ذہن اور جذبات کی کش مکش سے کس طرح نجات ملے گی؟ چاروں اور یہ سائے پھیلے ہیں۔ جس طرح جنگل میں جھکڑ چلتا ہے تو درختوں کے سائے آپس میں گتھم گتھا ہو جاتے ہیں۔ یہ کش مکش ہر سطح پر جاری ہے قومیں' حکومتیں' انسان' فرقے۔ ہر طرف یہ سب ایک دوسری سے الجھے ہوئے ہیں۔ میرے آس پاس چاروں کھونٹ خوف کی عملداری ہے اور بے اطمینانی' نفرت' کھنچاؤ' دہشت' وفاداریوں کی کش مکش' اندھیرے جنگل میں چھپے ہوئے اگیا بھتال اپنے چراغ دکھاتے ہیں اور جب ان کی طرف دوڑو تو پلک جھپکتے میں غائب۔ مجھے بڑا شدید ذہنی کش مکش کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

''جب میں بنارس میں پڑھتی تھی میں نے دو قوموں کے نظریے پر کبھی غور نہ کیا۔ کاشی کی گلیاں اور شوالے اور گھاٹ میرے بھی اتنے ہی تھے جتنے میری دوست لیلا بھارگوا کے' پھر یہ کیا ہوا کہ جب میں بڑی ہوئی تو مجھے پتا چلا کہ ان شوالوں پر میرا کوئی حق نہیں کیونکہ میں ماتھے پر بندی نہیں لگاتی اور تپلیشور کی آرتی اتارنے کے بجائے میری اماں نماز پڑھتی ہیں لہٰذا میری تہذیب دوسری ہے' میری وفاداریاں دوسری ہیں۔ میں نے بسنت کالج میں ترنگے کے نیچے کھڑے ہو کر جن گن من گایا ہے لیکن مجھے وہاں پر اکثر ایسا محسوس ہوا کہ مجھے اس ترنگے کے سائے میں اجنبی سمجھا جاتا ہے۔ میں تو اسی ملک کی باسی ہوں' اپنے لیے دوسرا

ملک کہاں سے لاؤں؟ ہجرت کا فلسفہ میری سمجھ میں نہ آیا۔ یہودیوں کو دیکھو کہ ان کا کوئی وطن نہیں ہے۔ وفاداریوں کی کش مکش کا سامنا کرتے ان کو ہزاروں سال بیت گئے' وہ جرمن ہوں تب بھی یہودی ہیں' امریکن ہوں تب بھی۔ جب یورپ میں جنگ چھڑی ایک نیا مسئلہ میرے سامنے آیا۔ غاصب قومیں ایک ملک کے باشندوں کو نکال باہر کرتی ہیں اور وہ لوگ سیاسی پناہ گزینوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور دنیا بھر میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ ان پر ترس کھایا جاتا ہے' چندے جمع ہوتے ہیں' ان کو حقیر سمجھا جاتا ہے کیونکہ ان کا کوئی گھر نہیں۔ دو طرح کے پناہ گزین تھے: ایک وہ جنہوں نے اپنی مرضی سے ترکِ وطن کیا' دوسرے وہ جن کو مجبوراً نکلنا پڑا تب مسلم سیاست میں ایک نئی آواز سنائی دی' میں نے دیکھا کہ میرے ہم مذہب مسلمان بخوشی اور بڑے ارمان کے ساتھ ترکِ وطن پر آمادہ ہیں اور ایک نیا ملک بسانا چاہ رہے ہیں' مجھے اکثر یہ تصور بہت بھایا کیونکہ رومان اور عینیت انسان کی فطرت میں داخل ہے اور اگر ایسا نہ ہوتا تو دنیا میں کسی نئے خیال پر عمل نہ کیا جاتا' نہ خواب دیکھے جاتے مگر اس خواب کا دوسروں کے خوابوں سے تصادم ہو گیا۔ کش مکش اور تصادم کا مجھے پھر سامنا کرنا پڑا۔

''امن اور جنگ کا مسئلہ بہت کٹھن ہے' میں نے ٹالسٹائی پڑھا اور گاندھی اور وڈرو ولسن' لیکن اس کے کیا معنی ہیں؟ وفاداریوں کے معنی طے کرنے والا کون ہے؟ سیاست میں مہاتما گاندھی کی روحانیت کا کہاں تک دخل ہونا چاہیے اور قائد اعظم جناحؒ کے اسلام کا کہاں تک؟ مجھے معلوم ہے کہ فرقہ پرستی ہلاکت خیز ہے۔ ایک دفعہ بچھڑے تو کبھی نہ مل سکیں گے' مگر میرے کچھ ساتھی کہتے ہیں کہ ہم کبھی

ایک نہ تھے' یہ سب کانگریس کا فراڈ ہے وہ مسلمانوں کو غلام بنانا کچھ ساتھی کہتے ہیں کہ ہم کبھی ایک نہ تھے' یہ سب کانگریس کا فراڈ ہے وہ مسلمانوں کو غلام بنانا چاہتی ہے۔"

"تم نے کبھی غور کیا۔" پروفیسر نے اوپر درخت کی شاخ پر بیٹھی ہوئی ایک گوریا کو دیکھتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا' "تم ہسٹری کی طالب علم ہو_____ کہ انگریزوں سے پہلے اس ملک میں ہندو مسلم فساد نہیں ہوتے تھے۔ جنگیں ہوتی تھیں مگر وہ سیاسی تھیں۔ ہندو حکمرانوں کی فوج میں مسلمان جنرل اور سپاہی ہوتے تھے۔ مسلمانوں کی طرف سے ہندو لڑتے تھے۔ سیاسی گروہ بندیاں تھیں' پھر انگریزوں نے دنیا پر یہ نیا نظریہ آشکار کیا کہ اس ملک میں ہزاروں زبانیں بولی جاتی ہیں' ہزاروں قومیں بستی ہیں' ہندو مسلمان ایک دوسرے سے منفر ہیں' یہ ملک ایک ملک نہیں ہے محض جغرافیہ کی ایک اصطلاح ہے۔ ان کی لکھی ہوئی تاریخ راجستھان' ہی دیکھ لو یا انیسویں صدی کے سفرنامے' لیکن تم کو ۵۷ء یاد ہے جب اسی لکھنو میں ہندو امراء اور رعایا نے برجیس قدر کی حکومت کو' جو بہر حال مسلمان حکومت تھی' بچانے کے لیے اپنی جانیں لڑائیں' مگر ہمارا موجودہ مذہبی جنون۔"

"مذہب آپ کے نزدیک بیکار ہے؟ آپ تو خود بڑے پکے ویشنو ہیں۔"

ویشنو بھگتی کا مذہب ہے' اس کی بنیاد خالص محبت ہے۔

پروفیسر ہر مذہب کی بنیاد خالص محبت ہے' یہ کوئی بات بات نہ ہوئی۔

ہاں' لیکن اصل چیز یہ ہے کہ میں دوسرے مذہب کو حقیر نہ سمجھوں۔

"اب ہر ایک تو آپ کی طرح صوفی نہیں ہوسکتا۔"

تم بڑی تلخ باتیں کرنے لگی ہو، ایسا نہ کرو۔''

''پروفیسر یہاں چاروں طرف تلخی ہے اور نفرت، میں کیا کرسکتی ہوں، کل رات میں وہابی تحریک کا تذکرہ پڑھ رہی تھی۔ اس میں جو لوگ شامل تھے ان کو مذہبی دیوانے کہا جاتا ہے مگر اپنے نقطہ نظر سے وہ حق بجانب تھے، وہ اسلام کی تجدید کرنا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک دنیا دو فرقوں میں بٹی تھی: کفر اور اسلام انہوں نے کفر کے خلاف جہاد کیا۔ آخر کون یہ بتانے جائے گا کہ دوسرا انسان حق بجانب ہے یا نہیں۔ سب اپنے نقطہ نظر سے حق بجانب ہوتے ہیں۔ یہی تو سب سے بڑی مصیبت ہے پروفیسر کل رات ہم لوگ نرملا کے یہاں رات گئے تک بیٹھے رہے تھے، وہاں ہم ماضی کے متعلق سوچ رہے تھے اور وقت کے گورکھ دھندے کے متعلق ۔گھر واپس جا کر میں دیر تک جگا کی، یہاں تک کہ سویرا ہو گیا، اس وقت میں سوچ رہی تھی ۔ ہمارا واپس جا کر میں دیر تک جگا کی، یہاں تک کہ سویرا ہو گیا، اس وقت میں سوچ رہی تھی ۔ ہمارا تاریخ کا آخر آپس میں کیا رشتہ ہے اور کیا ہونا چاہیے، ہم مسلسل جرم و سزا کے مسئلے کا سامنا کرتے رہتے ہیں ۔ ماضی کی پرائشچت ہم کو کرنا پڑتی ہے، میری قوم نے جو جرم کیے ہیں یا کر رہی ہے بحیثیت فرد میں جو جرم کروں گی اس کا خمیازہ میری قوم کو اٹھانا ہو گا کیونکہ خیال میں بڑی طاقت ہے اور میں پروپیگنڈے کی مشینری کے ذریعے اپنے خیالات کا پرچار کر کے بہت کچھ کرسکتی ہوں۔ جو کچھ آج، اس لمحے تک، ہوا اس کا اثر مجھ پر پڑا ہے۔ جو کچھ میں سوچ رہی ہوں اس کا کنارہ آنے والی نسلیں ادا کریں گی ۔میری وجہ سے یا دنیا تباہ ہو گی یا پر مسرت ۔تاریخ میں نفرت اور تعصب کے مسائل پر میں جتنا غور کرتی ہوں اتنی ہی

مجھے وحشت ہوتی ہے، مجھے آپ سے ذاتی طور پر نفرت نہیں مگر کمیونٹی کا اسٹیریو ٹائپ کے نفرت اور تعصب کے تصورات کا بھی بہت تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے، میں تاریخ کی بات کر رہی تھی۔ پروفیسر کل میں نے نرملا کے گھر سے لوٹ کر کتابوں کی الماری کھولی اور ایک پرانی کتاب میرے ہاتھ میں آ گئی جس میں انیسویں صدی کے مولویوں کے جہاد کا تذکرہ تھا۔ اس میں ایک نظم بھی درج ہے۔فیض آباد کا ماجرا ہے جو اجودھیا کہلاتا ہے۔لکھا ہے۔مغل بادشاہوں اور ان کے صوبیداروں نے رام گھاٹ اور دوسری جگہوں پر مسجدیں بنائیں، جب مندر گرے تب بھیا ایک ہندو جوگی املی کے درخت کے نیچے جھنڈی گاڑھے بیٹھا رہا۔ واجد علی شاہ کے عہد میں ہندوؤں نے پھر اس جگہ پر ٹھاکر دوار بنانے کی کوشش کی۔بڑا فساد رہا،فوج کشی ہوئی۔فرنگی محل کے علماء نے جہاد کا فتویٰ دے دیا۔ مجاہدوں کے لشکر پہنچے۔بڑا خون خرابا ہوا۔مولویوں نے لشکر کشی سے پہلے سلطان عالم کو عرضی بھیجی جو نظم کی صورت میں تھی، میں نے وہ نظم نقل کر لی تھی۔آپ کو سناتی ہوں۔''

اس نے بیگ کھول کر ایک کاغذ نکالا اور گھاس پر آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے پروفیسر کو سنانا شروع کیا:

مجاہدین کی عرضداشت بادشاہ اودھ کی خدمت میں

قریب دیر مہابیر واجب التعزیر

بنا تھی مسجد اسلام ہم چو بدر منیر

لگے بنانے بڑھا کر یہ کافر مقہور

سوار مسجد اقدس میں خانہ لنگور امید ہے کہ شہنشاہ قبلہ عالم
ابوا لمظفر و منصور و خسرو اعظم
شہپر رفعت و قدسی صفات' والا جاہ
خدیو کشور ہندوستاں' فلک درگاہ
زبان فیض مبارک سے یوں کریں ارشاد
کہ کافران اودھ پرشتاب ہوئے جہاد
روانہ ہوگا شتابی کو لشکر اسلام
برائے غارت وتاراج شہر لچھمن و رام

''یہ مذہب کا تعصب ہے اپنی خالص ہیت میں گویہ ایک علیحدہ بات ہے کہ سلطان عالم واجد علی شاہ نے بجائے اس کے کہ وہ عرضداشت پر کان دھرتے انہوں نے الٹی مجاہدین کی سرکوبی کے لیے شاہی فوج فیض آباد بھیجی اور مجاہدین لڑتے ہوئے سرکاری سپاہیوں کے ہاتھوں مارے گئے یا شہید ہوئے اور ایودھیا میں امن قائم ہوا۔ یہ واقعہ انتزاع سلطنت سے صرف ایک سال قبل ۱۸۵۵ء کا ہے۔ یہ بھی ایک علیحدہ بات ہے کہ سلطنت کا انتظام اچھی طرح نہیں کرتے تھے۔ پروفیسر' بتاؤ' میں کس کس سے نفرت کروں؟ انگریزوں سے'جنہوں نے میرے بے قصور بادشاہ کو معزول کیا یا اس کلمہ گو بادشاہ سے نفرت کروں' جو ہندو دیو مالا کا عاشق تھا' کرشن اور راجہ اندر کا سوانگ بھرتا تھا اور مسلمان مجاہدین کا قتل کرواتا تھا؟ ان مجاہدین سے متنفر ہوں جو لچھمن اور رام کے پرامن خوبصورت شہر کو تاراج کرنے جارہے تھے؟ یا ان ہندو جوگیوں کو موردالزام ٹھہراؤں جو رام گھاٹ پر

دوبارہ ہنومان کا مندر بنانا چاہ رہے تھے اور میں کس کو حق بجانب ٹھہراؤں؟''

''اب کمال قریب آ کر گھاس پر بیٹھ گیا اور چمپا کے ہاتھ سے نظم لے کر پڑھنے لگا۔ لان پر لڑکوں اور لڑکیوں کے گروپ مختلف ٹکڑیوں میں بکھرے ہوئے تھے۔''

''اور پھر تم متوقع ہو۔'' کمال نے کہنا شروع کیا' ''تم جو فخر یہ اپنے آپ کو بت شکن کہتے ہو اور سومنات سے لے کر آج تک تم نے جو کچھ کیا ہے' اس کے باوجود ہندو تم سے محبت کریں گے۔ یہ اچھی دھاندلی ہے۔''

''کمال! تم تو بالکل مہا سبھائی ہو۔ اچھے خاصے۔ تم سے کوئی بات کرنا بیکار ہے۔ تم نفرتوں سے آزاد بڑی وسیع النظری کا دعویٰ کرتے ہو لیکن تمہاری اس شدت کی قوم پرستی بذات خود ایک اور تعصب ہے۔'' چمپا نے کہا۔

''اس منطق کا میں جواب نہیں دے سکتا۔'' کمال نے کہا' وہ دونوں اٹھ کر سرو کے درختوں کے کنارے ٹہلنے لگے۔

''اصل قصہ یہ ہے چمپا باجی کے مسلمان قوم کی سائیکولوجی عجیب وغریب ہے' تم کو کبھی اس سرزمین سے محبت نہیں ہوئی۔ چھوٹتے ہی 'میرے مولا بدلے مدینے مجھے' کا نعرہ تم نے لگایا۔ رہیں ایک ہزار برس یہاں' تہذیبی اور روحانی ناطہ جوڑ رکھا عجم اور عرب سے' پھر مجھے مہا سبھائی بنا رہی ہو۔ واہ بھئی ______ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ قومی جدوجہد میں ہر جگہ مسلمانوں نے بھانجی ماری اور فوراً غیر ملکی عناصر سے جا ملے۔'' اس نے ٹہلتے ٹہلتے رک کر جوش سے کہنا شروع کیا۔ ''کیا واقعہ نہیں ہے کہ ۳۷ء میں جب کانگریس گورنمنٹ نے صوبے میں شراب پر پابندی لگائی تو مسلمانوں نے فوراً اس کے خلاف ایجی ٹیشن کیا کہ ان کے مہذب

میں شراب پہلے ہی حرام ہے لہٰذا ان کے اوپر یہ قانون عائد نہیں ہوتا' انہیں اس مسئلے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ کیا تم اس کی تردید کرو گی کہ جب لیگ نے یوم نجات منایا تو راجندر بابو نے کہا لیگ نے جو الزامات۔"

"کیا کانگریس حکومت نے مسلمانوں پر ظلم نہیں توڑے ــــــ؟" چمپا نے بات کاٹی۔

"یہی عرض کر رہا ہوں ــــــ راجندر بابو نے کہا کہ لیگ نے جو الزامات کانگریس حکومت پر لگائے وہ فیڈرل کورٹ کے سامنے انکوائری اور فیصلے کے لیے رکھے جائیں۔ لیگ نے یہ بھی منظور کر دیا اور کہا کہ یہ معاملہ رائل کمیشن کے سامنے البتہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس پر برطانوی حکومت تیار نہ ہوئی ــــــ"

"ہاں' کیونکہ برطانوی گورنروں کو تم لوگوں نے پہلے ہی اپنی طرف ملا لیا تھا ــــ"

"تمہارا خیال ہے کہ برطانوی گورنر وفادار مسلمانوں کو چھوڑ کر کانگریس کا طرفدار ہو گیا تھا۔ ہوش کے ناخن لو چمپا باجی۔ ۳۵ء کے ایکٹ کے ذریعے ان کو اقلیتوں کے تحفظ کے مخصوص اختیارات دے دیے گئے تھے۔"

"چنانچہ یہ تم مانتے ہو کہ اقلیتوں کا مسئلہ ہندوستان میں موجود ہے۔"

"یقیناً ــــــ" کمال نے گلا صاف کیا' "لیکن یہاں روس کی طرح ملٹی نیشنل اسٹیٹ بن سکتی ہے۔"

"یہی تو مصیبت ہے کہ تمہارے ساتھ جو بات کرو تان جا کر ماسکو پر ٹوٹے گی۔" چمپا نے کہا۔

''اور آپ کی تان جا کر مکے مدینے پر ٹوٹتی ہے ______ ایٹم کے عہد میں قرونِ وسطیٰ کے مذہبی تصورات لیے پھر رہی ہیں۔''

''دیکھو۔ تم پنڈت نہرو کی کہی ہوئی باتیں نہ دہرایا کرو۔''

''کیوں نہ دہراؤں؟ دیکھیے چمپا باجی ساری بات یہ ہے کہ مسلمان سماجی طور پر پسماندہ ہے اور مذہب اس کے لیے ایک بہت واضح تصور ہے ______ انتہائی شخصی اور ذاتی۔ ہندو کے یہاں مذہب ایک سماجی نظام ہے۔ ہزاروں لاکھوں دیوتا ہیں وہ جن کو چاہے مانے جن کو چاہے رد کر دے۔ ایک مخصوص قسم کی تنگ نظری ہے' ایک مخصوص قسم کی آزاد خیالی' پھر اس کی انٹلجنسیا نے سائنٹیفک ہونا سب سے پہلے سیکھا' وہ مہذب کے بارے میں جذباتی نہیں۔ اس کا ذہن انتہائی ریشہ دوانی اور جوڑ توڑ کا ماہر ہے۔ حساب کتاب' جمع تفریق۔ ظاہر ہے مسلمانوں کے مقابلہ میں وہ کہیں زیادہ چالاک ہے۔ مسلمان بے چارہ خدا رسول کا عاشق۔ بات بات پر ہجرت پر تیار ترکی میں کسی کو چھینک آئی' آپ بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ افغانستان میں کسی کے پیر میں کانٹا چبھا' یہ بیکل ہو گئے۔ ہندی ہو کر بھی ہند کا نہ ہوا' مگر مصیبت یہ ہے کہ یہاں اجمیری پیا بھی ہیں محبوب الٰہی بھی۔ یہاں تاج محل پر بھی بھائی کو بہت ناز ہے کہ ہمارے بادشاہوں نے بنایا تھا مگر اس اسلامی بین الاقوامیت کے چکر نے اسے کہیں کا نہ رکھا۔''

کمال نے چلتے چلتے ایک میز پر سے اٹھا کر پانی کا گلاس پیا۔ ''مسلمانوں کی ساری تاریخ اٹھا کر دیکھ لو ______'' اس نے تھوڑی دیر بعد کہنا شروع کیا ''ہمیشہ ملک گیری اور ذاتی اقتدار کے لیے آپس میں لڑے۔ شان و شوکت امپیر

یلزم کی جس قدر شائق یہ قوم ہے میں نے آج تک کہیں نہیں دیکھی۔ بنو امیہ' بنو عباس' ایران کی حکومتیں' عثمانی ترک' ہندوستانی مغل' افغان' عرب' مصری سب نے آپس میں کیا کیا خونریز جنگیں کی ہیں۔ اس وقت ان کا اسلام کہاں گیا تھا؟ مارا اسلام اسلام کی رٹ لگا رکھی ہے۔"

"لیکن خلفائے راشد کا زمانہ ____"

"چمپا باجی ____ کیوں زخموں پر نمک چھڑکتی ہو؟ رسول خدا کی آنکھیں بند ہوتے ہی تو تمہاری ملت بیضا نے خانہ جنگی شروع کر دی۔ جنگ جمل بھول گئیں ____ آج تک وہ زخم ہرے ہیں۔ تعصب اور نفرت۔ تعصب کے مسئلے کو تو تمہارا اسلام بھی حل نہ کر سکا۔ میں لکھنو کا شیعہ ہوں' مجھ سے پوچھو' شیعہ اور سنی ایک دوسرے سے کس قدر متنفر ہیں۔ نہیں چمپا باجی ____ مجھے مذہب نہیں چاہیے۔ فقہ اور حدیث اور امام غزالی اور ابن خلدون سب ٹھیک ہے مگر اس وقت میرے سامنے دوسرے مسائل ہیں۔ انسان کو امن چاہیے اور روٹی۔ اس کے بعد وہ یقیناً افکار غزالی پر غور کر سکتا ہے۔" اب وہ پھر پارٹی لائن چلا رہا تھا۔

کمال موجودہ نسل کا نمائندہ لڑکا تھا: ذہن پرست' باصول' ایماندار شدید طور پر پرخلوص' تصور پرست۔ چمپا اسے غور سے دیکھتی رہی۔ عامر رضا' جنہوں نے اس سے صرف فرانسیسی پروشل شاعری اور وی آنا کی موسیقی کی باتیں کی تھیں کسی دوسرے دنیا میں بستے تھے۔ کمال اور گوتم اور ہری شنکر ____ یہ لوگ ان سے کس قدر مختلف کتنے بلند تھے۔

مگر وہ تو گلابوں کی دنیا میں جانا چاہتی تھی' جہاں دیوار کے درختوں میں چھپے

ہوئے کالج میں اور جن میں شو پال کی موسیقی بجتی ہے۔

''ہماری لڑکیوں اور عورتوں کو ستیہ گرہ کی تحریک کے زمانے میں جیلوں میں کوڑے لگائے گئے۔''

اس کے کانوں میں کمال کی آورز آئی' وہ جوش کے ساتھ بولے جارہا تھا:

''ہمارے لیڈروں نے پندرہ پندرہ برس کی قید تنہائی کاٹی۔ تم' جو جیل جانے والوں کا مذاق اڑاتی ہو' ذراسوچو' زندگی اور آزادی کسے عزیز نہیں؟ عمر عزیز کے ان گنت سال جیل میں کاٹ دینا کسے پسند ہے؟ محض ایک اصول' ایک نظریے کی خاطر ہزاروں لوگوں نے جاکر قید خانے میں چکیاں پیسیں اور برطانوی سپاہیوں کے ظلم سہے۔ کیا یہ لوگ محض شہرت اور نام ونمود کے بھوکے تھے؟ کیا خالی جذباتیت کی بناء پر انہوں نے یہ قربانیاں دیں؟ انسان کو زندگی صرف ایک مرتبہ زندہ رہنے کے ملتی ہے اور اس زندگی کا بیشتر حصہ انہوں نے جیلوں میں گزار دیا۔ ہنستی خوشی جاکر کال کوٹھڑیوں بند ہو گئے۔ سیاسی جدوجہد بہت بڑی چیز ہے۔ اس کا مذاق نہ اڑانا۔ اس آگ میں تپ کر جو لوگ نکلتے ہیں وہ کندن کی مانند ہیں۔ جو لوگ آپ کی طرح آرام کرسیوں پر بیٹھ کر ان پر ہنستے ہیں اور پھر بھی قوم کی ہمدردی کا دعویٰ کرتے ہیں وقت آنے پر خود ہی معلوم ہو جائے گا کون کتنے پانی میں ہے۔ گھٹیا لوگ اور بڑے انسان سب آپ ہی الگ الگ راستوں پر چلے جائیں گے' تم کو معلوم ہے دہرہ دون جیل میں پنڈت جی کی کوٹھڑی میں سانپ اور بچھو تھے۔ کن کن مصایب کا ان سب نے سامنا کیا' مگر اب بجائے اس کے کہ متحد ہو کر ہم ایک عظیم طاقت بنتے ہم انگریزوں کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنے ہوئے ہیں۔'' کمال کا

چہرہ غصے سے تمتما اٹھا۔

''تم بڑے پکے نیشنلسٹ ہو کمال؟'' چمپا نے خائف ہو کر پوچھا۔

''ہاں ہر ایماندار اور ضمیر پرست انسان نیشنلسٹ ہو گا۔ کیا وجہ ہے کہ ملک کے اکثر مسلمان انٹلکچول قوم پرست ہیں؟ کیا وہ سب ضمیر فروش ہیں؟ کانگریس نے ان کی رشوت دے رکھی ہے۔ خدا کے غضب سے ڈرو چمپا باجی اور ایک اور بات۔''اس نے ٹہلتے ٹہلتے رک کر کہا'' تمہارے نزدیک سیاست صرف شہروں کی سیاست ہے' تم دیہات سے واقف نہیں۔ شہروں میں رجعت پسند سرمایہ دار ہیں جو اپنا نظام قائم رکھنے کے لیے فرقہ وارانہ سیاست کا اچھار رہے ہیں۔ تم کبھی کسی گاؤں میں گئی ہو؟ اگر مادھو پور کی ہندو لڑکی بیاہ کر کرن گنج جائے تو مادھو پور کا مسلمان کسان کبھی کرن گنج میں پانی نہیں پئے گا کیونکہ وہ اس کی بیٹی کی سسرال ہے' یہ انسانیت کی اقدار چمپا جی جو مذہب اور سیاست سے بلند تر ہیں۔''

اب شام کا اندھیرا اچھا رہا تھا۔ لان پر درخت کے نیچے طلعت بیٹھی گوتم اور چند لڑکوں سے باتیں کر رہی تھی' وہ اٹھ کر ان کی طرف آ گئی۔ کمال کہتا رہا'' ہماری ساری سیاست کی اصل بنیاد مراعات حاصل کرنے کا مقابلہ تھا۔ مسلمانوں کو اتنی ملازمتیں ملنا چاہیں' سکھوں کو اتنی' ہندوؤں کو اتنی۔ مڈل کلاس سیاست۔ مجھے بتاؤ مسلمانوں کی آٹھ کروڑ کی آبادی میں مڈل کلاس اور یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ کتنے ہیں اور کسان اور کاریگروں کا تناسب کیا ہے اور ہز ہائی نس دی آغا خان کیا ان کسانوں اور کاریگروں کی نمائندگی کرتے ہیں؟ ان میں اور احمد آباد یا بمبئی کے کسی دوسرے سیٹھ میں کیا فرق ہے؟ وہ برلا اور ڈالمیا۔''

''افواہ ____ ''چمپا نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے''وہی کمیونسٹ پارٹی کے گھسے پٹے دلائل۔''

''تم سے بحث کرنا بالکل بیکار ہے چمپا باجی۔''کمال نے رنجیدہ ہوکر کہا۔

طلعت اب ان کے ساتھ ساتھ ٹہل رہی تھی۔''تم نے آج کا اخبار پڑھا؟''

''ہاں مجھے معلوم ہے۔''کمال نے نیچی آواز میں جواب دیا۔

''کیا ہوا۔''چمپا نے پوچھا۔

''میرے بابا'خان بہادر نواب تقی رضا بہادر آف کلیان پور'لیگ میں شامل ہوگئے ____ یعنی دوسرے الفاظ میں یہ کہ ٹاپ پر لوٹ گئے۔''

''ماما سے مایا ملے کر کر لمبے ہاتھ ____ ''طلعت نے کہا۔

''تلسی داس گریب کی کوئی نہ پوچھے بات ____ ''کمال نے کہنا شروع کیا۔

''بابا سمجھتے ہیں کانگریس تعلقداروں کو ختم کرنے کے در پے ہے۔کانگریس حکومت بنتے ہی پھر وہی کھڑاگ شروع ہو جائے گا: زرعی اصلاحات اور یہ اور وہ ۔انہیں نیشنلزم سے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے؟ فیوڈل اقتدار کے آخری رکھوالے ہیں'مجھے ان سے پوری پوری ہمدردی ہے۔میں اپنے والد کا نقطہ نظر خوب سمجھتا ہوں'میں گھر جا کر ان سے بحث نہیں کروں گا مگر مجھے صرف اس کا افسوس ہے کہ اس سرزمین میں ان کی جڑیں اتنی گہری ہیں کہ وہ ترک وطن کر کے سندھ اور بلوچستان کو اپنا ملک کیسے سمجھیں گے۔بابا بوڑھے آدمی ہیں'میں ان کو اس وقت دل شکستہ نہیں دیکھنا چاہتا مگر اس وقت تیر کمان سے نکل چکا ہوگا۔''

''کمال وطینت اتنی بڑی چیز نہیں۔ تصور اصل چیز ہے' اگر وہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان ہی میں مسلمانوں کی بقا ہے تو تم اعتراض کرنے والے کون؟ کیا تم آزادیِ افکار کے قائل نہیں؟'' چمپا نے جواب دیا۔

''وطن کو پرانے کوٹ کی طرح اتار کر نہیں پھینکا جا سکتا۔'' طلعت نے غصے سے کہا۔

''کیا وطن ہے یار! بکواس۔ مسلمان کا وطن سارا جہاں ہے۔'' چمپا نے کہا۔

طلعت اسے غور سے دیکھتی رہی۔ ''بجیا آئیے۔'' اس نے کہا'' پروفیسر چاء کے لیے بلا رہے ہیں۔''

پروفیسر کے قریب ہی گھاس پر گوتم بیٹھا تھا۔ اس نے اٹھ کر چمپا کو نمستے کیا۔

''چمپا باجی مسلم لیگی ہو گئی ہیں بڑ بھاری۔ آج لیگ کی طرف سے ایک بیان چھپا ہے کہ ہندوؤں کا سوشل بائیکاٹ کر دیا جائے لہٰذا کل سے وہ ہماری محفلوں میں نہیں آئیں گی۔'' کمال نے تلخی سے کہا۔

شام کی نیلگوں روشنی میں وہ درختوں کے قمقموں کے نیچے بیٹھے رہے۔ فضا کا غم گہرا ہوتا گیا۔

چمپا چلو' نو بجے سے ریہرسل شروع ہے'' پھولوں کے پرے سے کسی لڑکی نے پکارا۔

''اچھا۔'' وہ سائیکل سنبھال کر پھاٹک کی طرف چلی گئی۔ گھاس پر بیٹھے ہوئے لوگ اسے روش پر سے گزرتا دیکھتے رہے۔

## ۵۶

کیلاش ہوسٹل میں سالانہ ڈراما تھا۔لڑکیاں ہفتوں سے تیاری میں جٹی تھیں شام کوہال میں یا گھاس پر ریہرسلیں کی جاتیں ۔موسیقی کمپوز ہوتی۔ناچ کی مشق کی جاتی۔کوسٹیومز ے کے ڈیزائن تیار ہوتے۔اسٹیج کے ڈیکور پر بحث ہوتی۔فیروز جبیں نہایت تندہی سے سب کو پارٹ یاد کروا رہی تھی۔کملا انارکلی تھی۔طاعت دلارام' ای نڈ سلیم' ایک اور سوانگ' پھر کواڈرینگل میں اسٹیج تیار ہوا۔وائس چانسلر اور اسٹاف اگلی قطاروں میں آن کر بیٹھے۔ریڈیو اسٹیشن کے آرکیسٹرا نے اسٹیج کے پیچھے برآمدے میں اپنی جگہیں سنبھالیں۔اب کسم محل سرا میں کنزوں کے ساتھ بیٹھی کا رہی تھی۔

لب جو ہو فرش آب ہو' شب ماہ ہو' بادۂ ناب ہو

ای نڈ دریچے میں کھڑی کہہ رہی تھی۔ راوی کے نوجوان ملاح ــــــ انارکلی کہہ رہی تھی۔ ہندوستان کا شہزادہ اور کنیز سے محبت ــــــ کیسی ہنسی کی بات ہے ــــــ سب خواب کی طرح گزرتا گیا' پھر پردہ گرا اور لوگ باتیں کرتے باہر نکلے۔

حامد رضا نے چمپا سے کہا: ''ڈائریکٹر صاحب آپ نے کمال کر دیا۔''

کمال نے کہا: ''چمپا باجی بس سوانگ رچتی رہیے ــــــ انارکلی سے بہتر کوئی موضوع نہ مل سکا آپ کو؟ رومان پرستی کی بھی حد ہونی چاہیے۔'' پھر وہ مجمعے میں غائب ہو گیا۔

گوتم نے قریب آ کر کہا: ''شمپا باجی کیا آپ کمال سے خفا ہیں۔ اس روز پروفیسر کے یہاں کمال نے آپ سے کافی سست سخت باتیں کہیں، میں اس کی طرف سے آپ سے معافی مانگتا ہوں۔ آپ اتنی خاموش کیوں ہیں؟ آپ ہنستی ہوئی اچھی لگتی ہیں۔ زندگی میں اتنی اداسی ہے، اس اداسی میں اضافہ نہ کیجئے۔''

''نہیں۔'' اس نے گوتم کو جواب دیا' میں دراصل آج کل جینے کے مختلف روپے اسٹڈی کر رہی ہوں۔

''میں اس مسئلے پر کچھ روشنی ڈالوں۔'' طاعت نے بشاشت سے قریب آ کر کہا، وہ ابھی تک دلارام کا لباس پہنے تھی۔

''آج میری اس قدر تعریفیں ہوئی ہیں تو میں نے سوچا کہ میں کس طرح کا ایکسپریشن اپنے چہرے پر قائم رکھوں: وقار' بشاشت' سنجیدگی ______ مصیبت یہ ہے کہ اگر انکسار برتو تو سمجھا جاتا ہے یہ احساس کمتری ہے ______ اور اگر انکسار نہ برتا جائے تو اسے غرور پر محمول کیا جاتا ہے ______ ہر ایک سے اچھی طرح باتیں کرو تو لوگ کہتے ہیں عجب چلبلی لڑکی ہے ______ رکھ رکھاؤ سے رہو تو بوریا بد دماغ سمجھا جاتا ہے یا یہ کہ بے چاری چار آدمیوں سے بات کرنے میں گھبرا جاتی ہے' کونے گھوس ہے۔ میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ انسان جیسا ہے اس کو ویسا ہی رہنا چاہیے۔ کبھی ایسی چیزوں کی تمنا نہ کرو جو بس سے باہر ہوں۔ مثال کے طور پر بھائی گوتم کو دیکھیے۔ ان سے باتیں کیجئے تو لگتا ہے افلاطون کے ساتھ مکالمہ ادا کیا جا رہا ہے۔ یا خلیل جبران کا المصطفیٰ دیواروں کے باغ میں مصروف گفتگو ہے۔ نہیں چمپا باجی۔ جینے کے روپے کے

متعلق نہ سوچیے۔" پھر وہ بھی چھلاوے کی طرح مجمعے میں غائب ہوگئی۔

گوتم نے ہنس کر چمپا کو دیکھا۔ "کس قدر رٹراتی ہے یہ لڑکی ــــــــ"

"مجھے اس پر رشک آتا ہے۔ اس کے ذہن میں کوئی الجھن نہیں۔" چمپا نے کہا۔

"الجھنوں سے ہم سب خود کو بچا سکتے ہیں۔"

"واقعی؟"

"ہاں چمپا باجی۔"

"تم کبھی الجھنوں سے دوچار نہیں ہوئے۔"

"شاید ــــــــ نہیں۔"

سڑک پر مورلی کی ٹہنیاں جھکی ہوئی تھیں۔ ہواؤں کے راگ بہر سریلے تھے، وہ دفعتاً پھاٹک کی پلیا کے پاس ٹھٹھک گئی۔ "نہیں گوتم، میں کمال سے خفا نہیں ہوں، مجھے کسی سے بھی خفا ہونے کا حق نہیں پہنچتا۔"

"آپ درجہ شہادت حاصل کرنے والی ہیں! یہ مظلوموں والا لہجہ کیوں؟"

"تم ــــــــ تم لوگ بڑے کمینے ہو" اس نے تلخی سے کہا۔

"ہم لوگ محض بے حد پرخلوص ہیں، مگر شاید خلوص کی ایک قسم اور بھی ہوتی ہے اور وہ بھیا صاحب کے پاس موجود ہے ــــــــ"

"تم ــــــــ تم ایسی باتیں کیوں کر رہے ہو ــــــــ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں ایک طویل شفاف گیلری میں کھڑی ہوں اور میرے سامنے سے ایک کے بعد ایک فراٹے سے پردے اٹھتے چلے جا رہے ہیں ــــــــ وہ پردے جن

پر خوبصورت تصویریں بنی ہیں اور مناظر ۔ اب آخر صرف ایک سیاہ پردہ باقی رہ گیا ہے۔"

"چمپا باجی' آپ کا پرابلم بے حد ذاتی ہے۔ آپ کو بھیا صاحب سے بہت محبت ہے' بس ساری بات یہ ہے' باقی سب فروعات ہے ______ اور آپ کا دوسرا پرابلم الفاظ ہیں۔" گوتم نے حسب معمول پہنچے ہوئے بزرگ کی طرح انکشاف کیا۔

نفرت سے چمپا نے اسے دیکھا: "الفاظ"

"ہاں ۔ صریحاً۔ میں نے یہی لفظ استعمال کیا تھا۔"

"اور جو کچھ ہے وہ بے معنی ہے؟"

"کوئی چیز بے معنی نہیں ۔ خود اس لفظ بے معنی کے بھی معنی موجود ہیں۔"

"طلعت ٹھیک کہتی تھی' تم بھی پوز کرتے ہو۔ تم سے باتیں کرو تو لگتا ہے خلیل جبران کے المصطفیٰ سے گفتگو کی جا رہی ہے۔"

"چمپا باجی ۔" وہ گھبرا گیا ۔ "اللہ خفا نہ ہو جیئے ______ چلیے مجھے اپنے گھر لے جا کر کافی پلا ئیے' وہاں ہم ان مسائل پر مزید روشنی ڈالیں گے ______ اور اللہ افسردہ نہ ہو جیئے ۔ انسان صرف ایک بار پیدا ہوتا ہے ۔ اگلے جنم کی کسے خبر ہے ______ آئیے ______"

چمپا چاند باغ کی ایک پیاری لیکچرر ریتا ڈکشٹ کے ساتھ کالج کے پیچھے ایک چھوٹی سی کاٹج میں رہتی تھی' وہاں پہنچ کر وہ دونوں برآمدے میں بیٹھ گئے ۔ سامنے امرودوں کے اندھیرے باغ میں رکھوالا سگوں کو اڑانے کے لیے آوازیں لگا رہا تھا

جو رات کا بسیرا لینے کے لیے ٹہنیوں پر آن بیٹھے تھے۔

قریب ایک اور پروفیسر کوٹھی میں پیانو بج رہا تھا۔ چاند سوئمنگ پول کی لہروں میں تیرا کیا۔

گوتم بید کی کرسی پر بیٹھا کیلے کے جھنڈ کو دیکھتا رہا۔ چمپا کافی بنا کر لائی اور اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔

''چمپا باجی۔ آپ بہت گریٹ آدمی ہیں خدا کی قسم۔''

''واقعی؟''

''چمپا باجی۔ ایک بات بتلائیے۔''

''پوچھو۔''

''آپ بھیا صاحب کو کتنے عرصے سے جانتی ہیں۔''

''کئی سال سے۔''

''اور اتنے عرصے آپ نے کیا کیا؟''

''پڑھا اور کیا کیا!''

''اس کے بعد؟''

''اور پڑھا۔''

''اس کے بعد؟''

''بس پڑھتی چلی گئی۔'' چمپا نے جھنجھلا کر جواب دیا۔

''اور بھیا صاحب کو اتنے عرصے سے برداشت کر رہی ہیں؟ جب پہلے ملی ہوں گی تو سترہ اٹھارہ سال کی رہی ہوں گی۔ ان کا خیال آپ کے لیے ایک بڑی

رئیسانہ عادت میں شامل ہو چکا ہے گو آپ خود رئیس نہیں ہیں۔ میں آپ کو ایک بات بتلاؤں۔ آپ ذرا غور کرتیں تو معلوم ہوتا کہ آپ کا عشق ______"

"واہیات باتیں مت کرو۔"

"واہیات۔ غضب خدا کا آپ تو بڑی سخت بلو اسٹوکنگ نکلیں۔ ارے عشق میں کیا خرابی ہے؟ بڑی عمدہ چیز ہے' میں خود اس میں اکثر مبتلا ہو جایا کرتا ہوں مگر متوسط طبقے کی لڑکیوں کا قاعدہ ہے کہ اس طرح کے الفاظ کو بہت برا سمجھتی ہیں۔ چمپا باجی' سوری۔ اتنا سہانا سمے ہے' مجھے چاہیے تھا کہ آپ سے بجوا کر سنتا ستار پر گت باگیشری' تین تال اور یہاں میں نے آپ کے پرابلمز کا تجزیہ شروع کر دیا۔"

"یہ دوسروں کے پروبلمز کا تجزیہ کرنا بھی بڑا زبردست ریکٹ ہے اور آپ بھولتے ہیں کہ آپ کے جیسے طالب علموں کو روز کالج میں پڑھاتی ہوں۔"

"میں جانتا تھا کہ آپ یہی کہیں گی۔ ہماری ساری زندگی ایک سے پٹے پٹائے جملے دہراتے گزر جاتی ہے۔" وہ منہ لٹکا کر دریچے سے باہر دیکھنے لگا۔ "میں یہ بھی جانتا ہوں کہ رومینٹک ہونے کے لیے آپ کے بیا صاحب کون سے میزازم استعمال کرتے ہوں گے' کون سے جملے دہراتے ہوں گے۔ سنا ہے' فرنچ بہت فرسٹ کلاس بولتے ہیں۔"

"لیکن آخر تم بھیا صاحب سے اتنا چڑتے کیوں ہو؟" چمپا نے کہا وہ دفعتاً جھینپ گیا۔ اس قدر جھنیا کہ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"مجھے چڑنے دیجیے' آپ سے مطلب؟" وہ اپنے جارحانہ حربوں پر اتر آیا۔

اتنا مضبوط انسان اور اس قدر کمزور اتنا! چمپا نے حیرت سے سوچا۔

''مطلب یہ۔'' چمپا نے کہا'' کہ ہمارے گروپ کے سب لوگ بھیا صاحب کو بڑا بھائی سمجھ کر ان کی عزت کرتے ہیں۔ کم از کم تمہیں اس کا خیال تو کرنا چاہیے۔ تمیز بھی کوئی چیز ہے' یہاں آئے ہو تو ذرا تمیز بھی سیکھو۔ یہ کیا ہر سے بلڑ' دنگا' فوجداری۔ یہ چنڈو خانہ ہی کیا کم تھا کہ اوپر سے تم بھی نازل ہو گئے۔''

''بھیا صاحب سے اگر آپ بیاہ فرما رہی ہیں تو یہ دوسری بات ہے۔ آپ کا فرض ہے کہ ان کو آسمان پر چڑھا دیں' ہر ہندوستانی لڑکی یہی کرتی ہے۔''

''میں نے کب دعویٰ کیا تھا کہ میں امریکن لڑکی ہوں؟ اور دوسری بات یہ کہ۔''

''دوسری بات یہ ہے چمپا باجی کہ آپ ان سے بیاہ کرتی عجب مسخری لگیں گی۔ اپی کی اور بات تھی' وہ تو پیدا ہی اسی لیے ہوئی تھیں' مگر آپ_______ حد ہے۔''

اب چمپا جھینپی۔ ''میں آپ سے رائے نہیں لے رہی ہوں۔'' اس نے فی الفور بزرگی طاری کر لی۔

''میں رائے کب دے رہا ہوں؟ اگر آپ میں اتنی عقل ہوتی کہ مجھ سے رائے لیں تو یہ نوبت ہی کیوں آتی' مگر آپ ہیں کہ _ _ _ _ _ _ آہ _______ اس بظاہر سمجھ دار تعلیم یافتہ لڑکی کو دیکھو۔'' اس نے ٹہل ٹہل کر تھیٹریکل انداز میں کہنا شروع کیا: ''یہ معاشیات کی استاذ' ڈائیلکٹکس کی طالب علم، برس ہے کس مصیبت میں گرفتار ہے______ اے رومانیت کی شکار نادان کنیا۔''

کمرے کے وسط میں کھڑا ہو کر وہ دہاڑا۔

''گوتم تم بالکل دیوانے ہو۔'' چمپا نے محظوظ ہو کر کہا۔

''اب یعنی آپ مجھے میری دیدی یا موسی کی طرح پچکارا بھی کریں گی۔ میں کہتا ہوں، یہ تک کیا ہے؟ یعنی غضب خدا کا، جو شخص پابندی کے ساتھ کلب جا کر اولڈ والٹس ناچے، پکنکوں اور پارٹیوں میں کالج کی لونڈیوں کی مووی کھینچتا پھرے، خود لونڈیوں کی طرح حسین ہو اور قیامت یہ کہ اپنے حسن پر نازاں بھی ہو ______ اس کی آپ پسند فرماتی ہیں، اگر آپ کو عشق ہی کرنا منظور ہے تو مجھ سے ہی کر ڈالیے یا کمال اور ہری شنکر ہی میں کیا برائی تھی۔ ویسے ان کے علاوہ ہزاروں ہیں گو یہ علیحدہ بات ہے کہ میں بے حد منفرد ہستی ہوں۔'' اس نے ذرا انکسار سے اضافہ کیا، پھر دوسرے لمحے اس نے سنجیدگی سے کہنا شروع کیا۔ ''نہیں ' چمپا باجی مصیبت یہ ہے کہ آپ لوگ روایتوں پر جان دیتے ہیں۔ بس ایک دیو مالا کا ہونا ضروری ہے۔ آپ کی روایتوں پر جان دیتے ہیں۔ بس ایک دیو مالا کا ہونا ضروری ہے۔ آپ کی روایت، بھیا صاحب کے گلیمر کی روایت، گلفشاں اور سنگھاڑے والی کوٹھی کی روایت، دلکشی، کشش، جذب دل ______ مگر خالی دلکشی کا نتیجہ کیا ہے؟ کوئی تخلیقی کام ہی نہیں کرتیں۔''

''پڑھاتی جو ہوں۔'' چمپا نے خود کو اس قدر بے بس محسوس کیا۔ ایسا غیر متوقع، ایسا بے رحم حملہ اچانک اس پر کیا گیا تھا۔ اس کا زرہ بکتر ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا، وہ جو برسوں سے اپنے آپ کو، اپنے جذبات اور احساسات کو بے حد اہم سمجھتی آئی تھی، پل کی پل میں وہ خود کو بے حد قابل افسوس معلوم ہوئی۔ ''اب ہر ایک تو کلاکار نہیں بن سکتا'' اس نے با آواز بلند کہا۔

''کلا کار نہ بنئے ۔آج کل کلا کاروں کی تو فوج کی فوج ہر جگہ گھوم رہی ہے۔ کوئی بنیادی کام کیجئے ۔اتنا کچھ کرنے کو پڑا ہے۔''اس نے چاروں اور نظر ڈال کر تھکی ہوئی سانس لی۔''آپ کو نظر نہیں آتا؟''

''نظر آتا ہے''چمپا نے کہا''لیکن زندہ بھی تو رہنا ہے۔ملازمت کرتی ہوں مسلم اسکول میں ت و تین سو روپے مہینے کے ملتے ہیں' میرے ابا بہت معمولی حیثیت کے وکیل ہیں' میں تم رئیس زادوں کی طرح خالی غربت کی تھیوری سے واقف نہیں' مجھے تنگ دستی کی حقیقت معلوم ہے۔''

کسی اور موقعے پر اسے یہ گفتگو کرتے شرم آتی کیونکہ وہ خالص سفید پوش گھرانے سے تعلق رکھتی تھی لیکن گوتم اس کے سامنے فادر کنفیر کی طرح بیٹھا تھا۔ اس سے کون بات چھپائی جا سکتی تھی!

''اور بھیا صاحب سے بیاہ ہو گیا تو آپ بھی کلب جا کر اولڈ والٹس ناچیں گی اور رائڈنگ کے لیے جائیں گی؟''اس نے معصومیت سے پوچھا۔

و کیا میں سرخ جھنڈا لے کر سڑک پر دوڑ پڑوں' کس قدر رایلی منڑی باتیں کرتے ہو' جس طرح کی بحث تم مجھ سے کر رہے ہو۔ ایسی ہی بحثیں کرتے اسی لکھنو میں مجھے زمانہ گزر گیا ہے۔''

''تو گویا شادی آپ کے اقتصادی مسائل کا حل ہے۔شادی ہندوستان کی ہر لڑکی کے ذاتی اور عمرانی پرابلم کا حل تصور کیا جاتا ہے۔ چمپا بیگم میں تم کو اوروں سے مختلف سمجھتا تھا۔''

''انڈر گریجویٹ باتیں مت کرو۔''چمپا نے غصے سے کہا۔

''انڈر گریجو یٹ آپ کے یہاں بڑا بھاری طعنہ ہے۔ٹھیک ہے' لیکن اس سے یہ کب ثابت ہوتا ہے کہ آپ بھیا صاحب سے لو گائے بیٹھی رہیں۔ بتایئے تو آپ کو یہ صاحبزادے اس قدر پسند کیوں ہیں؟''

''پتا نہیں۔''اس نے کم عمر لڑکیوں کی طرح جھینپ کر کہا اور اسے سخت کوفت ہوئی۔اسے اپنی زندگی میں آج تک اتنی شرمندگی نہیں اٹھانا پڑی تھی۔

''اچھا' آپ کو اچھی شکلیں پسند آتی ہیں؟ شاعرانہ طبیعت ہے آپ کی!''پھر وہ ٹہلتا ہوا ہیٹ ریک کے آئینے کے پاس چلا گیا اور بھنویں اٹھا کر غور سے اپنا چہرہ دیکھنے لگے۔''مجھ سے بھی کوئی لڑکی اتنا ہی اتم عشق کر سکے گی؟ اگر دیکھا جائے تو میں ایسا بدصورت نہیں۔''

''شانتا تم سے اتم عشق نہیں کرتی؟''

اب گوتم اپنی جگہ بھونچکا کھڑا رہ گیا۔ چمپا کو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس کا زرہ بکتر ٹوٹ رہا ہے۔

''گوتم بہادر' تم بھی شیشے کے گھروں میں رہتے ہو' دوسروں پر پتھر پھینکنے سے پہلے یہ یاد رکھا کرو۔''

''تم کو شانتا کے متعلق کیا معلوم ہے؟''

''تم اس کو چاہتے نہیں ہو؟ جو کوئی بھی وہ ہے' جو تمہارے کزن کی بیوی ہے اور تم سے پانچ سال بڑی۔ہم کس کو ناصح سمجھیں اور خود کس کو نصیحت کریں؟ اور اب تم اس اپنی شانتا نیلمبر کو بھولتے بھی جا رہے ہو۔بہت دنوں سے تم نے اس کو خط لکھ کر یہاں کی رپورٹ نہیں بھیجی' وہ تمہاری ذہنی رفیق ہے۔تم اس سے شادی نہیں کر

سکتے ۔تم کسی سے بھی شادی نہیں کر سکو گے ۔نرملا سے بھی نہیں ۔گوتم بہادر یہ بڑے ادق معاملات ہیں ۔ یہاں تمہارے نظریے نہیں چل سکتے ۔ میں بھیا صاحب کو پسند کرتی ہوں ۔ان سے میری کوئی ذہنی رفاقت نہیں مگر گوتم بہادر مجھے تو تم بھی پسند ہو۔ بتاؤ اس کا کیا کیا جائے؟ انسانی رشتے بڑے انوکھے ہوتے ہیں ۔ مجھے رفتہ رفتہ تم بھی اچھے لگ رہے ہو۔ کیا میں فطرتاً فلرٹ ہوں؟ ہرگز نہیں ۔ ذرا باہر جا کر پوچھو میری کس قدر عمدہ ریپوٹیشن ہے ۔ مجھے دیبی کہا جاتا ہے ۔یقیناً میری طبیعت میں آوارگی نہیں مگر انسانوں کو پسند کرنے کی اہلیت رکھتی ہوں ۔اب جو میں نے اتنا بڑا کنفیشن کیا تو اس لیے کہ تمہارا شیشے کا گھر بھی ٹوٹ چکا ہے ۔ اسے تم نے افسوس خود ہی مسمار کر دیا ۔ کچھ دن اور ثابت رہ لینے دیتے اسے ۔ بڑا خوبصورت تھا ۔ بلور کا مندر جس کے اندر گوتم سدھارتھ کی موتی براجمان تھی ۔سارناتھ سے واقفیت ہے؟ سارناتھ میری زندگی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے ۔میں کاشی میں پیدا ہوئی تھی ۔''اس نے اداسی سے بات ختم کی ۔

اندھیرے میں وہ جس کشتی پر سوار تھا وہ کشتی طوفانی ریلے کے ساتھ کہاں سے کہاں پہنچ گئی' وہ دریچے میں چپ چاپ کھڑا رہا ۔

چمپا کو اس پر بڑا ترس آیا ۔ کیسا پیارا لڑکا تھا' اس میں ہری شنکر اور کمال کی کس قدر مشابہت تھی' ان ہی کا جیسا سنجیدہ اور شیطان ۔ یہ دونوں بھی کہاں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنے اپنے جیسے کروک دستیاب کراتے تھے ۔اسی کو دیکھو ۔ جنے کہاں سے بہتا بہاتا آنکلا ۔ آیا تھا کسی دیس سے اک ہنس بے چارہ ______ سلسلہ روز شب' نقش گر حادثات ______ نقش گر حادثات ____ نقش گر ___ وہ اپنے

ذہن کو خالی کر کے بہت سی بے ربط باتیں سوچتی رہی تاکہ اس جذباتی لینڈ سلائیڈ کو نظر انداز کر سکے۔

''تم کوشانتا کے متعلق کیا معلوم ہے؟'' گوتم نے دریچے میں کھڑے کھڑے غرا کر پوچھا' وہ اس سے لڑ رہا تھا' یعنی اتنا نزدیک آ چکا تھا کہ اسے ڈانٹے' اسے برا بھلا کہے اور اس سے لڑے' اس پر تنقید کرے۔ یگانگت کے اس احساس نے چمپا کو اور اداس کر دیا۔

''گوتم!'' اس نے کہا'' اس خوفناک' پٹے ہوئے جملے کو معاف کرنا مگر یہ کہ ہم سب کھلی ہوئی کتابیں ہیں۔ ہم میں سے کسی میں کوئی اسرار نہیں۔ تم مجھ سے کس قدر واقف ہو چکے ہو۔ ہر انسان بے حد exposed ہے۔ تیز روشنی میں ہے' وہ نیم تاریکی' وہ دھندلکا تم کو کہیں نہ ملے گا۔ جس میں جا کر بالآخر تم خود کو چھپا سکو۔ جب میں تم کو دیکھتی ہوں تو مجھے لگتا ہے میں بھی اسی تز روشنی میں کھڑی ہوں اور تم مجھ کو آر پار دیکھ رہے ہو لیکن میں تم کو خود آر پار دیکھ رہی ہوں' اسی لیے مجھے معلوم ہے کہ تم مجھے۔''

''____ آر پار دیکھ رہا ہوں ____ چمپا الفاظ کو ختم کر دو ____ الفاظ ہمیں کھا جائیں گے۔''

''الفاظ کو ختم کرو مگر معنی کے معنی موجود رہیں گے۔ بتلاؤ ہم کیا کر سکتے ہیں۔'' چمپا نے بڑے بے بسی سے کہا۔

بھیا صاحب کے لاشعور کا حال تو اللہ بہتر جانتا ہوگا' البتہ یہ ضرور ہے کہ جب تک وہ اپنی رخصت کے زمانے میں لکھنو میں رہے انہوں نے بالکل مون برت رکھ لیا۔ پہلے ہی وہ کون سی بات کرکے دیتے تھے مگر اب ان کی خاموشی کو مثال کے طور پر پیش کیا جاتا۔

''بھیا صاحب کو خاموشی میں بڑے افسانے چھپے ہوئے ہیں۔'' حمید بانو نے ایک روز انکشاف کیا۔

''واہ کیا بات ہے۔ افسانے نہیں جوتا چھپا ہوا ہے۔ لاحول ولا قوۃ' طلعت نے غصے سے جواب دیا۔ اس بورژوا رومانیت نے ہر طرف اودھم مچا رکھا تھا' خود حمید بانو ان دنوں بڑے زوروں پر شاعری کر رہی تھی۔ موضوع سخن ایک مبہم سا اور اس قدر مثالی کردار تھا جو شاید یونانی دیومالا کے لیے بھی تخلیق نہ کیا ہوگا۔

''ہمیں اس بورژوا ذہنیت کے خلاف سب سے پہلے جہاد کرنا ہے۔ جاگیردارانہ سماج نے جس طرح ذہنوں کی تشکیل کی۔'' طلعت نے نرملا سے کہنا شروع کیا۔

''اور ذرا سننا۔ قسم خدا کی۔ دل چاہتا ہے ان سب سے ایک پندرہ دن سڑکیں کٹوائی جائیں تو یہ ساری افسانویت تشریف لے جائے ـــــــ سنا تم نے یہ بھیا صاحب جو ہیں ہمارے مشہور و معروف۔ ی گوتم سے جلتے ہیں۔'' طلعت نے ایک روز نرملا کو خبر دی۔

''گوتم سے ـــــــ؟ ہائے رے۔ یہ تو بڑا لطیفہ ہے۔ کون جلے گا اس بے چارے سے۔ اس قدر تو وہ Defenceless ہے۔''

''اسے اپنے بچاؤ کی ضرورت ہی نہیں۔''طلعت نے کہا'' ہاں ہاں اور کیا______مطلب یہ کہ وہ تو______حد ہے بھئی۔''

ٹھگوں کی منڈلی کی مانند ان سب کو اپنی منڈلی سے شدکت کی وفاداری تھی۔ جو اس میں شامل ہوا باقی سب اس پر جان چھڑکنے کو تیار۔

''مگر کیا چمپا باجی تو کہیں۔''نرملا نے دفعتاً سوچ کر کہا۔

''ہشت' ایسی بچپنے کی باتیں مت کرو۔''

''اس میں بچپنا کیا ہے۔وقت کی بات ہوتی ہے۔''نرملا نے بے حد بزرگی سے کہا۔

''غلط۔''طلعت نے پرزور احتجاج کیا''چمپا باجی اب ایسی بھی ام میچور نہیں______اچھا تم گوتم سے کر سکتی ہو عشق؟''اس نے خوفناک طریقے سے پوچھا۔

''گوتم سے؟ حد ہوگئی' اتنی جان پہچان کے بعد اب اس کی گنجائش ہی نہیں رہتی عشق کرنے کے لئے میری جان تھوڑا سا اسرار چاہیے۔''

''اور اسی اسرار اور دھند لکے کے خلاف ہم لوگ جہاد کرنے والے ہیں۔''طلعت نے کہا۔''اور کیا۔''نرملا نے صاد کیا۔

''دراصل چمپا باجی کے اس مسلسل عشق نے ہم سب کی سائیکولوجی خراب کر دی ہے۔غضب خدا کا۔جب سے وہ یہاں آئی ہیں______یاد ہے ہم لوگ فرسٹ ایر میں تھے______تب سے یہ سلسلہ چل رہا ہے۔کس قدر تھرڈ کلاس بات۔''

''بے حد تھرڈ کلاس۔''نرملا نے دوبارہ صاد کیا۔

''اور سمجھ میں نہیں آتا کہ جب بھیا صاحب اتنے مصر ہیں تو یہ ان سے کر کیوں نہیں لیتیں شادی۔''

شام کا اندھیرا بہت جلد چھا گیا۔ ندی کے کنارے مندر میں چراغ جل اٹھے تھے۔ کشتی میں بیٹھا کوئی آرزو کی غزل گاتا جا رہا تھا۔ طلعت نے غور سے سننا چاہا لیکن الفاظ سمجھ میں نہ آئے مگر ایک بات سمجھ میں آ گئی۔ دور گیت گایا جا رہا ہو اور فاصلے کی وجہ سے اس گیت کے الفاظ سمجھ میں نہ آئیں تو کیسا لگتا ہے' وہ سیڑھیوں پر سے اٹھ کر اندر آ گئی۔ ''آؤ ترپ چال کھیلیں۔'' اس نے ہری شنکر سے کہا۔

''بھیا صاحب ابھی کلب میں ملے تھے۔'' اس نے صوفے پر سے اٹھتے ہوئے بتایا۔ ''پھر وہی قصہ۔'' طلعت نے بور ہو کر سوچا۔

''وہ ہم سے خفا ہیں کہ ہم نے گوتم کو اتنا لفٹ کیوں دے رکھا ہے' ہر سمے یہاں گھسا رہتا ہے۔''

''ماشاءاللہ سے۔'' طلعت نے کہا'' کیا یہ ہمارے گارجین ہیں۔''

''اب بہر حال ______ بڑے بھائی تو ہیں۔'' ہری شنکر نے طرف داری کرنا چاہی۔ وفاداریوں کی کش مکش اس کے سامنے تھی۔ بھیا سے وفاداری' گوتم نیلمبر سے وفاداری۔ غریب شنکر سر یواستوا کرے تو کیا کرے۔

''اور چمپا باجی کہاں ہیں۔''

''وہ تو کل سے ہسٹری کانگریس کے لیے الہ آباد گئی ہوئی ہیں۔''

اتنے میں سائیکل آن کر رکی اور گوتم نیلمبر آ موجود ہوا۔

''چمپا نہیں ہیں؟'' اس نے آتے کے ساتھ ہی سوال کیا۔

"نہیں، مگر ہم لوگ تو موجود ہیں ــــــ آؤ بیٹھو۔"

"یہ اطلاع دینے آیا تھا کہ خاکسار کا آب و دانہ یہاں سے اٹھ گیا۔"

"اب کہاں جاتے ہو" طلعت نے پوچھا۔

"یہی ذرا ولایت تک۔ اخبار بھیج رہا ہے۔ یہ سوچتا ہوں دو تین سال اگر وہاں ٹک گیا تو ساتھ کچھ پڑھ بھی لوں۔ بہت وقت برباد کیا ہے۔"

"یہی ذرا وولایت تک۔" طلعت نے نقل اتاری۔ "کس قدر رعب ڈال رہے ہیں جیسے ہم لوگ تو ولایت کبھی جا ہی نہیں سکتے۔ چلو تم، ہم سب آتے ہیں پیچھے پیچھے ــــــ"

"کیا وہاں بھی منڈلی سے چھٹکارا نہیں ملے گا، اگر یہ بات ہے تو ولایت کا سفر منسوخ، بندہ جاپان کا رخ کرے گا۔"

"ہم جاپان بھی آئیں گے۔"

"قصہ مختصر یہ کہ اب فرار حاصل کرنا مشکل ہے!"

"ظاہر ہے، پہلے ہی تمہاری شامت آئی تھی تو شہر کا رخ تم نے کیا، اب بھگتو۔"

"ذرا چمپا کو بھی خدا حافظ کہہ لیتا مگر وہ حضرت چھلاوے کی طرح غائب ہو جاتی ہیں۔"

"ارے تم پیرس ہی تو جا رہے ہو، تمہارا دیہانت تو نہیں ہو رہا پھر مل لینا ــــــ شنکر نے کہا۔"

"ہسٹری کانگریس کب ختم ہو رہی ہے۔"

"ہو جائے گی ختم ہفتے بھر میں، مگر اس کے بعد دسہرہ ہے، وہ سیدھی بنارس چلی

جائیں گی۔"

"یہ ہسٹری کانگریسوں میں جانے لگی ہیں؟"

"اور کیا۔اتنی قابل جو ہیں۔"

"یار بڑا افسوس ہو رہا ہے واقعی کہ تم جا رہے ہو۔" ہری شنکر نے کہا۔

"ہاں۔یار افسوس تو ہونا ہی چاہیے' میں اس قدر باغ و بہار آدمی تھا۔"

"طلعت ان دونوں کو باتیں کرتا چھوڑ کر اندر زملا کے پاس چلی گئی۔

"گرو جا رہا ہے۔"" اس نے کہا۔

"میں نے سنا ابھی۔" وہ رو رہی تھی۔طلعت حیران رہ گئی۔

"اری کس قدر مہا بیوقوف لڑکی ہے۔روتی کیوں ہے؟ شادی کر کے تو بھی ساتھ چلی جا۔تیرا تو اس کے لیے جانے کب کا پیغام جا چکا ہے۔"

"وہ بھلا مجھ سے کرے گا شادی۔چمپا باجی کا دم بھرتا ہے۔عمر بھر میرا مقابلہ ان سے کرتا رہے گا۔میں چمپا باجی کی پرچھائیں بن کر جیوں گی؟"

"چمپا باجی ______ چمپا باجی تم سے زیادہ برا کون ہوگا؟ اب جانے تم اور کس کس کی قسمت برباد کرو گی۔" طلعت دہلیز پر اکڑوں بیٹھ گئی۔"مت روا ے مہا بیوقوف۔" اس نے روندھی آواز سے کہنا چاہا۔برآمدے میں سے گوتم اور شنکر کے قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

طلعت چمپا سے اس روز سے زیادہ متنفر کبھی نہیں ہوئی۔

(۵۴)

یہ گوکل بے حد خوبصورت جگہ ہے مدھو ماتی ہوا میں جھولتی ہے پروائی کے جھونکے بچوں کی طرح کنج میں کلکاریاں بھرتے پھرتے ہیں۔ پھول ماں کی سوچ کی طرح خوبصورت ہیں۔ یہ گوکل، یہ منظر کس کے جلوے کا عکس ہے؟ تمہارے ماتھے کا تلک آسمان میں ڈوبتے سورج کے مانند جگمگاتا ہے۔ کل اس نے کہا تھا اور میں، کمزور عورت، مجھے اپنی طاقت کا احساس ہوا۔ زمین خاموش ہے۔ ساری کائنات جیسے دل ہی دل میں آہستہ آہستہ دعا مانگ رہی ہے۔ لڑکیاں گھاٹ پر پانی چھینک رہی ہیں۔ ان میں سے ایک لڑکی چلا اٹھتی ہے: ہری ____! ہری ______!! ایک لڑکی رو رہی ہے: گوپالا ______ وہ کہتی ہے۔ زندگی میں اس کی وجہ سے راحت ہے، زندگی میں اس کی وجہ سے اتھاہ دکھ ہے۔

ورندابن میرے انگ انگ میں رچ گیا ہے۔ صبح سویرے منڈیر پر رکھی ہوئی گاگریں دھندلکے میں جھلملاتی ہیں۔ گایوں کی گھنٹیوں کی آواز۔ سبز گھاس کی گرم گرم مہک۔ دودھ کے سفید جھاگ۔ جنگل کی ہریالی۔ میری آتما چین سے بھر گئی ہے۔ رات کو ستارے ورندابن پر جھک کر اسی چین کا جاپ کرتے ہیں۔ پرندوں کے پروں کی مدھم سرسراتی آواز اوم اوم کا کیرتن کر رہی ہے۔ میرے اندر سکون لہریں مار رہا ہے، جیسے چاندنی کی لہریں جمنا پر پھیل جاتی ہیں۔ رنگ ____ روشنی ____ موسیقی، کرشنا! کرشنا، موہن، ہری، نند لالہ، کانہا ____ اس کا ہر نام اس الوہی راگ کے نئے سر کی طرح بجتا چلا جا رہا ہے، وہی اس کو جان سکتے ہیں جو اس سے محبت کرتے ہیں۔

اور یکایک سنہری موسیقی کی بوچھاڑ میرے کانوں پر آن گری جیسے ہر سر کے

کنارے ایک ستارہ جل رہا ہوا اور پھر یہ پھوار تیز رنگوں والی دھنک میں تبدیل ہو گئی اور اس کی تیز جگمگاہٹ کی تاب نہ لا کر میں نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے' مجھے پتا نہ چلا کہ میں موسیقی کو سن رہی ہوں یا دیکھ رہی ہوں۔ اس سمے مجھے معلوم ہوا کہ سادھی کا مطلب کیا ہے' وہ لمحہ جب روح پرم آتما کے روبرو کھڑی ہو کر کہتی ہے ـــــ یہ میں ہوں۔

لڑکیاں گھاس پر راس ناچ رہی ہیں۔ ایک دو تین چار ـــــ ایک دو تین چار ـ ـ ـ ـ

ما ـــ آ ـــ دھا ـــ دا ـــ مادھو ـــ مادھو ـــ مادھو ـــ۔

بادلوں میں چھپی ہوئی دیبی کی طرح وہ گاگر اٹھائے آہستہ آہستہ جا رہی ہے۔ کامنی شری رادھے۔ کرشن کی سب سے بڑی بھگت اور گرو ـــــ رادھا کرشنا! تخلیق کائنات سے لے کر آج تک اس سے زیادہ خوبصورت موسیقی کسی نے سنی تھی؟ ورندابن پر بسنت کا سورج چمک رہا ہے۔ ہرن موسیقی کی تانوں کی طرح کلیلیں بھرتے پھر رہے ہیں۔ مرلی کی آواز بلند ہوئی۔ موسیقی اس کی آواز ہے' پھول اس کی مسکراہٹ' سمندر اس کے خیال کی وسعت' طلوع آفتاب سے پہلے کا آسمان اس کی سادھی کا سایہ۔ میں شرمیلا میں بھی گاؤں گی۔

کائنات گہری نیلی روشنی میں تیر رہی ہے۔ زمین' آسمان' خلاء اوم کی سنسناہٹ سے گونج رہا ہے شرمیلا؟

میرا نام اب شرمیلا نہیں۔ میں بھی کرشنا ہوں۔ ہر شے کرشنا ہے۔

میرے سامنے ایک نیلا سورج طلوع ہوا اور ساری فضا جگمگا گئی ـــــ اور

اس نے کہا ___ او بیوقوف گوپیو ______ تم جو پانچوں حواسوں کے جھمیلے میں گرفتار ہو۔ سنو اور جانو کے ہر شے فریب نظر ہے' ایک مکمل ورندابن جس میں میں آنکھ مچولی کھیلتا رہتا ہوں۔ درخت کے پھول نارنجی قمقموں کی مانند جگمگا رہے تھے اور رادھا کلی کا گچھا اس کی کالی لٹوں کے پاس جھکا تھا اور اس کی آنکھیں بھٹکی روح کو راستہ دکھانے والے ستاروں کی طرح جھلملا رہی تھیں' وہ سادھی میں کھو گیا اور اس کے جھکتے ہی شاخیں دوبارہ سرسرائیں' ستارے چمکے' ہوائیں بہنے لگیں۔ کیونکہ اس کے ساتھ ساتھ کائنات بھی سادھی میں کھو گئی تھی۔

اور کائنات سنگیت سے بھر گئی:

مراری ___ تینوں دنیاؤں کے نور ______ جے جے کرشنا

کچھ کو تو اپنے حسن سے اپنی اور کھینچتا ہے

کچھ کو بانسری کی آواز سے

کچھ کو تو اپنے خداوندی جلال کے ذریعے اپنا بندہ بناتا ہے [

کچھ کو اپنے قہر و غضب سے متاثر کتا ہے۔ گوپیوں نے کہا

کچھ کو تو میدان جنگ میں نیست و نابود کرتا ہے۔

کچھ کو اپنی آواز کے جادو سے سرشار کرتا ہے۔ گوپیوں نے کہا۔

مگر تیرا سب سے بڑا ہتھیار محبت ہے۔

جے کرشنا۔ جے جے کرشنا

اوم شانتی! شانتی! شانتی!!!

_____ موسیقی آہستہ آہستہ فیڈ آؤٹ ہو گئی۔ چمپا چونک اٹھی۔ اندھیرے

کمرے میں صرف ریڈیو کا ڈائل روشن تھا۔ ''ریحانہ طیب جی کی انگریزی تصنیف 'گوپی کے دل' کا ترجمہ آپ نے سنا۔ اب آپ کماری گیان وتی بھٹنا گر سے چندر کونس کا۔'' طاعت کی آواز آرہی تھی۔ چمپا نے ہاتھ بڑھا کر ریڈیو سیٹ بند کر دیا۔

پھر وہ دریچے میں جاکر شام کے آسمان کو دیکھنے لگی ______ کرشنا ___ کرشنا __ کرشنا ____ اس نے دل میں دہرایا۔ برابر کی کوٹھی میں کیرتن ہو رہا تھا' وہ کان لگا کر آواز سنتی رہی ۔وجدان کیا شے ہوتا ہے اور محبت ____ اور جنون خیز عشق _____ اور پرسکون احساس رفاقت ______ یہ سب کیا ہے؟ اور بھگتی _______ ریحانہ طیب جی 'اس مسلمان لڑکی نے بھگتی کے جس جذبے سے سرشار ہو کر یہ کتاب لکھی ہے اسے بڑے بڑے پنڈت بھی نہ سمجھ پائیں گے۔

یہ کیا شے ہے؟ میں ڈائیلکٹکس میں اس کا حل ڈھونڈوں گی۔

اور محبت ______

''خداوند _____!''

جے جے کرشنا۔ بنت بناؤں بن ناہیں آوے ہری کے بنا ______ ہری کے بنا _____ برابر کے کمرے میں کوئی لڑکی پوروی کا خیال گا رہی تھی۔

دفعتاً اس کی سمجھ میں اس کا مطلب آگیا ______ محبت دراصل فراق کو کہتے ہیں۔

گھاس پر لڑکیاں ٹہل رہی تھیں۔ سوشل روم میں پیانو بجایا جا رہا تھا' ہر طرف

گوپی کا دل نظر آ رہا تھا۔

''بجیا______ کیا کر رہی ہیں۔'' حمید بانو نے کھڑکی میں سے ڈال کر اندر جھانکا____ ''پروفیسر بنرجی کے یہاں آپ کا انتظار کیا جا رہا ہے۔''

''ارے۔'' اس نے چونک کر گھڑی دیکھی۔ سارے میں جنم اشٹمی کا تہوار منایا جا رہا تھا۔ ہوا میں طوفان لرزاں تھے۔ باغوں میں جھولے پڑے تھے جن میں کنہیا کو جھلایا جا رہا تھا۔ دور سڑک پر ایک ٹولی کیرتن کرتی جا رہی تھی۔ اوم جے جگدیش ہرے____ بھگت جنو کے سنکٹ____ چھن میں دور کرے______

وہ اتر کر نیچے آئی اور سائیکل اٹھا کر حمید بانو کے ساتھ بادشاہ باغ روانہ ہوگئی______ پروفیسر کے یہاں بہت بڑا مجمع تھا۔ اسے ذرا حیرت ہوئی۔ شاید جنم اشٹمی کی تقریب منائی جائے گی۔ اس نے سوچا۔ وہ ابھی تک ورندا بن میں گھوم رہی تھی _ _ _ _ڈائریکٹ ایکشن _ _ _ _ _ کلکتہ ______ کلکتہ______ دو ہزار موتیں۔

''یہ کیا باتیں ہو رہی ہیں؟'' خواب سے اس کو کسی نے جھنجھوڑ دیا' سامنے دیکھا گوتم بھی موجود تھا اور چند کاغذات پر جھکا جلدی جلدی کچھ لکھ رہا تھا۔

''کیا ہوگیا۔'' اس نے گھبرا کر پوچھا۔

طلعت نے غصے سے اسے دیکھا۔ ریڈیو اسٹیشن سے وہ بھی سیدھی وہیں پہنچی تھی اور اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ ''جو کچھ ہوگیا چمپا باجی وہ آپ کو خود ہی معلوم ہوا جاتا ہے۔''

''ہم امن چاہتے تھے' ہم امن چاہتے ہیں' ہم لڑنا نہیں چاہتے' ہم ہرگز نہیں

لڑیں گے۔'' گوتم آہستہ آہستہ بڑی گمبھیر آواز میں کہہ رہا تھا۔ اس نے نظر اٹھا کر چمپا کو دیکھا بھی نہیں، وہ اپنے کام میں مصروف رہا۔

''لیکن ڈائریکٹ ایکشن۔'' کسی نے جوش سے کہا۔

''بکواس مت کرو۔'' ہری شنکر نے کہا۔

''ذرا اپنے لیڈروں سے جا کر پوچھو چمپا بیگم، اب یہ کیا ہو رہا ہے۔'' کسی اور نے اس کے قریب آ کر کہا۔

چمپا نے ہڑبڑا کر چاروں طرف دیکھا۔ میرے لیڈر ______ اس کا حلق سوکھ گیا۔

''ہاں ہاں۔ تمہارے لیڈر ______ بڑے زوروں سے لیگ کو ووٹ دینے گئی تھیں۔ نریندر نے کہا۔

''یہ غلط ہے۔'' اس نے آہستہ سے کہا، اس نے گوتم کی طرف دیکھا لیکن گوتم نے چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔

''اگر غلط ہے تو کل اخبار میں بیان دو گی؟ بتاؤ۔'' نریندر نے گرج کر کہا۔

''چلو یہاں سے چلیں۔ ہمارے گھر چلو ______ وہاں بیٹھ کر طے کریں گے۔''

''طے کریں گے کہ چمپا بیگم کو پھانسی پر چڑھایا جائے یا نہ چڑھایا جائے۔'' چمپا نے تلخی سے کہا۔

مجمعے نے اسے گھور کر دیکھا۔

''رشیدہ آپا کے یہاں چلو۔''

''رشیدہ آپا کیا کر لیں گی اور تم۔'' ایک اور شخص (یہ سب پھر سفید بلینک چہرے تھے) ہری شنکر کی طرف مڑا۔ ''بڑے کمیونسٹ بنے پھرتے تھے بے چارے ـــــ پاکستان کا مطالبہ عوامی مطالبہ ہے۔'' وہ پھر اخبار پر جھک گئے۔

''اب خالی امن کی اپیلیں پر آج تک دنیا میں کسی نے عمل کیا ہے؟''

''ہم نہیں لڑیں گے۔'' گوتم نے دہرایا۔

''ہونہہ۔ گاندھی وادیوں سے زیادہ بڑا افراڈ کہیں نہیں دیکھا۔'' تیسرے نے کہا۔

وہ پھر واپس لوٹی۔ کیلاش ہوسٹل میں یونین کا ہنگامی سیشن ہو رہا تھا' وہ وہاں سے آگے بڑھی۔ چاند باغ کے چیپل سے آرگن کی آواز بلند ہو رہی تھی اور ہال میں ''جنگلی ہنس'' کی ریہرسل کی جارہی تھی۔ رائے بہاری لال روڈ پر سے گزرتے ہوئے اس نے مکانوں پر نظر ڈالی۔ اس کو خوش آمدید کہنے والا دروازہ کہیں موجود نہ تھا۔ اپنے کمرے میں واپس پہنچ کر اس نے گوتم کو فون کرنے کے لیے ریسیور اٹھایا۔ ''کون ہے؟'' گوتم کی تھکی ہوئی آواز سنائی دی' وہ شاید ابھی ابھی اپنے گھر لوٹا تھا۔

''ہلو۔ میں نے سوچا تم سے بات کر لوں۔''

''کیا بات ـــــ'' گوتم نے ذرا جھنجھلا کر پوچھا۔

''تم ـــــ تم بھی سمجھتے ہو کہ میں ری ایکشنری ہوں۔''

''میں کچھ نہیں سمجھتا چمپا رانی ـــــ یہ وقت ذاتی مسائل اور الجھنیں حل کرنے کا نہیں ہے' اگر تم اپنے مسائل کے باوجود دھارے کے ساتھ رہنا چاہتی ہو

تو یہ بہت بڑی بات ہے اور اگر نہیں تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟''

ہم ــــــ گوتم گروہ کی طرف سے بول رہا تھا' وہ پھر تنہا تھی۔

''لیکن میں تمہارے ساتھ چلنا چاہتی ہوں۔''

''میرے ساتھ؟''

''ہاں''

وہ بڑا متعجب ہوا۔ ''چمپا میں پیرس نہیں جا رہا ہوں۔''

چمپا کو بڑا سخت صدمہ ہوا' وہ اسے کس قدر غلط سمجھنے پر تلا ہوا تھا۔

''گوتم نیلمبر تمہارے ساتھ پیرس جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' میں کہہ رہی ہوں تم لوگ ریلیف ورک کے لیے کلکتے جا رہے ہو کل' میں بھی ساتھ چلنا چاہتی ہوں۔''

''کہاں ماری ماری پھرو گی؟ جان کا خطرہ الگ ہے! اور تمہارے ابا بنارس سٹی مسلم لیگ کے صدر ہیں' کیوں ان کا نام ڈبوتی ہو۔''

''تم بھی مجھے طعنے دینے شروع کیے۔''

''میں نے بھی!! کیوں' مجھ میں کوئی خصوصیت ہے؟ میں اور سب کی طرح ہوں' ان کے ساتھ ہوں۔ چمپا رانی یہ سمجھ لو ــــــ سنگھ بڑی چیز ہے اور آخری حقیقت ہے۔ تنہا' فرد واحد کی حیثیت سے تم اپنے خول میں جا گھسو تو اس کا ہمارے پاس کوئی علاج نہیں۔''

''تم نے پھر نظریاتی بحث شروع کر دی۔ اچھا' شب بخیر گوتم ــــــ'' چمپا نے جھنجھلا کر فون بند کر دیا۔

دوسری صبح اسے معلوم ہوا کہ گروہ سر پر کفن باندھ کر کلکتے روانہ ہو گیا۔

نرملا، طاعت، تہمینہ سب چلی گئیں، صرف وہ اکیلی رہ گئی۔

مہینے گزر گئے۔

گروہ کلکتے کے بعد اب بنگال اور بہار کے سارے علاقے میں امن امن کی رٹ لگاتا پھر رہا تھا۔ رات کو گاندھی جی کے ساتھ بیٹھ کر وہ رگھوپتی راگھو راجہ رام الاپتے، دن میں زخمیوں کی مرہم پٹی کرتے۔ لڑکیاں واپس آ چکی تھیں۔ لکھنو کی زندگی معمول کے مطابق جاری تھی۔ مزید ڈرامے، مزید پارٹیاں، مزید کانفرنسیں۔ ایک روز چمپا نے اخبار میں پڑھا کہ بہار میں پھلگو ندی کے کنارے بلوائیوں نے چند ورکرز پر حملہ کر دیا۔ جو لوگ زخمی ہوئے ان میں کمال اور شنکر اور گوتم بھی شامل تھے۔ چمپا نے گھبرا کر سائیکل اٹھائی اور گلفشاں روانہ ہو گئی۔ پھاٹک پر سے اس نے دیکھا کے اسٹیشن ویگن میں سامان لد رہا ہے۔ تہمینہ اور طلعت اور نرملا سفر کے لیے تیار کھڑی ہیں۔ میاں قدیر گھبرائے گھبرائے پھر رہے ہیں۔ اخبار کی اطلاع دو تین روز پرانی تھی۔ تہمینہ نے اسے بتایا کہ خوش قسمتی سے شنکر کے چاچا اس وقت گیا میں موجود تھے۔ اور ان تینوں کو موٹر پر لاد کر گورکھپور لے گئے جہاں کے وہ سول سرجن تھے اور اب وہ تینوں بھی گورکھپور جا رہی تھیں۔

"خیریت سے ہیں وہ لوگ۔" چمپا نے تشویش سے پوچھا۔

"گوتم کی آواز تو یہی ظاہر ہوتا ہے۔ ابھی میں نے ٹرنک کال کیا تھا۔"

"حالانکہ چوٹ سب سے زیادہ اسی کو آئی ہے، چاچا کہہ رہے تھے فون پر۔" نرملا نے اضافہ کیا۔

''چمپا تم بھی چلو۔'' تہمینہ نے کہا' وہ مصروفیت سے جھکی اور اٹیچی کیس بند کر رہی تھی۔

''تم پچھلے دنوں اتنی الگ تھلگ رہیں کہ ہم سمجھے بہت مصروف ہو۔''

''میں نہ تم سب کی طرح کتابیں لکھتی ہوں نہ گاتی بجاتی ہوں' ووائے پڑھانے کے میری مصروفیت کیا ہوسکتی ہے۔''

''کالج تو بند ہے تمہارا' چلو ہمارے ساتھ چلو' ہم واپسی میں تم کو بنارس چھوڑتے آئیں گے۔'' تہمینہ نے کہا

چنانچہ چمپا کو گروہ نے پھر واپس بلا لیا۔

تینوں لڑکے سول سرجن صاحب کے بنگلے کے پچھلے چوڑے برآمدے میں لیٹے ہوئے گلا پھاڑ پھاڑ کر گا رہے تھے _____لوچلو ہے نا گوری _______جول پائے گوری دھامے _____ تینوں بہت زخمی ہوئے تھے لیکن بے حد ہشاش بشاش تھے۔ دن بھر وہ پڑے دنیا بھر کے گانے گایا کرتے: اپٹا کے گیت' بنگالی کورس' راجستھانی اور گجراتی لوک گیت' فلمی گانے۔ لڑکیاں پہنچ گئیں تو اب دن بھر رمی کھیلی جاتی۔ شنکر کے چاچا نے حکم دے رکھا تھا کہ روزانہ اخبار ان لوگوں کے نزدیک نہ آنے پائے' ریڈیو کی خبریں ان کے کان میں نہ پڑیں۔ بڑے اہتمام سے کوئی لڑکی رات کو اخبار اسمگل کرلاتی۔ گوتم روز خبروں کے ساتھ ساتھ اپنے مستقبل کے پروگرام بدلتا رہتا۔ اس کے بائیں ہاتھ کی انگلیوں پر ابھی پلاسٹر چڑھا ہوا تھا۔ ''پتا نہیں میں اپنی یہ تین انگلیاں استعمال کرسکوں گا یا نہیں۔'' وہ بعض دفعہ اداسی سے کہتا۔ ''چمپا'' ایک روز اس نے چلا کر کہا'' ذرا سوچ سکتی ہو کہ اب

میں پیانو کبھی نہیں بجا سکوں گا''

''کیوں نہیں بجا سکو گے؟ یار مور بڈ نہ بنو۔ کیا ڈریا مہ کھیل رہے ہو۔'' کمال نے کہا' اس کی اپنی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی۔

''اب بہرحال' کیا ہو سکتا ہے۔''

جب وہ تینوں چلنے پھرنے کے لائق ہوئے تو واپسی کی تیاری شروع ہوئی۔

''چلو پہلے ذرا آوارہ گردی کریں' جانے ادھر پھر کب آنا ہو۔'' کمال نے کہا کمال کو اب چپ لگ گئی تھی' وہ بیٹھے بیٹھے بالکل مراقبے میں چلا جاتا مگر گوتم کو مور بڈ نہ بننے کی نصیحت کرتا۔

''ہم کو یہاں کے دیہات کے حالات دیکھنے چاہئیں' ہم مرزا پور بھی جائیں گے جو ہماری کمرن کا گھر ہے۔''

''مرجاپور میں اور ن ٹھون رن کاشی ہمار وگھاٹ ______'' گوتم نے ہنس کر چمپا کو دیکھا' وہ اداسی سے مسکرائی۔

یہ علاقہ بڑا دلفریب تھا۔ سرسبز اور پرسکون۔ یہاں کے لوگ بے حد دلکش تھے۔ معصوم اور پرامن۔ رام دیا اور رام اوتار اور رکدیر اور کمرن کا دیس۔ یہاں چاروں طرف جولاہوں اور ٹھاکروں کی بستیاں تھیں اور قصبات میں زمینداروں کی حویلیاں اور شہروں میں پیلے رنگ کی اداس کوٹھیاں جن میں مرنجاں مرنج ڈپٹی کلکٹر رہتے تھے۔

وہ چھوٹی لائن کی ایک ٹرین پر سوار ہو گئے۔ برج مان گن اسٹیشن پر گاڑی رکی' یہاں ہری شنکر کی موسی ڈھیروں پھل پھلاری اور ناشتے کے انبار لے کر

پلیٹ فارم پر موجود تھیں۔

"یہاں سے ذرا آگے کپل وستو ہے۔ چلو وہاں ہوتے آئیں۔" چمپا نے تجویز کیا۔

"میں ایک زمانے میں بدھسٹ تھا بڑا بھاری" کمال نے اداسی سے کہا۔

"کہاں جنگلوں میں ماری ماری پھرو گی چمپا بیگم ______" گوتم نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

بہت لمبا سفر باٹے ______ "شنکر کی موسی نے کہا۔" یہاں موٹر و ٹر نہیں ملت ہے۔"

وہ خود بہلی پر آئی تھیں۔ یہاں صرف ہاتھی سواری کے لیے ملتے تھے ______ ترائی کے ہاتھی' وہ ہاتھیوں پر بیٹھ کر کپل وستو پہنچے' گاؤں والے ان کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

دور ہماوت کی گلابی چوٹیاں دھوپ میں جھلملا رہی تھیں۔ چاروں اور سرخ چھتوں والے مکان تھے اور آم کے باغ اور بانس کے جھنڈ۔

کپل وستو کے کھنڈروں میں پہنچ کر چمپا نے چاروں طرف نظر ڈالی۔ کمال بڑی تندہی سے ایک پتھر کو رومال سے صاف کرنے لگا' اس پر لکھا تھا:

"مہاراجہ پیاداس نے اپنے جلوس کے اکیسویں سال بہ نفس نفیس یہاں آ کر عبادت کی کیونکہ اس جگہ بدھ شاکیہ منی پیدا ہوا تھا۔ کیونکہ یہاں بدھ نے جنم لیا اس وجہ سے اس گاؤں کی مالگزاری معاف کی جاتی ہے۔"

اب یہاں وہ کنول کے تالاب اور سنہرے ہرنوں کی ڈاریں اور درختوں کے

کنج اور چنبیلی کے پھولوں سے گھری ہوئی بارہ دریاں کہاں ہیں؟ چمپا نے اپنے آپ سے پوچھا' وہ ان سب سے ذرا الگ ایک پتھر پر بیٹھی تھی۔ یہاں تو ویرانہ ہے اور یہاں گیدڑ راتوں کو چلاتے ہیں۔ یہاں فصیل کی ٹوٹی پھوٹی دیواریں تھیں اور مٹی کے ٹیلے اور شکستہ چوکور تالاب۔ مہارانی ماما دیوی کے محلات سرخ اینٹوں کے ایک بڑے سے ڈھیر کی شکل میں چاندنی میں نظر آرہے تھے۔ قریب روہنی ندی اس سکون سے گنگناتی ہوئی بہہ رہی تھی گویا کوئی بات ہی نہیں۔

''یار بڑا سناٹا ہے۔'' کمال نے یکلخت گھبرا کر کہا۔

''بڑا شدید سناٹا ہے۔'' ہری شنکر نے جواب دیا۔ ''چلو اب واپس چلیں۔ ہاتھی ہمارے منتظر ہیں۔''

گوتم نے کیمرہ اتر کر ہاتھ میں لے لیا۔ ''دن کا وقت تو تصویریں ہی کھینچتا۔'' اس نے اور زیادہ بور ہو کر کہا۔

کمال منہ لٹکائے بیٹھا رہا۔

''شنکر یار تاریخ بڑا زبردست فراڈ ہے۔ تاریخ ہمیں برابر دھوکہ دیتی ہے۔'' اس نے کہا۔

''ہاں۔ٹھیک کہتے ہو۔'' شنکر نے حسب معمول اس کی رائے سے اتفاق کیا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتے ہاتھیوں کی طرف آئے' ان کے سائے چاندنی میں مہارانی مایا دیوی کے محل کے کھنڈروں پر سے گزرتے بڑے عجیب لگے۔

۵۵

واپسی میں چمپا بنارس اتر گئی۔ کینٹونمنٹ کے اسٹیشن پر پہنچ کر اس نے ساتھیوں کو خدا حافظ کہا اور تانگے میں بیٹھ کر گھر کی سمت روانہ ہوئی۔ درگا پوجا اور رام لیلا کا ہنگامہ شروع ہو چکا تھا' اس نے اپنے شپر پر نظر ڈالی: تپلیشور ______ اس نے کہا۔ ابدی کاشی ______ کاشی مجھے اپنی پناہ میں رکھ۔

اپنے محلے میں پہنچ کر اسے دور سے اپنے گھر کا چھوٹا سا پھاٹک دکھائی دیا۔ گلابی جاڑوں کی رات تھی۔ اس کے مکان میں روشنی ہو رہی تھی' جس طرح اندھیرے سمندر میں جہاز روشن ہوتا ہے' وہ اندر پہنچی۔ ایک رشتے کی بہن کی شادی کا ہنگامہ تھا۔ چوطرفہ غل مچ رہا تھا۔ دالان میں روئی کے پردے چھٹے تھے۔ اندر تخت پر میراسنیں چڑھی بیٹھی تھیں' وہ جا کر ایک نیم تاریک صحنچی میں کھرے پلنگ پر لیٹ گئی جس کی پائنتی کسی مہمان بی بی کا بچہ دلائی میں لپٹا بےخبر سو رہا تھا۔ دالان میں سے بوا حسین باندی کی پارٹ دار آواز بلند ہو رہی تھی:

اس نے کہا: تو کون ہے؟
میں نے کہا: شیدا ترا
اس نے کہا: کرتا ہے کیا؟
میں نے کہا: سودا ترا

آنگن کی دیوار پہ پھر عورتوں کے چلتے پھرتے سائے لرزاں رہے' کسی نے زور سے آفتاب چوکی پر رکھا۔ صحنچی میں کوئی بچی سوتے میں روئی۔

میراسنوں نے گانا گایا:

اس نے کہا: کرتا ہے کیا؟

میں نے کہا: سو دا ترا

ان کی آواز بہت سے بے معنی الفاظ دہراتی رہی' پھر ایک نوجوان میراسن نے گانا شروع کیا: اٹریا پر چور' بھوجی دیا تو جلاؤ' پھر سمندرھنوں کی گالیاں شروع ہوئیں۔ اس کے بعد سہاگ گایا گیا' وہ آنکھیں بند کیے یہ ساری آوازیں سنتی رہی۔ باورچی خانے میں تیل کا چراغ جل رہا تھا۔ چاروں طرف دھوئیں کی کالونچ تھی اور بھگار کی مہک۔

گھر___ گھر____ اپنا گھر____

پھر رات کا سناٹا چھایا اور ایک بیل گاڑی کھڑکی کے نیچے سڑک پر چرخ چوں کرتی گزری۔ اس کے پہیوں سے وہ عجیب وغریب سمع خراش آواز نکل رہی تھی' اسے یاد آیا بچپن میں جب وہ گنگا پار اپنے نانا کے گاؤں شیخم پور جایا کرتی تھی تو ایک مرتبہ رسولن مہری نے کہا تھا: جانو جئے ای گاڑی ماسے اسی آواز نکلی جانو بھوانی خفا ہوئیں_____ براشگون ہو____ بہتے براشگون____

دفعتاً اس کا دل دھڑکنے لگا۔ کیا ہوگا؟ کیا ہونے والے ہے؟ اور اس کے منطقی وجود نے اسے سمجھایا: کچھ نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اب ایسا بھی اندھیر نہیں مچا ہے کہ _____ مگر کمال کی انالس تو یہ ہے _____ اونہہ کمال کو مارو گولی_____ کیا اس کی انالس صحیح ترین ہے اور یہ کیمونسٹ کیا کہتے ہیں____ ہونہہ' ان کی بھلی چلائی_____ سوچتے سوچتے گوتم نیلمبر کا فلسفہ کمال کا جوش و خروش' طاعت کی تیز گفتاری' تہمینہ کی پرسکون شخصیت ____ سب ایک ایک کر کے اس کے ذہن میں آئیں اور وہ خود کون تھی؟ کیا

تھی؟اس کولوگ کیا سمجھتے تھے؟ گوتم اس کو کیا سمجھتا تھا؟ گوتم کی رائے اس قدر عزیز کیوں ہے؟ جہنم میں گیا وہ____ اور عامر رضا____ عامر رضا____

صبح کو وہ دن چڑھے تک سوتی رہی۔

دن گزرتے گئے۔سروپ نکھا کی ناک کٹی ۔راون جلا۔بھرت ملاپ ہوا۔ دبلے پتلے لڑکے منہ پر سیروں غازہ اور سفید پوتے' پنی کے نقلی تاج پہنے' رام اور لچھمن بنے بڑی تمکنت کے ساتھ تخت رواں پر سوار ہوئے۔انسانوں کو ان میں خدا کا جلوہ نظر آیا۔چھٹیاں ختم ہونے پر وہ لکھنو واپس آ گئی۔زندگی جاری رہی' پھر کوار کے مہینے میں اماوس کی کالی راتوں کو دیپ مالیکا نے روشن کر دیا چھوٹی اور بڑی دیوالی منائی گئی۔گھر گھر لکشمی کی تقدیس کی گئی۔آج لوقا چماری کی عملداری ہے۔ گلفشاں کے برآمدے میں خالہ بیگم نے اظہار خیال کیا۔بچو' باہر مارے مارے مت پھرو۔آج کی رات جانے کتنے جادو ٹونے ہوں گے؟ سامنے چوراہے پر ایک دونے میں مٹھائی رکھی تھی اور چراغ جل رہا تھا۔جانے کون وہاں رکھ گیا تھا۔ یاد ہے ایک مرتبہ جادو کی ہنڈیا اڑتی ہوئی آئی تھی اور ہماری احاطے میں گری تھی۔ طلعت نے کہا' وہ گھاس پر آ کر آسمان کو دیکھنے لگے۔آج کی رات لکشمی اپنی سواری کے الو پر بیٹھی ساری دنیا پر پرواز کرتی پھر رہی ہے۔جانے وہ کس کس کے دروازے میں داخلہ ہوگی۔

''باہر گھاس پر مت جانا بچو۔'' خالہ بیگم نے پھر آواز لگائی۔''برسات کا سانپ دیوالی کا دیا چاٹ کر بلوں میں جاتا ہے۔''

جگہ جگہ چوراہوں اور گلیوں میں جوا ہوا۔رام اوتار اور قدیر جوا کھیلنے گئے۔

(ارے اگر آج جوا نہ کھیلا تو اگلے جنم میں چھچھوندر کی جون ملے گی رام اوتار نے کہا) پھر بھیا دوج کا تہوار آیا۔ ہری شنکر قالین پر چڑھایا بیٹھا تھا اور نرملا اس کے ماتھے پر تلک لگا کر اس کے سامنے مٹھائی پروس رہی تھی۔ گنگا کے بھائی یم کی طرح میرا بھیا امر رہے۔ اس نے منتر دہرایا پھر اگہن اور پوس کے پالے نے درختوں پر چاندی کے پتر چڑھا دیے۔ گاؤں میں نوٹنکیوں کے گیت گونجے۔ چوپالوں میں مہابھارت کے قصے دہرائے گئے۔ سفید اٹنگی ساریاں پہنے عیسائی عورتیں گاتی پھریں: اوہو مسیح آیا سر آسمان _____ سر آسمان سر آسمان _____ کھچڑی کا تہوار آیا تو لوگ ماگھ میلا نہانے تربینی چلے۔ بسنت پنچمی میں گھر گھر سرسوتی پوجا کی گئی _____ انسانوں نے اپنے تخیل میں دیکھا کہ گورے رنگ کی دیبی سفید ساری پہنے سفید کنول پر بیٹھی شفاف الوہی پانیوں پر تیر رہی ہے۔ کمہاروں کے ہاتھ کی بنائی ہوئی مٹی کی مورت میں بھی انہیں خدا کا جلوہ نظر آیا' پھر پھاگن کی رت آئی۔ شوراتری کی تیاریاں کی گئیں۔ نرملا نے سنگھاڑے والی کوٹھی کے ٹھاکر دوارے میں بلوا کی پتیاں' دھتورہ اور چاول تھالی میں رکھ کر شو کی آرتی اتاری۔ محرم کا ہنگامہ ہوا۔ گھر گھر گھاس اور موم ارکاغذ کے تعزیے تیار کیے گئے۔ انسانوں نے اپنی ساری صناعی ان پر ختم کر دی۔ ان کاغذ اور پنی اور ریشم کے گہواروں' تابوتوں اور تعزیوں میں بھی انہیں خدا کا جلوہ نظر آیا۔ امام باڑوں میں چراغاں ہوا۔ گلی کوچوں سے پیلو اور سوہنی اور درگا نوحہ خوانی کی آوازیں بلند ہوئیں۔ ساری فضا نے غم کا لبادہ اوڑھ لیا ہر شخص حسین کا سوگوار بنا۔ (سبطین آباد کے امام باڑے میں آٹھویں کی مجلس کے بعد ایک عیسائی فقیرنی نے چمپا کا دامن پکڑ کر کہا: مولا کے نام

پر ایک ڈبل دیتی جائیے۔) شاہ نجف کے امام باڑے میں چراغاں کے روز حسب معمولی برقی قمقموں سے بنے ہوئے حروف میں ''ہنر میجسٹی کنگ غازی الدین حیدر'' کا نام جگمگایا۔ مارچ کے مہینے میں ساری فضا گلال اور عبیر سے سرخ ہوگئی۔ کرشنا کی مورتی کو جھولوں میں بٹھالایا گیا۔ صبح صبح بون فائر میں راکھشی ہولکا جلی۔ ہلیارے سڑکوں پر کبیر گاتے پھرے۔

یہ سب دماغ کا دھوکا تھا' ذہن کا فریب' نظر کا بہالوا۔ کسی چیز کے کوئی معنی نہیں تھے صرف ذاتی مسرت اصل چیز تھی۔ جہاں ملے' جس قیمت پر ملے ذاتی مسرت حاصل کرو۔ تمہارے اصول' تمہاری جیل یاترائیں' تمہاری کانگریس' تمہاری مسلم لیگ ______ سب بکواس ہے تم لوگ جو انسانیت کی قسمت کا فیصلہ کروانے چلے ہو۔ مارا ماری میں انسانوں کا منوں خون بہہ گیا۔ نہیں مجھے صرف ذاتی مسرت چاہیے۔ گھر' سکون' بچے' شوہر کی محبت۔

تم کیا افسوسناک باتیں سوچ رہی ہو چمپا بیگم۔ شرم کرو ____ اس کی منطقی وجود نے جو کھڑکی میں ٹانگیں لٹکائے بیٹھا تھا' پلٹ کر اس سے کہا ____ شرم کرو ______ شرم کرو فضاؤں میں آواز بازگشت گونجی۔ بھادوں کے جھالے اسے یہی سناتے ہوئے معلوم ہوئے۔ سیاہ بادلوں نے چاروں اور سے بڑھ کر اسے اپنے میں سمیٹ لیا۔ اس قدر زبردست ریلا آیا کہ زمین آسمان ایک ہوئے' ندی نالے جل سے بھر گئے' گوڑ ملہار کی تانوں میں دنیا بھر کا درد سمٹ آیا' پروائی کے جھونکوں نے دل کو کاٹ کاٹ ڈالا۔

وہ درختوں کی ٹہنیاں سامنے سے ہٹاتی سڑک پر آ گئی۔ سامنے پروفیسر بنرجی

کی کوٹھی تھی۔ ان کے ڈرائنگ روم میں بہت بڑا مجمع تھا۔ آج کے دن دنیا میں بڑے اہم فیصلے ہوئے تھے۔ (یہ لوگ فیصلے کرتے وقت میرے متعلق کیوں نہیں سوچتے؟ میں چمپا احمد جو یہاں تنہا کھڑی ہوں)۔ ڈرائنگ روم کے پردوں کے پیچھے وہ سب موجود تھے' وہ آہستہ آہستہ چنبیلی کی بھیگی جھاڑیوں میں سے گزرتی دریچے کے نیچے آ کر کھڑی ہوگئی اور اس نے اندر جھانکا۔ پروفیسر سفید دھوتی اور کرتے میں ملبوس سیٹی پر چپ چاپ بیٹھے تھے۔ گوتم بھی تھا اور کمال بھی۔ گوتم نئے ہندوستانی سفارت خانے کے ساتھ ماسکو جارہا تھا۔ کمال فلیٹ اسٹریٹ میں پاکستان کے نظریے کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے کے لیے لندن بھیجا جارہا تھا کہ آج معلوم ہوا کہ پاکستان کا مطالبہ منظور کرلیا گیا۔ ملازمت پیشہ لوگ اب اس فکر میں غلطاں پیچاں بیٹھے ہیں کہ اپنی نوکریاں کہاں منتقل کروائیں۔ یہاں رہے تو نقصان ہے۔

''ان کا خیال ٹھیک بھی ہے۔'' گوتم کہہ رہا تھا۔ ''پاکستان مسلمانوں کا اقتصادی مسئلہ حل کرنے کے لیے بنایا گیا ہے ______ تمہارے بابا کا کیا ارادہ ہے؟''

''بابا کیسے جاسکتے ہیں؟ زمینداری نہیں چلی جائے گی ساتھ۔ بھیا صاحب نے البتہ اوپٹ کردیا ہے۔'' کمال نے جواب دیا۔

دلی' شملہ' نمبر ۱۰۔ اورنگ زیب روڈ' وائسر یگل لاج' بھنگی کو لونی ______ یہ الفاظ اس کے کانوں میں آتے رہے' وہ دریچے سے ہٹ آئی اور چلتی ہوئی پھر سڑک پر آ گئی۔

اب اس کے سامنے دو دنیائیں تھیں۔

ایک طرف یہ لوگ تھے' ان کے دل و دماغ' ان کے تصورات' ان کی جدوجہد ____ مگر یہاں مستقبل بے حد مبہم تھا۔ دوسری طرف سکون تھا اور حفاظت۔ ذاتی مسرت ____ عامر رضا پاکستان جارہے تھے۔ کیوں نہ جائیں' آخر وہ کمال کی طرح سر پھرے تھوڑا ہی ہیں۔ یہاں ان کا مستقبل کیا ہے؟ نئے ملک میں وہ ترقی کر کے کہیں سے کہیں جا پہنچیں گے۔ ذاتی مسرت ذاتی ترقی' ذاتی مقاصد' آخر کیوں نہیں۔ سیاست ہی تو ساری زندگی نہیں۔ دوسروں کے لیے میں کیوں سوچوں؟ دوسروں نے مجھے اب تک کیا دیا۔ چنانچہ اس نے تفصیل سے سوچنا شروع کیا ____ میں عامر رضا سے شادی کر کے پاکستان چلی جاؤں گی' کتنی آسان بات ہے۔ یکلخت ایسا لگا جیسے بلز ختم ہو گیا' سکون سارے میں چھا گیا۔ اس نے تصور میں اپنا نام پڑھا۔ بیگم عامر رضا۔ کراچی ____ واہ بھئی' مگر یہ لوگ کمبخت بہت یاد آئیں گے۔ پر اب انسان کو دنیا میں ہر چیز تو حاصل نہیں ہو سکتی تم کیک لو بھی اور اسے کھاؤ بھی۔ ناممکن ہے' وہ شاہی پھاٹک تک پہنچ گئی' اس کے پیچھے پیچھے گوتم آ رہا تھا۔

''چمپا باجی خدا حافظ'' اس نے کہا۔

''جاتے ہو ماسکو۔''

''ہاں۔''

''کمال کا کیا ہوا؟''

''وہ جا تو رہا ہے جولائی میں چلا جائے گا۔ طلعت اور نرملا بھی جارہی ہیں' ان

سب کو کیمبرج میں داخلہ مل گیا ہے۔''

''بہت خوب۔''

''آپ بھی کیوں نہیں باہر چلی جاتیں، چمپا باجی۔ یہاں بیکار اپنا وقت گنوا رہی ہیں یا اگر شادی کر رہی ہوں تو دوسری بات ہے، مجھے یقین ہے کہ آپ پاکستان چلی جائیں گی۔''

وہ بادشاہ باغ کے پھاٹک کے پرانے کھموں سے پیٹھ لگا کر کھڑی ہوگئی۔ گوتم اس کے سامنے موجود تھا لیکن وہ بالکل تنہا تھی۔ ''آخر تم بتاتے کیوں نہیں مجھے کیا کرنا چاہیے۔'' اس نے تقریباً چیخ کر کہا۔

''آپ کس سلسلے میں مجھ سے رائے لے رہی ہیں؟ آپ ہی نے تو کہا تھا کہ کون کس کو رائے دیگا، کون کس کا ناصح بن سکتا ہے۔ میں کمینہ نہیں ہوں چمپا باجی، محض حقیقت پرست ہوں۔''

''تمہارے پاس میرے لیے صرف یہی الفاظ ہیں؟''

''آپ تو الفاظ میں معنی نہیں دیکھنا چاہتیں، اس لیے کیا فرق پڑتا ہے، میں جو بھی کہوں وہ بے معنی ہوگا۔ خدا حافظ۔ گلفشاں جائیے تو اپی کو بتا دیجیے گا میں صبح دلی روانہ ہو رہا ہوں۔'' وہ آگے طلا گیا۔

طلعت اور نرملا باتیں کرتی قریب سے گزریں۔

''دل نہیں مانتا، ملک کو اس حالت میں چھوڑ کر ہم انگلستان بھاگ جائیں، حالانکہ تعلیم بھی بڑی سخت ضروری ہے ________ گو یہ بہت سخت بورژوا موقع پرستی ہوئی نا۔'' طلعت کہہ رہی تھی۔

''بالکل ۔ حالانکہ کیمبرج میں اتنی مشکل سے داخلہ ملتا ہے' اگر اب نہ گئے تو سمجھو کئی سال برباد گئے ۔'' نرملا نے جواب دیا۔

''ہاں یہ بھی ٹھیک کہتی ہو۔'' وہ دونوں بھی اسے ہلو کہتی ہوئی آگے بڑھ گئیں۔

اب کمال قریب سے گزرا۔

''چمپا باجی' مبارک ہو' تمہارا پاکستان بن گیا۔'' اس کے لہجے میں جس قدر تلخی' نفرت اور شکستہ دلی چھپی تھی اس کا احساس کر کے چمپا لرزاٹھی۔ اس کا خیال تھا کہ اب کمال ایک اور تقریر کرے گا' اسے برا بھلا کہے گا مگر یہ کیا ہوا کہ کمال اب بالکل خاموش تھا۔ گویا اب مزید کچھ کہنے' سننے' خفا ہونے' بحث کرنے کا وقت گزر چکا تھا۔ باتوں کا دور ختم ہوا۔ اب ایک حقیقی دنیا سامنے تھی' فیصلے اور عمل کی منتظر کمال ایک لمحے کے لیے خاموش کھڑا پھاٹک کو دیکھتا رہا۔ جس کے ایک اندھیرے طاقچے میں چوکیداری کی لالٹین جل رہی تھی' اس کے بعد وہ بھی چپ چاپ آگے چلا گیا۔

وہ اکیلی وہاں پھولوں کی نیم تاریکی میں کھڑی رہی ۔ یہ سب اس کا ساتھ چھوڑ کر اپنے اپنے راستے پر چلے گئے' وہ پھاٹک سے نکل کر سڑک پر آ گئی ۔ سارے میں سناٹا چھایا تھا۔ مکانوں اور درختوں کے پرے گلفشاں میں روشنیاں جل رہی تھیں۔ گلفشاں' جو اس کے لیے اجنبی تھی مگر اس میں وہ موجود تھا ــــــــــــ وہ جو اس کا ہاتھ تھامے گا' وہ اس کے راستے پر چلے گی۔ آخر زندگی میں رومان اور محبت اور گلاب کے شگوفوں کا وجود ہے کہ نہیں! انسان کہاں تک محض سایوں کا تعاقب کرے' وہ اس سے کہے گی: لو بھئی میں یہاں ہوں ــــــــــــ ہنگامے ختم ہوئے ۔ اب سکون اور آرام کا وقت ہے ۔ ان لوگوں کو جدوجہد اور مصائب کی

وادی میں دیوانوں کی طرح اپنے بال نوچنے اور خاک چھاننے دو۔ایک وقت آئے گا جب یہ بھی تھک جائیں گے اور منہ لٹکا کر اپنی جائے پناہ تلاش کریں گے۔ لو میں آن پہنچی۔خالص رومان کا مطلب میں پوری طرح نہیں سمجھ پائی جس کے تم سمبل ہو۔(یہاں ہر چوز کا سمبل موجود ہے۔ ان لوگوں نے سمبلز میں ساری زندگی کو تقسیم کر دیا تھا)۔مگر اب میں تمہاری اور آتی ہوں۔

پھاٹک پر اسے رام اوتار ملا۔

''بھیا صاحب ہیں؟''اس نے دفعتاً محسوس کیا کہ اس کی آواز کانپ رہی ہے'وہ چوروں کی مانند خوفزدہ ہے'وہ گلفشاں میں سیندلگانے آئی ہے۔

''بھیا صاحب تو ابھی چلے گئے۔''

''کہاں۔''

اب اندھیرے میں سے نکل کر گنگا دین بھی سامنے آ گیا۔

''کہاں چلے گئے بھیا صاحب؟''چمپا نے دہرایا

''وہیں_____''رام اوتار نے تلخی سے جواب دیا''مسلمانوں کے پاکستان۔اب آپ بھی چلی جایئے گا۔سب جنے چلے جائیں گے۔ہم اکیلے رہ جنہیں____''

گنگا دین'رام اوتار کے قریب آ گیا'وہ بڑا پڑھا لکھا آدمی تھا اور روز ہندی اخبارات کا مطالعہ کرتا تھا۔بھیا صاحب بڑے بے وپھا نکلے۔چمپا بیٹا کو چھوڑ کر چلے گئے چپے سے۔انہوں نے ہمیں بھی چھوڑ دیا۔بھیا صاحب نے گنگا دین سے دغا کی۔بڑی بے وپھا بے مروت قوم ہے____اسے صبح کا ہندی اخبار کا

اڈیٹوریل یاد آیا جس میں مسلمانوں کو غدار بتایا گیا تھا۔

بھیا صاحب بمبئی گئے ہیں______ہواں جہاجن کا بٹوارہ ہوت ہے۔ اپنے مسلمانی جہاج لے کر کراچی چلے جٰہیں۔کدیر بتاوت رہے۔'' رام اوتار نے اطلاع دی، ''ہو_____لا_____لا_____لا_____لا_____'' اس نے طوطوں کو اڑانے کے لیے پھلوں کے درختوں پر ایک پتھر پھینکا۔

گنگا دین اور رام اوتار کو اپنی اپنی سوچ میں ڈوبا چھوڑ کر وہ واپس لوٹی۔ بھیا صاحب چلے گئے کیونکہ گھوڑوں اور تیز رفتار موٹروں اور لڑکیوں کے علاوہ اب ان کی زندگی میں ایک نئی دلچسپی پیدا ہو چکی تھی: نیا ملک' نیا عہدہ' ترقی' نئے مسائل۔ مردوں کی دنیا ئیں بالکل علیحدہ ہوتی ہیں۔

''اس آدمی کے لیے میں نے اتنا وقت برباد کیا؟ ارے میں کتنی مورکھ تھی۔''

پھر اسے احساس ہوا' ساری بات یہ تھی کہ بھیا صاحب بے حد خوبصورت تھے اور اس نے بھیا صاحب کے ساتھ بہت اچھا وقت گزارا تھا۔ یادوں کے خزانے میں ایسے وقت کی ضرورت بھی ہوتی ہے لیکن مجھے ان سے محبت نہیں تھی۔ ہرگز نہیں ______ سامنے ان کی سابقہ کائنات پھیلی ہوئی تھی۔ گلفشاں کا لان جس کے سرے پر یوکلپٹس کے درخت کھڑے تھے۔ ان کے مصاحبین: کمال' گنگا دین' ان کا خاندان۔ ان کی کزن تہمینہ جو اندر بیٹھی ہوگی۔ وہ بھی ان پر جان دیتی تھی۔ بھیا صاحب خوبصورت تھے۔ اور مغرور۔ ان کو غرور جانے کا ہے کا تھا۔ چمپا کو سوچ کر ہنسی آ گئی۔ اس کا جی چاہا خوب ذوروں کا قہقہہ لگائے۔ انسانوں کو ع آخر غرور ہوتا کس بات پر ہے؟ اپنی شخصیت پر؟ شخصیت؟ گوتم نیلمبر اپنے ذہن پر نازاں ہے۔

کمال کو اپنی اصول پرستی کا زعم ہے۔ تہمینہ اپنے انکسار اور مزاج کی نرمی پر فخر کرتی ہے۔ لوگ اس قدر خود پرست کیوں ہیں؟ چمپا نے چلتے چلتے آسمان کی طرف دیکھا۔ بارش آرہی ہے۔ ہواؤں میں آزادی تھی۔ پتیوں کی سرسراہٹ میں عجیب قسم کی طمانیت پنہاں تھی۔ محض میں ہی محسوس کر رہی ہوں یا اور لوگ بھی اس آزادی کا احساس کر سکتے ہیں۔ مثلاً تہمینہ ـــــ اور ـــــ گوتم جو اپنے کزن کی بیوشانتا پر عاشق ہے۔

"ہا ـــــ ہا ـــــ ہاؤ فنی ـــــ اس نے دل میں کہا۔"

پھر اس نے بے تحاشا بھاگنا شروع کیا۔ وسیع، بھیگی خوشبو دار زمین چاروں طرف پھیلی تھی۔ باغوں کے گیلے راستے جن کے دونوں طرف اونچی باڑیں تھیں، روشیں ـــــ گھاس جس پر سرخ بیر بہوٹیاں چل رہی تھیں۔ آم کے درختوں پر اودے گہرے بادل جھکے تھے۔ زمین میں سے نمی اور خوشبو کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ شفاف پانی کے برساتی نالے کے برابر جو پگڈنڈی ایسی بن گئی تھی اسے الانگ کر وہ برسوں دوسری لڑکیوں کے ساتھ یونیورسٹی جاتی رہی تھی۔ سامنے مولسری والی سڑک پر سیگ زرتے اب بھی لڑکیوں کے پرے ہوسٹل کی طرف جارہے تھے۔ گلفشاں کے احاطے کا چکر کاٹ کر وہ پچھواڑے والی سڑک پر آگئی جدھر اسے ایک کچا راستہ سنگھاڑے والی کوٹھی اور ندی کی سمت جاتا تھا۔ سامنے سرکنڈے کی ٹٹی لگی تھی۔ چاروں اور پھولوں کی بیلیں جھکی ہوئی تھیں۔ ہرے طوطے شور مچارہے تھے، ہر چیز وہی تھی۔ سامنے لوکی کی بیل میں سے اسے قمرن کا آنچل نظر آیا۔

"کا بات ہے بیٹا_____" قمرن نے دفعتاً سامنے آ کر پوچھا۔

"کچھ نہیں دریبر کی بی بی۔" اس نے کہا۔

قمرن چپ کھڑی اسے دیکھتی رہی۔

"ہم یہاں بیٹھ جائیں دریبر کی بی بی۔"

"جی ہاں۔ آیئے۔ ضرور بیٹھیے _ _ _ _بارش آرہی ہے بیٹا

_____اوسارے میں آ جایئے۔"

وہ شاگرد دوپٹے کے برآمدے میں آ گئی۔ برآمدے کا فرش خنک تھا۔ منڈیر پر برتن رکھے جگر جگر کر رہے تھے۔ دیوار پر قدیر کی گول کالی ٹوپی کھونٹی پر ٹنگی تھی۔ چادر پر پاپڑ پھیلے تھے۔

"پاپڑ سکھائے خاطر تنکو گھام اونہیں ملت ہے۔" قمرن نے بات شروع کی۔ اسے معلوم تھا کوئی بات ضرور ہے۔ اندر کوٹھی میں بھی سناٹا تھا۔ "بیٹا آپ لوگ منئی کی طبیعت نہیں جانت ہیں ہم پنچ تو ای جانت ہن کی منئی جیسے خوش رہت ہے جب برابر او کی ٹہل کیے جاؤ او کے لیے اپنی زندگی تج ڈالو۔ ویسے ای لوگ کے خوش ناہیں ہووت ہیں۔ ہم تہمانہ بیٹا کو کیسے سمجھائی کہ لڑکین کا اپنی اوکات پہچانے کا چاہی' وہ بھیا صاحب سے بگڑ گئی رہن' وہ ان سے ایک ٹھو بات کیے بغیر ہی پاکستان چلے گئے۔ اب بیٹا صاحب رووت ہیں۔

چمپا خاموش رہی۔

"لڑکی کا اوکات ہے۔" قمرن اداسی سے کہتی رہی۔ "مہرارو بن جائے تب بھی منئی کی نوکر۔ مہتاری بن جائے تب بھی اور جب بڑھوتی کے جمانے میں بہو

بیاہ کرلائے او کی دھونس الگ سہے ___ کا آپ ہو بلایت جارہی ہیں؟"

"ہا شاید۔"

"اچھا ہے۔بیٹا۔مل اگر ان کو چاہت ہیں جی کا چین ان کا چھوڑ کر بھی نہ ملیے"۔

"بھیا صاحب نہ ہی کوئی اور ہی۔سب منئی ایک سیت تھوڑا ہی ہوت ہیں دریبر کی بی بی۔"چمپا نے ذرا گھبرا کر کہا۔پروائی کا ایک جھونکا آیا۔بارش کے قطرے ٹپ ٹپ۔چھپر پر برس گئے۔

"سب منئی ایک سے ہوت ہیں بیٹا ___ قمرن نے کہا۔"پان بنائی؟

"نہیں قمرن رہے دیو ___ اب ہم ہو چلیا۔"چمپا پیڑھی پر سے اٹھ کھڑی ہوئی اور چھتری سنبھال کی پگڈنڈی پر سے گزرتی درختوں میں غائب ہوگئی۔

قمرن چھپر میں سے باہر آ کے اداسی سے اسے دیکھتی رہی۔"ای بٹیاون بات کا ہے نہیں سمجھ پاوت ہیں۔"اس نے چھٹکی رم دیا سے کہا

"بٹیاون میں ہمت نہیں۔ڈرت ہیں۔سمجھت ہیں تھوڑا سا انگریجی پڑھ لیہین تو دنیا جان گئیں۔بٹیاون میں ہمت نہیں۔"چھٹکی نے سر ہلا کہا۔

## ۵۶

طاعت طنبورہ اٹھا کر برآمدے میں آن بیٹھی۔اس نے 'اب کے ساون گھر آ جا' الاپنا چاہا مگر آواز اس کے حلق میں اٹک گئی۔تہمینہ کمرے میں بیٹھی مشین پر بلاؤ

رسی رہی تھی۔ بارش بند ہو جانے سے ایک دم حبس طاری ہو گیا۔ طلعت اٹھ کر کمرے میں آ گئی۔

بھیا صاحب کو گئے کئی دن گزر چکے تھے۔ اب وہ کراچی میں ہوں گے۔ ایسا لگتا تھا گویا وہ کبھی یہاں تھے ہی نہیں۔ یہ بالکل صحیح تھا کہ اس ہماری دنیا میں ان کی کوئی جگہ نہ تھی، وہ پاکستان نہ جاتے تو اور کہاں جاتے۔ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست ______ طلعت نے سوچا۔ ان کا جانا بالکل لوجیکل تھا۔ ان کے جانے سے گویا پہلا ایکٹ اپنی تکمیل کو پہنچا، وہ بھلا کیا کھا کر ہمارے ساتھ ہمارے طوفانوں کا مقابلہ کرتے ______ بھگوڑے کہیں کے ______ وہ تہمینہ کی مدد کے لیے مشین کا ہینڈل گھمانے لگی۔ ''چمپا باجی نے بڑے خوبصورت کھن پیس خریدے ہیں۔'' اس نے محض کچھ بات کرنے کی خاطر کہا۔

تہمینہ نے سر اٹھا کر اسے اس طرح دیکھا گویا وہ بڑی پراسرار ہستی تھی۔ پنکھا گھوں گھوں کرتا چلتا رہا۔ باہر درختوں میں ایک کوئل مستقل کواؤ کواو کیے جا رہی تھی، بہت دور سے رام اوتار کی آواز آ رہی تھی۔ طلعت میں یکلخت خود اعتمادی واپس آ گئی۔

''دراصل آپی یہ سب جذبات کی بات ہے۔ جذبات اور ذہنی ہمدردی اور ایکو یشن'' اس نے عالمانہ انداز میں کہنا شروع کیا۔ اتنا عرصہ گوتم وغیرہ کی سنگت میں گزار کر اسے ان الفاظ پر یقین آ گیا تھا۔

''اب تم نے بھی یہ چار سو بیس شروع کی۔'' تہمینہ نے اکتا کر کہا۔

''چار سو بیس؟'' طلعت نے دہشت زدہ ہو کر کہا'' آپی یہ اصلیت ہے۔

پرابلمز کا مثلث بن جاتا ہے۔تمہارا پرابلم ______ بھیا صاحب یا چمپا باجی کا پرابلم ______ اوران سب کا انٹرایکشن ______ یعنی کہ ______"

تہمینہ نے اسے غور سے دیکھا۔"تم ڈاکٹریٹ کے لیے کیمبرج جارہی ہونا؟"

طاعت برامان گئی'مجھے بیوقوف سمجھتی ہیں'قسم خدا کی اپی مجھے بیوقوف سمجھتی ہیں۔

"آپ کے نزدیک میں چغد ہوں؟"اس نے دکھ سے پوچھا۔

"نہیں۔تم بےحد عقلمند ہو ______ مگرعورت بھی ہو۔"

"اپی ______"طاعت دہاڑی ______"اپی تم نے حد کردی'تم اس قدر ریورژوا ہوگئیں'تم نے پڑھ لکھ کرگدھے پرلادديا۔"اس کا جی چاہا اپی کی ذہنیت پر دھاڑیں مار مار کر روئے۔"ہائے اپی۔"اس نے تہمینہ کو الماری میں سے رنگین دھاگے کی ریلیں نکالتے ہوئے دیکھ کرکہا"ارے تم تو موومنٹ میں شامل تھیں'تم نے بڑے بڑے معرکے سر کیے تھے'وہ ۴۲ء کا واقعہ یادنہیں جب دلی یونیورسٹی کا مارس گائیر آیا تھااورتم نے کالی جھنڈیوں کے جلوس کی قیادت کی تھی۔رشیدہ آپا کی تم لفٹنٹ رہیں۔کیا کیا تقریریں تم نے یونین میں کرڈالیں۔چمپا باجی جیسی ری ایکشنری کوتم نے ایجوکیٹ کرنے کی کوشش کی اوراب تم عورت کا لیبل چپکا کر قانع ہوگئیں۔ارےلڑو ______ کام کرو ______ بھیا صاحب چلے گئے تو کیا ہوا؟ جہاں مرغا نہیں ہوتا وہاں سویرا نہ ہوگا؟ بھیا صاحب کی قوم کے سینکڑوں موجود ہیں اور یہ اسرار میرے پلے نہیں پڑتے کہ ان سے بیاہ کرنے سے شدت سے انکار بھی ہے اوراب بیٹھی روتی ہیں۔جہنم میں جائیں بھیا صاحب۔ارے ان کا دماغ بھی

تم ہی نے خراب کیا تھا۔ نرملا بالکل ٹھیک کہتی ہے' مردوں کو اتنا منہ ہی نہ لگانا چاہیے ورنہ ان کا دماغ خراب ہوتے کیا دیر لگتی ہے۔ ارے پوچھو' آپ ہیں کون چیز؟ نہ شکل نہ صورت۔ گورا رنگ' مولی کا ایسا۔ ہر اٹیلین لوفر اسی شکل کا ہوتا ہے۔ ایسے ایسے سی تین سو ساٹھ ہر جگہ مارے مارے پھرتے ہیں اور پورے چھ سال تک عین تمہاری ناک کے نیچے چمپا باجی سے فلرٹ کیا کیے اور اب تشریف لے گئے تو بیٹھی چھکلو پھکلو روتی ہیں۔ ارے لگاتیں ایک جوتا بھیا صاحب کی ناک پر "

"طاعت ——— وہ تمہارے بڑے بھائی ہیں' بدتمیزی مت کرو۔"

"ہاں اور کیا' اب اسی کی کسر رہ گئی ہے کہ تم ان کی طرفداری بھی کرو۔ پرانوں میں یہی لکھا ہے' ہر پتی ورتا استری کا یہی دھرم ہے۔ لاحول ولاقوۃ۔ میں کہتی ہوں تم میں اور چھٹکی میں کیا فرق ہے؟ وہ بھی رام اوتار کے ہاتھ سے روز پٹتی ہے۔ حسینی کی بی بی نے کل اس کی ہمدردی میں رام اوتار کو برا بھلا کہا تو اے لو' وہ تو حسینی کی بی بی کی جان کو آ گئی کہ خبردار جو میرے آدمی کو کچھ کہا۔"

اتنا کہتے کہتے غم و غصے سے طاعت روہانسی ہو گئی۔ بھیا صاحب کے بجائے اسے اپی پر غصہ تھا' اگر عمر میں بڑی نہ ہوتیں تو ان کی اتنی ٹھکائی کرتی کہ ساری وفاداری اور محبت اور ریورژوا رومانیت ہوا ہو جاتی۔ ہائے ہائے۔ اس نے دل ہی دل میں پیچ و تاب کھانا شروع کیا۔ آخر وہ اٹھ کر کمرے سے نکل بھاگی۔ سائیکل اٹھا کر وہ نرملا کے گھر پہنچی' وہاں جا کر اس نے چقندر کی بھجیا کھا کر پیا اور نرملا اور مالتی اور ہری شنکر کے ساتھ بیٹھ کر ترپ چال کھیلی تب جا کر اس کا غصہ ذرا ٹھنڈا

ہوا۔

طلعت کے جانے کے بعد تہمینہ مشین پر سے اٹھی اور دریچے میں جا کھڑی ہوئی۔ پہلا ایکٹ ختم ہوا' اس نے دل میں کہا۔ ہوا میں طوفان لرز رہے ہیں اور گلفشاں کی بنیادیں ہل چکی ہیں' ہم سب کے ذاتی طوفان۔ اگر ڈراما لکھا جائے تو کردار کی تشریح یوں ہوگی:

نواب زادی تہمینہ بیگم' عمر پچیس سال۔ فرسٹ کلاس ایم اے سانولی' دبلی' حساس' اندر ہی اندر غم کھاتی رہتی ہے۔ گھر میں اپی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ خلیق اور منکسر المزاج' مغرور۔ اس حقیر وضاحت کے بعد اور کیا باقی رہ جاتا ہے؟ ڈرامے کے پانچویں ایکٹ میں ہوگا:

دس سالہ کا وقفہ۔ تہمینہ' جواب ذرا موٹی ہوگئی ہے۔ بچے کو گود میں لیے گنگنا رہی ہے: میں کھاؤں' مور بالا کھائے' بالے کا جھنجھنا کو دنہ کھائے۔ بالے کا ____ چہرے پر معصومیت اور اشتیاق کی جگہ صبر اور سکون آگیا ہے ____ صبر اور سکون ____ لاحول ولاقوۃ ____ وہ برآمدے میں آگئی۔ بارش تھم چکی تھی۔ چبوترے پر بہت سے رشتے دار بچے ''کوڑا جمال چاہی'' کھیل رہے تھے۔ درختوں کے پرے سوسن' طلعت کی چیزیاں رنگ کر پھیلا رہی تھی۔ کمال نے چبوترے کی منڈیر پر سے جھانکا' واہ کیا سہانا منظر ہے۔ دو پٹے رنگے جارہے ہیں۔ اپی مشین چلا رہی ہیں۔ برآمدے میں تخت پر تین چار خالائیں مصروف گفتگو ہیں' وہ بھی اندر آکر نہایت ذہانت سے ان کی باتوں میں حصہ لینے لگا۔ جی ہاں' چھوٹی خالہ ٹھیک کہتی ہیں۔ ضرور پاکستان جائیے' وہاں

بڑے ٹھاٹھ رہیں گے' وہ بیچ بیچ میں لقمہ دیتا جا رہا تھا۔ تہمینہ نے اسے دریچے میں سے دیکھا' یہ سب ڈرامے کے کردار تھے جو خواب میں چل پھر رہے تھے۔ اسٹیج پر دھندلکا چھا گیا تھا۔ وہ بھی باہر آ گئی۔

کمال نے بچوں کو کوڑا جمال شاہی کھلانا شروع کیا۔

"کوڑا جما شائی۔ پیچھے دیکھا مار کھائی _ _ _ _ پیچھے دیکھا ____ ہلو ____ اپی ____" اس نے دوڑتے دوڑتے کہا۔ "سل گئے بلاوز ____ کوڑا جمال شائی ____"

تہمینہ برآمدے کے ستون سے ٹک کر اسے دیکھنے لگی۔

"کوڑا جمال شائی۔ اپی چمپا باجی تشریف لے جا رہی ہیں' بلکہ لے گئیں تشریف ____ پیچھے دیکھا مار کھائی ____"

"کیا ہوا؟ کہاں؟" تہمینہ نے چونک کر پوچھا۔

"فرانس ____ کوڑا جمال شائی ____ اس نے زور سے ایک چھوٹی سی بچی کو چنے ہوئے دوپٹے سے مارا' وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور اس کے پیچھے دوڑی۔"

"کیسے؟" تہمینہ نے آواز دی۔

"یونیورسٹی اسکالرشپ ____" کمال نے کہا۔ بچوں نے تیزی سے گھومنا شروع کر دیا ____ یہاں تک کہ کمال دوپٹے کی کنڈلی گھاس پر پھینک کر باہر بھاگ گیا۔

سڑک پر آ کر کمال نے گلفشاں پر ایک نظر ڈالی اور جیبوں میں ہاتھ ٹھونس کر

سنگھاڑے والی کوٹھی کا رخ کیا۔

اگست کی بارشیں اب کے ایسی ٹوٹ کر برسیں کہ زمین آسمان ان میں ڈوب گئے۔ سنگھاڑے والی کوٹھی کا رخ کیا۔ ستیل پائی بچھا کر وہ سب بیٹھے بادلوں کو دیکھتے رہے۔ موقعے کی مناسبت کے لحاظ سے طلعت نے دوبارہ تان پورے کو ٹیون کر کے ملہار شروع کرنا چاہا مگر ساری آوازیں ڈوب چکی تھیں۔

بارش کا پانی جو شفاف تھا' شرون کی الوہی دھند جو کائنات پر تیرتی تھی' اس میں خون ملا تھا۔ خون کی برکھارت' خون کی کیچڑ' خون برسانے والے بادل۔ خون کی اس فراوانی سے طلعت عاجز آ گئی۔ نرملا کی نئی کینوس کے قرمزی رنگوں میں اسے خون نظر آیا۔ گومتی خونی ندی تھی جو بہہ رہی تھی۔ (حالانکہ یہ صرف ڈوبتے سورج کا عکس تھا)۔ پھولوں پر خون تھا۔ انسانوں کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ اس نے سہم کر نرملا اور ہری شنکر کو دیکھا۔

## ۵۷

اور اب دونوں بھائیوں میں خانہ جنگی شروع ہوئی تو ارجن نے اپنی کمان اٹھا کر کرشنا سے کہا:

او جناردھن! میرا رتھ دونوں فوجوں کے درمیاں کھڑا کر دو تا کہ میں دیکھوں کہ مجھے کون سے فریق کا ساتھ دینا چاہئے۔

اور کرشنا نے رتھ وہاں لے جا کر کھڑا کر دیا اور ارجن نے دیکھا کہ دونو فوجوں

کے درمیان کھڑا کر دو تا کہ میں دیکھوں کہ مجھے کون سے فریق کا ساتھ دینا چاہئے۔

اور کرشنا نے رتھ وہاں لے جا کر کھڑا کر دیا اور ارجن نے دیکھا کہ دونوں فوجوں میں ایک دوسرے کے پرکھ باپ دادا، چچا، بھائی، بھتیجے، بیٹے، دوست، استاد، رفیق ایک دوسرے کے خلاف صفیں آراستہ کیے کھڑے تھے۔

تب کنتی کے بیٹے نے دکھ میں ڈوب کر کہا: اور کرشنا! یہ منظر دیکھ کر میرے ہاتھ پاؤں شل ہیں۔ میرا حلق سوکھ رہا ہے۔ میرا جسم تھر تھر کانپتا ہے۔ میرے سر کے بال کھڑے ہو گئے ہیں۔ میری کمان میرے ہاتھ سے گری جا رہی ہے۔ میرا بدن تپ رہا ہے۔ او کیشو! میں سیدھا کھڑا نہیں ہو سکتا۔ میرا دماغ چکرا رہا ہے۔ مجھے برے شگون دکھلائی دے رہے ہیں۔

او مادھو! میں اپنے ہی کنبے، اپنے دوستوں اور اپنے استادوں کو مارنا نہیں چاہتا کیونکہ کنبے کی تباہی سے قدیم روایتیں ختم ہو جاتی ہیں اور روحانیت کے خاتمے کے ساتھ کنبہ بھی تباہ ہو جائے گا۔ عورتیں نیک نہ رہیں گی اور پرکھوں کی عزت خاک میں مل جائے گی۔ پرکھوں کی تقدیس کرنے والا کوئی نہ رہے گا۔

او مدھوسودن! میں نہیں جانتا کہ ہم دونوں میں سے کون بہتر ہے۔ میں یا میرے دشمن۔ ہمیں ان کو زیر کرنا چاہئے یا انہیں ہمیں۔ او گوندا! میں نہیں لڑوں گا۔

ہندوستان ۔ ۱۹۴۷ء

## ۵۹

سرل ڈیرک ایڈون ہاورڈ ایشلے نے پھر وقت پر نظر ڈالی اور پکیڈ لی کے ٹیوب اسٹیشن میں گھڑی کے نیچے، جس میں ساری دنیا کا وقت معلوم ہو جاتا تھا، ٹہلنا شروع کر دیا۔ اسے سخت کوفت محسوس ہو رہی تھی۔ اس قسم کے راں دے وو سے اسے ہمیشہ سے نفرت تھی مگر وہ چمپا احمد سے وعدہ کر چکا تھا کہ اسے تھیٹر لے جائے گا اور وعدہ نبھانا بہر حال ضروری تھا۔ تنگ آ کر اس نے نیو سٹیٹسمین اینڈ نیشن کو دوبارہ پڑھنا شروع کر دیا۔ اس میں گوتم نیلمبر کا جو خط تقسیم ہند اور جنگ اور امن کے مسئلے کے متعلق چھپا تھا سرل بیتاب تھا کہ سریکھا کے گھر پہنچ کر اس پر پر دوستوں سے بحث کرے۔

سرل دوسرے لارڈ بارن فیلڈ کا چھوٹا بیٹا تھا۔ اس کے دادا پہلے لارڈ سرل ڈیرک ایڈون ایشلے نے اس ارسٹوکریٹ خاندان کی بنیاد رکھی تھی جو اب سٹی میں ربر اور جوٹ کی تجارت پر چھایا ہوا تھا۔ سرل کے پردادا سر سرل ہاورڈ ایشلے ایک مفلوک الحال پادری کے بیٹے تھے جو اٹھارہویں صدی کے اواخر میں کلرک کی حیثیت سے بنگال گئے تھے جہاں انہوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت کے دوران نیل کی تجارت سے لاکھوں روپے کمائے۔ روایت تھی کہ شاہ اودھ کے دربار میں انہوں نے خوب ہاتھ رنگے اور جو لاکھوں پاؤنڈ کی مالیت کے ہیرے

جواہرات شاہ اودھ نے ان کے تحفے میں دیئے وہ علیحدہ ،وہ سکسی صوبے کے گورنر بن چکے تھے جب ان کا انتقال ہوا اور ان کے اکلوتے لڑکے نے جوان ہو کر انگلستان میں ربر کی تجارت شروع کی' گاؤں اور محلات خریدے' لارڈ کا خطاب حاصل کیا' پارلیمنٹ میں بیٹھا اور باقاعدہ ارسٹو کریسی میں شامل ہو گیا۔ یہ پہلا لارڈ بارن فیلڈ تھا۔اس کی تجارت بڑھتی اور پھیلتی ہوئی سلطنت برطانیہ کے ساتھ ساتھ سارے مشرق میں پھیل گئی۔اس کا بیٹا دوسرا لارڈ بارن فیلڈ ایمپائر کا اور بھی زیادہ قابل فخر فرزند ثابت ہوا اس نے برطانیہ کی فارن سروس میں بڑے بڑے کار ہائے نمایاں انجام دیئے۔ترکوں اور افغانوں کا قلع قمع کیا۔ ہندوستان کی تحریک آزادی کے خلاف پارلیمنٹ میں قانون وضع کیے۔کلکتے سے ایک کنزرویٹو اخبار نکالا۔ ایک صحیح النسب ٹوری کی حیثیت سے اسے کالوں خصوصاً نیم وحشی ہندوستانیوں سے دلی نفرت تھی۔ چند اعلیٰ خاندان محمدنز کو البتہ وہ گوارا کر لیتا تھا جن کے ساتھ جب کبھی وہ ہندوستان جاتا تو گریٹ ایسٹرن کلکتہ یا امپیریل ہوٹل دلی کی لاؤنج میں بیٹھ کر اپنے دادا ''نباب'' سرل ایشلے کا تذکرہ کر لیا کرتا تھا۔اس کے دادا نباب سرل ایشلے فی الواقع بڑی رومینٹک ہستی رہے ہوں گے جو اردو میں شعر کہتے تھے اور مرغے لڑاتے تھے' کتھک ناچ دیکھتے اور حقہ پیتے تھے۔ان کی ایک تصویر رائل اکیڈمی کے مصور زوفنی نے بنائی تھی۔جس میں وہ ایک بڑے بڑے ستونوں والے برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھے پیچوان گڑگڑا رہے ہیں اور کالا بھجنگ نیٹو ملازم پیچھے کھڑا مورچھل جھل رہا ہے۔پس منظر میں تاڑ کے پتے ہیں۔یہ تصویر میز کے وسطی ہال میں لگی تھی۔

دوسرے لارڈ بارن فیلڈ دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں جرمنوں کی بمباری کا نشانہ بنے۔ ان کے دو لڑکے تھے: بڑا لڑکا تیسرا لارڈ بارن فیلڈ خاندانی کاروبار اور ریاست کا مالک تھا۔ سرل چھوٹا لڑکا تھا۔

بارن فیلڈ خاندان کا ستارہ اب گردش میں تھا۔ ملایا میں ان کے ربر کے جنگلات میں کمیونسٹ چھپے بیٹھے تھے۔ کینیا میں ماؤ ماؤ نے اودھم مچا رکھی تھی۔ ہندوستان کو جب سے آزادی ملی تھی کلکتہ کی مارکیٹ بھی ڈاؤن ہو رہی تھی۔ لارڈ بارن فیلڈ اب مشرق پاکستان میں روپیہ لگا رہے تھے اور اتوار کے روز اپنے خاندانی محل بارن فیلڈ پر ٹکٹ لگا کر پبلک کو اس کی سیر کراتے تھے۔ محل بیش قیمت نوادر سے پٹا پڑا تھا اور اس کے چاروں طرف سینکڑوں ایکڑ پر پارک پھیلا ہوا تھا۔ لارڈ بارن فیلڈ کو تجارت اور زمینداری کی پریشانیوں اور اقتصادی مشکلات نے قبل از وقت بوڑھا کر دیا تھا۔

لیکن سرل ان سب مادی جھگڑوں سے بے نیاز کیمبرج میں فلسفہ پڑھتا تھا۔ چھوٹا بیٹا تھا لہٰذا اسے ہر صورت میں اپنی روزی خود ہی کمانا تھی۔ ایک اور مصیبت یہ تھی کہ جب سے اس نے روزماری سے شادی کی تھی بڑے بھائی لارڈ بارن فیلڈ نے اس سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ لیڈی ستھیا سے اس کا بیاہ رچائیں گے۔ چاہی خاندان کے افراد اس میں شریک ہوں گے۔ ایک ڈیوک کا سرل داماد بنے گا۔ انگلستان کی ارسٹوکریسی کے بچے کھچے افراد کو چاہئے کہ اس نازک دور میں ایک دوسرے کا ساتھ نہ چھوڑیں مگر سرل' اس سر پھرے لڑکے نے تو لٹیا ڈبو دی۔ پہلے ان کا خیال تھا کہ لونڈا کمیونسٹ ہو گیا ہے لیکن ان کا شبہ غلط نکلا۔ اس لڑکے کو

سیاست سے چنداں دلچسپی نہیں تھی' وہ بہت وخدا کے فضل سے فلسفی تھا۔ جنگ کے زمانے میں تعلیم ادھوری چھوڑ کا اس کو پائلٹ بننا پڑا تھا۔ مہاتما گاندھی کی اہنسا کا پرستار تھا اور برلن اور کولون پر جا کر بم گراتا تھا۔ جنگ کے بعد وہ کیمبرج واپس لوٹا۔ روزمیری' جس سے اس نے شادی کی' متوسط طبقے کی ایک لڑکی تھی جس سے اس کی ملاقات آرٹسٹوں کی ایک پارٹی میں ہوئی جہاں آرٹسٹ لوگ رت جگا منا رہے تھے۔ یہ لڑکی خوبصورت نہ تھی۔ مجسمے بناتی تھی۔ بیت چاری کامیاب سنگتراش بھی نہیں تھی اس لیے سرل کو بہت اچھی معلوم ہوئی۔ مکمل' ماہر فن لڑکیاں اسے سخت ناپسند تھیں۔ یہ لڑکی بالکل نامکمل تھی۔ اس کی تکمیل ضروری تھی' سرل نے سوچا۔ لہذا اس سے شادی کر لی اور لندن سے فون پر اپنے بھائی اور بھاوج کو مطلع کیا۔ لارڈ بارن فیلڈ نے فی الفور اس کا جیب خرچ بند کر دیا۔ ایک تو روزمیری گمنام اور مفلس' اوپر سے رومن کیتھولک۔ لارڈ بارن فیلڈ آگ بگولا ہو گئے' لیکن سرل نے پرواہ نہیں کی' وہ ہیگل کے مطالعے میں جٹا رہا۔ سرل کیمبرج میں پڑھتا رہا۔ اس کی بیوی اسٹیفرڈ شائر کے چینی کے کھلونے اور برتن بنانے کے ایک کارخانے میں نوکر ہو گئی۔ سرل کو بعض دفعہ اپنی انگلی پر شادی کی انگوٹھی دیکھ کر بڑا تعجب سا لگتا' پھر اسے دفعتاً یاد آتا کہ وہ شادی شدہ ہے اور اس کی ایک بیوی بھی ہے جو بڑی پیاری لڑکی ہے۔

مہینے میں ایک آدھ بار اس کی روزمیری سے ملاقات ہو جاتی۔

ایک روز اسے بے حد لطف آیا جب وہ چند ساتھیوں کے ساتھ ایک چلنگ کا ٹکٹ خرید کر خود اپنے ''اسٹیٹلی ہوم'' کی سیر کرنے کے لیے جا پہنچا۔ اس کے بھائی

اور بھاوج جنوبی فرانس گئے ہوئے تھے۔ ہاؤس کیپر اور اسٹاف کے لوگ محل کی سیر کرا رہے تھے، وہ نئے لوگ تھے، کسی نے سرل کو نہیں پہچانا، وہ سارے میں پھرا اور سوچتا رہا، کیسی عجیب بات ہے، میں یہاں پیدا ہوا تھا۔

سرل کا محل قصبے کے اختتام پر تھا۔ چار پانچ سو سال قبل تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کی کھڑکیاں اصل blown-glass کی تھیں۔ ان گنت کمرے اور ہال اور غلام گردشیں۔ سرے پر لیڈی چیپل تھا۔ مارننگ روم میں ہمیشہ دھوپ آتی تھی۔ باغ میں حوض تھے اور روک گارڈن اور ڈچ وضع کی چمن بندیاں اور اطالوی سنگ مرمر کے مجسمے پھولوں میں ایستادہ تھے۔ ایک زمانے میں وہ ان باغات میں خالص کنٹری اسکوائر کی مانند ٹوئیڈ کا سوٹ پہنے چہل قدمی کیا کرتا اور ٹہلتے ٹہلتے محل کے مغربی حصے کی سمت چلا جاتا جہاں بارہویں صدی کی دو راہبات کی قبریں تھیں۔ قبریں اب خالی پڑی تھیں۔ ان کے تابوت کی جگہ جو پختہ گڑھا سا بنا ہوا تھا اس میں اکثر بارش کا پانی جمع ہو جایا کرتا۔ ان قبروں کے پاس بیٹھ کر سرل نے لڑکپن میں گھنٹوں زندگی اور موت کے گورکھ دھندے کے متعلق سوچا تھا۔

باہر والوں کے لیے اس محل کے چپے چپے میں افسانویت کی افراط تھی۔ سرل کو یہاں کوئی خاص بات نظر نہ آتی، سوائے اس کے کہ اتنا بڑا کھڑاگ جو امراء کے طبقے نے پھیلا رکھا تھا، کس قدر مضحکہ خیز ہے۔ اسے تو اپنے پر دادا نواب سرل ہاورڈ ایشلے کی ذات میں بھی کوئی رومان نظر نہ آتا۔ جانے کتنے غریب ہندوستانیوں کا خون چوس کر انہوں نے یہ دولت حاصل کی ہو گی، وہ سوچتا۔ اس قسم کے خیالات اس کے دماغ میں کمیونزم کے زیر اثر نہیں آتے تھے بلکہ وہ کچھ صوفی منش واقع ہوا

تھا۔ڈبلیو ای۔ییٹس کا اس نے کافی مطالعہ کیا اور قرون سطیٰ کے کیتھولک فلسفیوں کا۔تو اس نے کہا کہ دنیا کے فانی ہونے سے کون منکر ہو سکتا ہے؟ اسی مارے جب وہ خود اپنے ہی محل میں اجنبی تماشائیوں کی طرح داخل ہوا تو اسے ایک عجیب سے سکون اور طمانیت کا احساس ہوا۔اسے خدشہ تھا کہ کہیں وہ دوسرے جدید انٹلکچولز کی طرح رومن کیتھولک نہ بن جائے لیکن وہ کسی ایک مسلک کا پابند ہونے کے بجائے آزاد رہنا چاہتا تھا۔خود وجودیت کے پرستاروں کی اس اصطلاح آزادی کو بڑے زبردست معنی پہنائے جا سکتے تھے۔یہاں پہنچ کر اپنشدوں کے معنی بھی سمجھ آ جاتے تھے۔

خاص بات نظر نہ آتی' سوائے اس کے کہ اتنا بڑا کھڑاگ جو امراء کے طبقے نے پھیلا رکھا تھا' کس قدر مضحکہ خیز ہے۔اسے تو اپنے پردادا نواب سرل ہاورڈ ایشلے کی ذات میں بھی کوئی رومان نظر نہ آتا۔جانے کتنے غریب ہندوستانیوں کا خون چوس کر انہوں نے یہ دولت حاصل کی ہوگی' وہ سوچتا۔اس قسم کے خیالات اس کے دماغ میں کمیونزم کے زیر اثر نہیں آتے تھے بلکہ وہ کچھ صوفی منش واقع ہوا تھا۔ڈبلیو۔ای۔ییٹس کا اس نے کافی مطالعہ کیا اور قرون وسطیٰ کے کیتھولک فلسفیوں کا۔تو اس نے کہا کہ دنیا کے فانی ہونے سے کون منکر ہو سکتا ہے؟ اسی مارے جب وہ خود اپنے ہی محل میں اجنبی تماشائیوں کی طرح داخ ہوا تو اسے ایک عجیب سے سکون اور طمانیت کا احساس ہوا۔اسے خدشہ تھا کہ کہیں وہ دوسرے جدید انٹلکچولز کی طرح رومن کیتھولک نہ بن جائے لیکن وہ کسی ایک مسلک کا پابند ہونے کے بجائے آزاد رہنا چاہتا تھا۔خود وجودیت کے پرستاروں کی اس

اصطلاح ' آزادی ' کو بڑے زبردست معنی پہنائے جا سکتے تھے۔ یہاں پہنچ کر اپنشدوں کے معنی بھی سمجھ آ جاتے تھے۔

سرل ایشلے صحیح معنوں میں جدید انسان تھا۔ اس عہد کی ساری ذہنی الجھنوں' روحانی نا آسودگیوں اور جذباتی بے اطمینانیوں اور شبہوں کا شکار۔

رورنگ ٹوئنٹیز کا زمانہ اس کا بچپن تھا۔ ۳۰ء سے ۳۹ء کے دور میں اس نے ہوش سنبھالا۔ لندن میں اس کے ٹاؤن ہاؤس میں اکثر آرٹسٹوں وغیرہ کا مجمع رہتا جو اس کی سوتیلی ماں لیڈی ایلین سے ملنے آتے جو اس قدامت پرست خاندان میں شادی کرنے کے باوجود ساری جدید تحریکوں کی زبردست حامی تھیں۔ یہ بڑا عجیب وغریب دور تھا۔ ڈیلی ورکر اور بائیں بازو والوں کا دور۔ بلومز بری والے اینٹی فاشسٹ تھے۔ اوڈن اور ڈے لوئیس اور اسپنڈر ترقی پسندوں کے گرو بنے ہوئے تھے۔ لندن کے یونٹی تھیٹر میں کمیونسٹوں کے ڈرامے ہوتے تھے۔ ویسٹ منسٹر تھیٹر والے مک نیس اور اوڈن اور اشروڈ کی تمثیلیں اسٹیج کر رہے تھے۔ بائیں بازو سے تعلق رکھنا ذہنی فیشن میں داخل تھا۔ یہ کرسٹفر ووڈ اور سیڈرک موریس اور بن نکلسن کی پینٹنگز کا زمانہ تھا۔ آرٹ' ادب' ڈراما' موسیقی' بیلے انٹیریر ڈیکوریشن ______ ہر چیز میں جدیدیت کی تحریکیں چلائی جا رہی تھیں۔ مشرق کے فلسفے میں اسے مسز بیسنٹ اور ڈبلیو۔ بی۔ ییٹس اور کرشنا مورتی اور راوکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر رادھا کرشنن کے مطالعے کی وجہ سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ اور ایذرا پاؤنڈ نے بار بار چینی اور سنسکرت حوالے دیے۔ شانتی شانتی شانتی کے الفاظ نے اسے اپنی طرف کھینچا۔ سرل ونچسٹر سے (نہیں۔ میں ایٹن کبھی نہیں گیا۔

ونچسٹر بھی اتنا ہی خوفناک تھا)۔ کیمبرج بھیجا گیا (میں کیمبرج نہ جاتا تو کیا گروکل کانگڑی جاتا؟) وہاں پیٹر ہاؤس میں اس کا داخلہ ہوا اور پھر **مسلسل** تفریح، **مسلسل** تفریح، **مسلسل** ذہنی ڈسی پیشن اور خیال پرستی کا دور شروع ہوا، لیکن فوراً ہی جنگ چھڑ گئی اور بمبار پائلٹ بن کر چند خوبصورت جرمن شہروں کو جہاں اس کے محبوب فلسفی اور شاعر اور موسیقار پیدا ہوئے تھے اس نے صفحۂ ہستی سے مٹا دیا۔

اس کے بعد وہ پھر کالج واپس آیا اور ہیگل کا مطالعہ پھر اسی صفحے پر سے شروع کر دیا جہاں سے ادھورا چھوڑ کر وہ ایئر فورس میں بھرتی ہونے کے لیے چلا گیا تھا یہ جنگ کے بعد کی دنیا تھی۔ کل کے دشمن آج کے ساتھی تھے اور کل کے ساتھی آج خطرناک ترین دشمن تصور کیے جا رہے تھے۔ ایشیا کا نقشہ تیزی سے بدل رہا تھا۔ امن کے نعرے لگائے جا رہے تھے۔ تیسری جنگ کی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ کل کے ترقی پسند آج شدت کے رجعت پسند بن چکے تھے۔ کسی ویلیو میں کوئی استحکام باقی نہ رہا تھا۔ وقت غیر حقیقی ہے۔ سارا وقت غیر حقیقی ہے۔ کیم کے کنارے کنارے ٹہلتے ہوئے وہ آلڈس ہکسلے اور جیمز جوائس کی طرح سوچتا۔ اب ذہنی ڈی پیشن کا دور از سرِ نو شروع ہوا۔ جنگ کی تباہ کاریاں اور انسان کی ریاکاری دیکھنے کے بعد اس میں زیادہ تلخی آ گئی تھی۔ مائیکل اور ڈینس اس کے ساتھی تھے۔ مائیکل یہودی تھا ڈینس بھی مائیکل کی طرح مڈل کلاس تھا۔ ان دونوں سے سرل نے بہت امید کی کہ ذرا ان میں اسنوبری کی جھلک دکھائی دے جائے مگر اس ضمن میں دونوں نے اسے بہت مایوس کیا۔ ڈینس کو شاعری کی سودا تھا۔

ان کے علاوہ اور بہت سے لڑکے تھے۔ کالے لڑکے، یورپین لڑکے۔

اورلڑکیاں۔

سرل کو اس کی اپنی ہم قوم لڑکیوں نے کبھی زیادہ متوجہ نہ کیا' بوجہ ان کی یکسانیت کے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد کی دنیا ایک ایسا عظیم عہد تھی جس میں دنیا بین الاقوامی دوستی اور بھائی چارے اور کلچر مفاہمت (یہ سب بہت عظیم الشان فراڈ تھا) کے دور میں داخل ہو رہی تھی اور کیسی کیسی لڑکیاں دنیا کے سارے کونوں سے انگلستان تعلیم کے لیے آ رہی تھیں۔ کالی لڑکیاں' پیلی یعنی مشرق بعید کی لڑکیاں (یاد کرو پرل بک کے ناول)' نیگرو لڑکیاں جن کو دیکھ کر جدید سنگتراشی اور پیرس کی نئی تحریکوں اور نئی موسیقی کا خیال آتا۔

اپنی ہم قوم لڑکیوں میں جون کارٹر تھی۔ جدید ناولوں میں برطانوی یونیورسٹی وومن کا جو حلیہ درج ہوتا ہے اس پر وہ پوری اترتی تھی۔ سیاہ فریم کی جیلر ینا عینک لگائے' سر پر جھوا ایسے بال' انتہائی انٹلکچول۔ یہ ٹائپ اب پچیس تیس سال پرانا ہو چکا تھا اور اس میں مزید ترقی کی گنجائش نہ تھی۔

روزمیری تھی ____ لیکن اس سے سرل نے شادی کر لی۔

اب مختلف قوموں کلچرل ایوننگز کا دور شروع ہوا جب مختلف ایشیائی قوموں کے طلباء جمع ہو کر بڑی شدید کوشش کرتے کہ سفید فام طالب علموں کو اپنی اپنی تہذیب کے قدیم ترین ہونے کا ثبوت دے سکیں۔ ''اور مٹیل ناچ'' ہوتے (جو زیادہ تر بکواس تھے سوائے سریکھا کے ناچ کے)' نظمیں پڑھی جاتیں' بے سرے ساز بجائے جاتے۔ سنا تھا امریکہ میں یہ ریکٹ نہایت اعلیٰ پیانے پر چلایا جا رہا تھا۔ بہت جلد اس فار ایسٹرن اور مڈل ایسٹرن تماشے سے اس کا جی اکتا گیا۔ اب وہ

اپنے کمرے پر لوٹتا اور کوئی اس سے کہتا کہ تھائی لینڈ والے انڈونیشیا والے کلچرل ایوننگ کر رہے ہیں تو اس کا جی چاہتا کہ کھڑکی میں سے کود کو باہر بھاگ جائے۔

"جانتے ہو سرل ایشیا سے اپنی مدافعت کر رہا ہے۔" ڈینس نے ایک روز بڑے خوفناک طریقے سے انکشاف کیا۔

ایک روز ایک نیا گروپ کالج میں داخ ہوا۔ یہ لوگ ہندوستانی تھے اور دور دراز لکھنو سے آئے تھے۔ (بڑی اداسی کی بات یہ تھی کہ لوگوں کے گروہ آتے تھے اور چلے جاتے تھے۔ ایک روز یہ گروہ بھی چلا جائے گا۔ اسے یہ سوچ کر بڑی پشیمانی ہوتی)۔ نئے لوگوں سے وہ بہت کوشش کرکے چھپاتا کہ لارڈ فلاں کا بیٹا ہے۔ کسی نے اسے ڈی کیڈنٹ کہا تو وہ جھٹ لڑکے مرنے پر آمادہ ہو گیا۔ تازہ وارد کالوں سے اس کی کافی دن ملاقات نہ ہوئی گو اسے معلوم تھا کہ یہ بڑے انگارے نگلنے والے لوگ ہیں۔ کیمبرج میں وہ صرف ایک کالی لڑکی کو جانتا تھا جس سے وہ دیر تک ہندوستان کی تعریفیں کرتا رہا مگر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ پاکستانی ہے۔ اس لڑکی کا نام روشن آراء تھا۔ اس ہندوستانی پاکستانی جھگڑے نے اس کا الگ ناک میں دم کر رکھا تھا گو وہ اس ٹنٹے کا زیادہ نوٹس نہ لیتا تھا۔

وہ ویک اینڈ پر شہر گیا ہوا تھا۔ چند دوستوں کے ساتھ وہ ایک جگہ گیا جہاں ایک اور کلچرل ایوننگ ہو رہی تھی۔ یہ 'ایوننگ' انڈیا والوں نے منعقد کی تھی، وہ جوتے اتار کر بڑے ادب اور احترام سے فرش پر بیٹھ گئے۔ شاید ٹیگور جینتی منائی جا رہی تھی۔ ڈینس فوراً مراقبے میں چلا گیا۔ مجمعے پر بہت سخت روحانی کیفیت طاری تھی۔ سرل اپنی پتلون کی کریز کی فکر میں غلطاں رہا۔ اس سے آلتی پالتی مار کر ہرگز نہیں بیٹھا جا

رہا تھا۔اس نے اداسی سے ان انگریزوں کو دیکھا جو بڑے اطمینان سے فرش پر سادھوؤں کی طرح بیٹھے تھے۔یہ کون لوگ ہیں؟ بکر زہوں گے شاید' اس نے کاہلی سے سوچا ڈینس ان سب کو جانتا تھا۔ابھی پروگرام ختم ہونے کے بعد ڈینس ان سب سے بچھڑ ملے گا اور اس کا ان سب سے تعارف کرائے گا۔یہ سوچ کر اسے پھریری آ گئی۔

اتنے میں ایک بلی پتلی لڑکی اسٹیج پر آئی اور کچھ اناؤنس کیا۔اس کے پلے کچھ نہ پڑا کیونکہ بڑے زور سے تالیاں بجیں۔سرل نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔سارا ہال' جو چھوٹا اور گھریلو سا تھا اور جو دراصل ہندوستانی طالب علموں کا تہذیبی سنٹر وغیرہ تھا' اسی طرح کی لڑکیوں سے پٹا پڑا تھا اور قسم قسم کے لڑکے۔سب بڑے کامریڈانہ اور کنبے برادری کے سے انداز میں فرش پر بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

لندن کی ہندوستانی کمیونٹی۔

اس لڑکی کو سرل نے غور سے دیکھا۔روشن کی طرح ایک اور لڑکی۔باقی اور ہندوستانی لڑکیوں کی طرح موٹے ریشم کی ساری باندھے بالوں میں پھول لگائے۔

اب ان لڑکیوں میں سرل کے لیے کوئی انوکھا پن نہ رہا تھا' اگر یہ لوگ روم وغیرہ چلی جایا کریں تو زیادہ بہتر ہو۔اٹلی اور فرانس میں ان کے لیے زیادہ مواقع ہیں' اس نے یونہی سوچا کیونکہ کوئی اور خیال اس کے ذہن میں نہیں آ رہا تھا اور ٹیگور کے متعلق وہ کچھ سوچنا نہ چاہتا تھا۔رومان پرست مڈل کلاس' جذبات زدہ یوگی ______ اس نے بڑی عیاشی سے سوچا۔(ان دنوں وہ مغربی عیسائیت اور

یورپین تہذیب کا حامی بنا ہوا تھا)۔

اتنے میں سیاہ ساری پہنے ایک گدازسی بی بی اسٹیج پر آئیں۔ یہ بی بی پینتیس اور چالیس سال کے درمیان رہی ہوں گی اور پندرہ سال قبل حسینان کلکتہ میں ان کا شمار ہوتا ہوگا۔ ان کی بنگالی شکل تھی۔ بڑی بڑی سرمگیں آنکھیں' پھولے پھولے گال' کانوں میں سونے کے پھول' بڑا سا جوڑا _____ سیاہ ساڑی کے نیچے سفید پیٹی کوٹ پہنے تھیں' جو البتہ بڑا عجیب معلوم ہو رہا تھا۔

ان بی بی نے بڑی جادو بھری آواز میں گانا شروع کیا اور بعد گانے کے اس کا ترجمہ انگریزی میں سنایا۔

پھر ایک عدد تقریر میں انہوں نے بتایا کہ ٹیگور دنیا کا عظیم ترین شاعر تھا۔

''جانتے ہو یہ کون ہیں؟'' ڈینس نے بڑے رعب سے سرل کو مطلع کیا۔ ڈینس ساری ہندوستانی کمیونٹی کا شہر خبرو تھا۔

''اگر نہ جانتا ہوں تو کیا حرج ہے۔ یہ تھیا سوفسٹ ہوں گی یا ہندوستانی کلچرل کی علمبردار جو بتلائیں گی کہ atomic تھیوری کو سب سے پہلے شنکر اچاریہ نے پیش کیا تھا۔'' سرل نے بور ہو کر کہا۔

''یہ مسز شیلا مکرجی ہیں۔'' ڈینس نے بڑے پر اسرار انداز میں کہا۔

''یعنی؟''

''ان سے ملتے رہنا۔ اس میں بڑے فوائد ہیں۔ ان کا یہاں صحافی حلقوں میں بہت اثر ہے' اگر تم او بزرور کے نمائندے بن کر ہندوستان جانا چاہتے ہو تو ان کو کلٹی ویٹ کرو۔''

سرل کے سامنے جو گوناگوں مسائل تھے ان میں سے ایک روزی کا بھی تھا۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ کیا کرے گا؟ بی بی سی؟ وہ پہلے ہی اس کی طرح کے انٹلکچولز سے اٹا ٹوٹ بھری ہوئی تھی۔ کسی فلم کمپنی میں اسکرپٹ رائٹنگ؟ اس کی بھی گنجائش کم تھی کیونکہ برطانوی پروڈیوسر امریکن اشتراک سے فلمیں بنا رہے تھے اور سرل کو ہر صحیح النسب انگریز کی مانند امریکنوں سے دلی نفرت تھی۔ محکمہ تعلیم؟ وہ کبھی کالج کے لونڈوں کو نہ پڑھائے گا۔ کولونیل سروس؟ یعنی میں سرل لشلے' انسانیت پرست' کنیا یا ملایا یا ویسٹ انڈیز میں نوکری کروں گا' سولا ہیٹ پہن کر دوروں پر جاؤں گا' شام کو کلب جا کر گوف کھیلوں گا؟ ہرگز نہیں۔ صرف صحافت ہی آخری جائے پناہ تھی لیکن یہاں بھی سخت مقابلہ تھا۔

پروگرام کے خاتمے پر مجمع تتر بتر ہوا اور لڑکے لڑکیاں ٹکڑیوں میں منتشر ہو کر زور زور سے باتیں کرنے لگے۔ ڈینس اٹھ کر شریمتی شیلا دیبی کے پاس گیا جو اوبزرور کے کالم نگار ربل کریگ سے باتیں کر رہی تھیں۔ ''ہیلو ڈینس'' انہوں نے مسکرا کر کہا۔

''مسز مکر جی ہمیں اپنے گھر لے جا کر کافی نہیں پلائیں گی؟'' ڈینس نے اپنی بچوں والی ادا سے ذرا مچل کر کہا۔

''ضرور۔ سب لوگ چلو۔''

ایک خاصا بڑا گروہ ان کے ہمراہ چلنے کو تیار ہو گیا۔ یہ سب لوگ قاضی نذرالاسلام کی جینتی کی تیاریوں کے متعلق گفتگو کر رہے تھے۔ سرل کو یہ مجمع بڑا دلچسپ معلوم ہوا۔ ان لوگوں نے اپنی مخصوص دنیا تخلیق کر رکھی تھی۔ ان کی اپنی گوسپ تھی'

اپنی مصروفیات۔ان کی آپس میں شادیاں بھی ہوتی تھیں۔اکثر یہ شادیاں بڑی سنسنی خیز ہوتی تھیں یعنی اس لندن میں ایک اور ہندوستانی لندن آباد تھا۔

''چلو۔چلو۔''وہ سب شور مچاتے باہر آ گئے۔گلی نیم تاریک تھی۔لڑکے سگریٹ خریدنے کے لیے ایک پب میں چلے گئے۔لڑکیاں کہنے لگیں: ''شیلا دیدی تھوڑی سی ترکاری خرید لیں۔آپ کے یہاں چل کر کھانا بنائیں گے۔''

مسز مکر جی کا فلیٹ چیلسی کی ایک بہت شاندار رہائشی عمارت میں تھا۔جس میں لفٹ لگے تھے اور گیلریوں میں دبیز قالین بچھے تھے اور وردی پوش پورٹر تھے'وہ سب فلیٹ میں داخل ہوئے لڑکیوں نے سرل سے بڑی بے تکلفی سے باتیں شروع کر دیں۔یہ لوگ روشن کی طرح tense نہیں تھیں۔بڑے گھریلو اور سیدھے اسادے انداز میں بات چیت کر رہی تھیں۔ان میں سے ایک کا نام طلعت تھا اور دوسری کا نرملا۔لڑکوں کے نام اسے یاد نہیں رہے۔یہ لڑکیاں' اسے معلوم ہوا' اسی سال کیمبرج میں داخل ہوئی تھیں۔

مسز شیلا مکر جی فرید پور مشرق بنگال کی رہنے والی تھیں۔ایک مشہور زمیندار خاندان کی چشم و چراغ' کلچر جن کے یہاں پانی بھرتی تھی۔انہوں نے خود وشو بھارتی میں پڑھا تھا مگر شادی کے بعد اپنے میاں سے ان کی نہ بنی۔(شادی'مائی ڈیئر'ایک جوا ہوتا ہے۔گرو دیو نے کہیں پر لکھا ہے کہ۔۔۔)ان کا ایک لڑکا فلائنگ آفیسر پرفلا مکر جی ہندوستانی فضائیہ میں ہوا باز تھا۔خوبصورت لڑکا تھا۔مسز مکر جی اب مدتوں سے یورپ اور لندن میں رہ رہی تھیں۔ان کے میاں کے متعلق کسی کو علم نہ تھا کہ کہاں ہیں۔

''لیکن اب وہ ایسی بھی قیامت خیز نہیں کہ تم ان پر لٹو ہو جاؤ۔'' دوسرے روز ڈینس نے برا مان کر کہا' وہ لوگ کالج کے ڈائننگ ہال میں ناشتے کی میز پر بیٹھے تھے۔ دو رویہ سیاہ عباؤں کی قطاریں۔ چھری کانٹوں کا شور۔ ہال کے سرے کی میز پر پروفیسروں کی دھیمی دھیمی آوازوں کی جھنجھناہٹ۔ اونچے دریچے میں سے باغ کا منظر ٹرنر کی کسی پینٹنگ کی مانند دکھلائی دے رہا تھا۔

''ایں؟'' سرل نے ذرا جھنجھلا کر کہا۔

''لیکن وقتاً وقتاً ان سے ملتے ضرور رہا کرو' وہ اوبزرور کی کورسپونڈنٹ شپ۔۔۔'' ڈینس نے کانٹا ہوا میں لہرا کر جواب دیا۔

سرل اگلی بار جب لندن گیا تو ان کے فلیٹ کے پورٹر نے اسے بتایا کہ وہ جنیوا جا چکی ہیں' وہ باہر نکل رہا تھا تو اسے ایک اور لڑکی زینے پر ملی اور اسے پہچان کر ذرا سا مسکرائی۔ ''ہلو۔'' اس نے کہا۔

سرل نے شائستگی سے جھک کر اسے سلام کیا۔ اسے یاد آیا' یہ وہی لڑکی ہے جو اس روز ٹیگور جینتی میں اسٹیج پر اناؤنسمنٹ کر رہی تھی۔

یہ وہی لڑکا ہے جو ڈینس نے بتایا تھا کہ کسی لارڈ کا بیٹا ہے' چمپا نے یاد کیا۔ ''میں بھی مسز مکرجی سے ملنے آئی تھی۔'' اس نے سیڑھیاں اتر کر سڑک پر آتے ہوئے کہا' ''مگر وہ جنیوا گئی ہوئی ہیں۔''

''آپ یہیں پڑھتی ہیں؟''

''جی نہیں۔ میں پیرس میں ہوں۔ آپ نرملا سریواستوا کو جانتے ہیں؟ وہ گرٹن میں ہے؟''

''جی ہاں۔ میں مس سریواستوا سے یہیں ملا تھا۔''

''اور کمال رضا؟''

''سریکھا دیوی سے ان کا ذکر سنا ہے۔ ملنے کا اتفاق ابھی تک نہیں ہوا۔ آپ روشن آراء کو جانتی ہیں؟''

''جی نہیں۔ میں پیرس میں ہوں۔ آپ نرملا سریواستوا کو جانتے ہیں؟ وہ گرٹن میں ہے؟''

''جی ہاں۔ میں مس سریواستوا سے یہیں ملا تھا۔''

''اور کمال رضا؟''

''سریکھا دیوی سے ان کا ذکر سنا ہے۔ ملنے کا اتفاق ابھی تک نہیں ہوا۔ آپ روشن آراء کو جانتی ہیں؟''

''جی نہیں۔ میں نے بھی سیکھا اور ڈینس ہی سے ان کا ذکر سنا ہے۔''

شروع کے پندرہ بیس منٹ ہمیشہ اس طرح صرف ہوتے ہیں کہ آپ فلاں کو جانتی ہیں اور آپ فلاں سے واقف ہیں اور جی ہاں فلاں بھی میرا کلاس فلیو رہ چکا ہے۔

''آپ نرگیش کاؤس جی کو جانتے ہیں؟'' چمپا نے بآواز بلند استفسار کیا۔

''جی نہیں' میں کسی کو بھی نہیں جانتا ______ میرا مطلب ہے ______ میرا حلقہ احباب ڈینس کی مانند وسیع نہیں ہے۔''

چمپا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔''میرا خیال تھا آپ شاید ینگ اشوتوش سے مل چکے ہوں۔''

''میں ینگ اشوتوش سے نہیں ملا' وہ کون ہے؟''

''مسز مکرجی کا چھوٹا لڑکا' وہ بڑا اچھا آرٹسٹ ہے۔ پیرس میں رہتا ہے۔''

چیلسی کا انڈرگراؤنڈ آ گیا۔

''اچھا اب آپ سے شاید کبھی کیمبرج میں ملاقات ہو' اگر آپ کبھی وہاں آئیں۔''

''یا شاید نہ ہو!''

''بہر حال اس موہوم امید پر کہ آپ سے کبھی دوبارہ ملاقات ہو میں آپ سے اجازت چاہتا ہوں۔''

''خدا حافظ!'' وہ ایک اخبار خریدنے کے بعد تیز تیز قدم رکھتی سرعت سے ایکسلریٹر پر اتر گئی۔ ایک مکمل' پُر اعتماد' جدید ہندوستانی لڑکی۔

اور اب آدھ گھنٹے سے وہ پکیڈلی کے انڈر میں چمپا کے انتظار میں ٹہل رہا تھا۔ پچھلے دو سال میں چمپا سے کئی بار اس کی ملاقات ہوئی تھی اور آج چمپا نے اسے اطلاع دی تھی کہ وہ پیرس سے لندن آئی ہوئی ہے اور سریکھا کے یہاں سب جمع ہو کھانا کھائیں گے۔ سرل بیتاب تھا کہ سریکھا کے یہاں پہنچ کر گلشن سے بحث کرے۔ خط کے مصنف گوتم نیلمبر نے تقسیم ہند کا سارا الزام انگریزوں اور مسلمانوں پر ڈالا تھا اور لکھا تھا کہ سرد جنگ میں غیر جانبدار رہنے کا جو رویہ اس کے ملک نے اختیار کیا ہے اینگلو امریکن بلاک' ظاہر ہے' اس کو پسند نہیں کر سکتا' وغیرہ وغیرہ۔ سریکھا نے بتایا تھا کہ یہ گوتم نیلمبر بڑا انگارے اگلنے والا انسان ہے۔ حال ہی میں ماسکو سے تبدیل ہو کر یہاں آیا ہے۔ سرل کو افسوس تھا کہ آج شام کو وہ اس

شخص سے نہیں مل سکے گا کیونکہ سریکھا کی اطلاع کے مطابق وہ لندن سے باہر گیا ہوا تھا۔

سرل بین الاقوامی وقت کے نیچے ٹہلتا رہا۔

## ٦٠

کیمبرج میں ایک دکان سے نکل کر نرملا لائبریری کی طرف جارہی تھی کہ اسے گوتم نیلمبر دکھلائی پڑ گیا۔

"نرملا ______ میں تو تم کو سارے میں ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔" گوتم نے لپک کر اس کی طرف آتے ہوئے کہا۔ "ایک انگریز مجرد خاتون تمہارے کالج میں ملیں جو شاید عربی فارسی پڑھاتی ہیں۔ انہوں نے مجھے ڈانٹ کر بھگا دیا' پھر کمال نے کہا شاید اس وقت تم لائبریری میں ہو ______ کیسی ہو ______ کیا حال چال ہیں؟"

نرملا نے آنکھیں بند کر لیں۔ یہ گوتم تھا جو اس کے سامنے کھڑا اس سے جلدی جلدی باتیں کر رہا تھا۔

"تم یہاں کیسے آ گئے؟"

"لندن سے آیا ہوں' تم لوگوں سے ملنے۔"

"سنا ہے تم اب باقاعدہ فارن سروس میں ہو۔"

"ٹھیک سنا ہے۔"

''مزے میں ہو؟''

''ہاں۔''

باتیں ختم ہوگئیں۔گوتم نے دیکھا کہ نرملا بڑی ہوگئی تھی۔سنجیدہ'باوقار' کم گو۔

''لائبریری گول کرو۔کمال اور طاعت نے کہا ہے کوہ نور میں ملیں گے۔چلو۔''

نرملا خاموشی سے اس کے ساتھ ہولی۔برابر سے سیاہ عبائیں پہنے طالب علموں کی ٹولیاں گزر رہی تھیں۔نرملا' گوتم کو بتاتی جارہی تھی۔یہ ڈینس ہے'وہ روشن جارہی ہے'وہ سرل اسٹیلے ہے'ادھر والا' بلونڈ لڑکا۔یہ بھی اپنے وقت کے اکیلے ہیں۔ان کا جواب نہیں۔یہ بھی چمپا باجی کے چیلے بن چکے ہیں۔''

''اچ_____چھا______چمپا سے تم لوگوں کا ملنا ہوتا رہتا ہے۔''

''اکثر۔''

''خوش ہیں؟''

''کیا پتا______خوشی تو بڑی اضافی چیز ہے۔''

گوتم خاموش رہا' وہ کنگز کالج کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ہلکی ہلکی بارش شروع ہوچکی تھی۔

''مجھے لگتا ہے''نرملا کہہ رہی تھی'' کہ چمپا باجی چند سال بعد مسز مکر جی کی ایسی بن جائیں گی _____ کتنے دکھ کی بات ہے۔تم جانتے ہو مسز مکر جی کو ______''

''ہاں۔''

''وقت چوٹ دے کر چپکے سے آگے نکل جاتا ہے۔کتنے دکھ کی بات ہے۔

''نرملا نے دہرایا۔ گوتم اب بھی خاموش رہا۔

''شیلا دیبی پندرہ بیس سال پہلے کیا چیز ہوں گی۔ لوگ ان سے دو باتیں کر لینا بھی فخر سمجھتے تھے۔ اب بے چاری اپنے بیٹوں کی عمر کے لڑکوں کو گھیر گھیر کر لے جاتی ہیں اپنے یہاں کافی پلانے۔ کتابیں لکھتی ہیں۔ فلیٹ اسٹریٹ میں مشہور رہیں، مگر کیا ان کی کتابیں اور ان کی شہرت زندگی کی ذاتی مسرت کا بہتر معاوضہ ہے؟ چمپا باجی بھی ایسی ہی بن جائیں گی حالانکہ قصور ان کا نہیں تھا۔ وقت نے ان کو چوٹ دی۔ انہوں نے دوسروں کو چوٹ دینے کی کوشش کی تھی۔''

گوتم چونک اٹھا۔ اس نے نرملا کو غور سے دیکھا۔

نرملا کی آنکھوں پر بارش کی ایک بوند آن پڑی۔ اس نے اپنا چہرہ رومال سے صاف اور کہتی رہی:

''یہ سرل کا دور ہے کیونکہ وہ لارڈ ایشلے کا بیٹا ہے جس طرح تم سر دیپ نرائن اور بھیا صاحب سر ذکی رضا بہادر کے فرزند تھے۔''

''نرمل تم چمپا کے ساتھ بہت بے انصافی برت رہی ہو۔'' گوتم نے آہستہ سے کہا۔

''نہیں گوتم، یہ واقعہ ہے۔ چمپا باجی نے علاوہ اس کے کہ وہ خود مایوس ہوئی ہیں ہمیں بھی مایوس کر دیا ہے۔ کل کمال کہہ رہا تھا کہ کیا بات ہے چمپا باجی کا سحر رفتہ رفتہ بالکل زائل ہو گیا۔ اس پر طلعت نے بھی ٹھیک بات ہی کہی تھی۔ اس نے کہا کہ چمپا باجی وہی ہیں، ہم لوگ بڑے ہو گئے ہیں۔''

گوتم نے اداسی سے دیکھا۔ نرمل نے بات جاری رکھی۔

''پیرس میں تھیں مگر کام ادھورا چھوڑ کر انگلستان آ گئیں۔ اب سنا ہے لندن میں کہیں نوکری مل گئی ہے اور اب یہاں بھی داخلہ لینے والی ہیں۔ اپنے متعلق کوئی فیصلہ بھی تو نہیں کر سکتیں۔ حد ہے۔ گوتم' چمپا ان لوگوں میں سے ہیں جن کو ہمیشہ کسی نہ کسی جذباتی سہارے کی تلاش رہتی ہے۔''

جیئرس لین میں سے ٹرمپٹ کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ گوتم ٹھٹھک گیا۔

''جانے کون ہے۔ اکثر بڑی غمگین دھنیں بجاتا ہے۔'' نرملا نے کہا۔ بارش کی پھوار میں اس کے بال بلکل بھیگ گئے۔ ''بھیا صاحب بھی لندن میں تشریف رکھتے ہیں۔ پاکستان ہاؤس میں ڈپلومیٹ ہیں۔ آج کل وہ بہن روشن کو اپنی چینٹگر دکھاتے رہتے ہیں۔''

اب وہ کوہ نور تک پہنچ چکے تھے۔

''گوتم'' نرملا نے سوچتے ہوئے پوچھا' ''لوگ اتنے پھٹیچر کیوں ہوتے ہیں؟''

وہ خاموش رہا۔ قریب سے طلباء کا ایک غول گزر گیا۔ سڑک کے کنارے لا تعداد زرد پھول کھلے ہوئے تھے۔ بارش کی بوندیں کیم کی سطح پر جلترنگ بجا رہی تھیں۔

''نرملا۔'' گوتم نے رک کر کہا۔

''فرمایئے۔''

''تم مجھ سے شادی کرو گی؟''

''ہرگز نہیں۔''

''کیوں ______ نرمل ______ '' آواز اس کے حلق میں اٹکی۔

''اس لیے''نرملا نے بڑی صاف اور گہری آواز میں کہا'' کہ تم بھی پھٹیچر ہو۔
آؤ اندر چلیں۔ بارش میں مت بھیگو۔''

نرملا واقعی بڑی ہو چکی تھی۔

وہ طعام خانے کے اندر داخل ہو گئے۔

## ٦١

صبح چھ بجے چمپا اٹھ بیٹھی۔ سورج کی ایک تیز اور گرم کرن عین اس کی آنکھوں کے سامنے ناچ رہی تھی' وہ دو بجے تک سریکھا کے یہاں گپیں ہانکتے رہے تھے۔ آخر لوگ اتنی باتیں کیوں رکتے ہیں؟ غسل خانے میں س ے جون نے سر نکال کر جھانکا۔ ''آج تمہاری ملازمت کا پہلا دن ہے۔ جلدی تیار ہو جاؤ۔''چمپا نے بستر سے اتر کر الماری کھولی اور بڑی کوفت سے ساریوں کو دیکھا' پھر اس نے جون کو آواز دی: ''میں ورکنگ کلاس لڑکی ہوں۔ بتاؤ کون سی ساری پہنوں۔'' پھر ناشتہ کر کے وہ بس میں بیٹھی اور سینٹ جانز ووڈ پہنچی۔ بل کے فلیٹ پر جا کر اس نے گھنٹی بجائی۔ ''کم آن ان ____ ''کسی نے اندر سے بشاش آواز میں کہا' وہ مزید ہمت کر کے اندر پہنچی۔ کمرے میں آتش دان کے سامنے صوفہ بچھا تھا۔ نیچی تپائیوں اور الٹرا ماڈرن آرٹسٹک طرز سے کمرہ سجایا گیا تھا۔ دیواروں پر جدید آرٹ کی تصویریں ٹنگی تھیں۔ ہندوستانی مجسمے رکھے تھے۔ ایک السیشن کتا بے نیازی کی شان

سے آگ کے سامنے بیٹھا تھا۔ بل صوفے پر لیٹا کچھ پڑھ رہا تھا۔ ''ہلو مائی ڈیئر ـــــ کیا پیو گی؟'' ''کچھ نہیں ـ شکریہ'' چمپا نے کہا۔ پیرس میں رہ کر اسے معلوم ہو چکا تھا کہ بوہیمیا کے افراد کس اپنائیت اور بے تکلفی سے ایک دوسرے کو مخاطب کرتے ہیں۔

''پروف ریڈ کرنا آتا ہے؟'' بل نے بے پروائی سے ایک پلندہ اس کے سامنے ڈال دیا اور باورچی خانے میں جا کر کھڑ پٹر کرنے لگا۔

شانتا کشمیری ریشم کی سیاہ سبز اور سرخ ]پھولوں والی ساری اور سیاہ کارڈیگن پہنے زینے پر سے اتری جو کمرے کے ایک کونے میں تھا۔ شانتا' چمپا نے دیکھا کہ بے حد حسین تھی۔ بڑے بزنس انداز میں وہ ٹائپ رائٹر پر جا کر بیٹھ گئی۔ پتا نہیں اپنے میاں سے طلاق لینے کے بعد گوتم سے شادی کرنے کے بجائے اس نے بل سے شادی کیوں کی۔ عجب گھپلا ہے زندگی۔ چمپا نے تعجب سے سوچا۔ ''گڈ مارننگ مسز کریگ۔'' اس نے اخلاق سے کہا۔ سنا ہے مرہٹی میں بڑی عمدہ کہانیاں لکھتی ہے۔ اب میں اس کی کہانیاں پڑھنے کے لیے مرہٹی سیکھنے سے تو رہی۔ اس نے سرل سے کہا تھا۔ ہاں۔ مرہٹی مت سیکھنا۔ اس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ سرل نے جواب دیا تھا۔

''میں گوتم سے تمہارا بہت تذکرہ سن چکی ہوں۔ یہ بڑی مختصر دنیا ہے۔'' شانتا نے ٹائپ کرتے ہوئے اظہار خیال کیا۔

بل کافی کی کشتی اٹھا لایا۔ چمپا نے محسوس کیا کہ شانتا خاصی مغرور ہے۔ بل اتنا ہی خلیق تھا۔

فرینک وہ کاغذات کا پلندہ اٹھا کر پریس جانے کے لیے تیار ہوئے۔ چمپا کو بل کے پبلشنگ ہاؤس میں پروف ریڈر کی ملازمت کرنے کا یہ پہلا دن تھا۔

''تمہارا کیا پروگرام ہے زندگی کا۔'' بل نے اس سے لنچ کے وقفے میں پوچھا' وہ انسانوں کو بھی پروف ریڈ کرتا تھا۔

''یہ تو بڑا زبردست سوال ہے۔''

''کیا تم بہت کنفیوزڈ ہو؟''

''ہاں۔''

''تم بھی جال میں گرفتار ہو؟''

''ہاں۔''

بل منہ لٹکا کر خاموش ہو گیا۔ سب جال میں گرفتار تھے' وہ خود اور اس کی بیوی شانتا جو پہلے شریمتی شانتا نیلمبر تھی اور انگریزی اور مرہٹی میں ناول لکھتی تھی اور رسل ایشلے اور سارے مصنف اور ادیب اور ذہن پرست' سارے مغربی انسان' اور مغربی یورپین تہذیب' اور نیا ایشیا' جس کے نمائندے یہاں موجود تھے' مختلف جہنموں کے درمیان معلق تھے۔ انہیں اب معلوم ہوا کہ پل صراط پر چلنا کیا معنی رکھتا ہے۔ ان کی مسلمان اور ہندو اور بدھ روحوں کو بہت سی تکالیف لاحق تھیں۔ یہ لوگ جن کے متعلق ٹوئنبی نے دس کتابیں لکھ ڈالی تھیں اور اب تک کسی اطمینان بخش نتیجے پر نہ پہنچ سکا تھا۔

اور نیا ہندوستانی اپنی روحانی بلندی اور اپنی تہذیب کی برتری کے سلسلے میں جارحانہ بنتا جا رہا تھا۔ یہ پبلسٹی کی دنیا تھی۔ رسالوں اور کلچرل پروپیگنڈے کے

پمفلٹوں اور کتابوں میں چھپنے والے کروڑوں الفاظ کی دنیا اور بل الفاظ کا تاجر تھا اور الفاظ کی طاقت اور الفاظ کے کھوکھلے پن میں یقین رکھتا تھا اسی لیے وہ شام کو اپنے اسٹوڈیو فلیٹ لوٹ کر شانتا کو تلقین کرتا کہ وہ گیتا کا دوسرا ادھیائے پڑھے اور شانتا ہنستی تھی، وہ بھی جال میں گرفتاری تھی۔ ان سب کی پرائیویٹ جہنمیں، ذاتی تہ خانے اور نجی کائناتیں زیادہ تکلیف وہ اس لیے تھیں کہ ان میں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔

ایک راستہ تھا مگر وہ بے حد ہولناک تھا۔ بل نے چمپا کو دیکھا۔ ''کمیونسٹ کبھی نہیں بنیں؟''

وہ چپ چاپ بیٹھی آلو کھاتی رہی۔

''تم افسانے لکھا کرو۔ میں تم کو لڈاپ کروں گا۔ ہندوستان کے متعلق ناولوں کا اس وقت انتہائی زبردست اسکوپ ہے۔ آر۔ کے نرائن اور ملک کو دیکھو۔ تم بھی لکھو، سمجھیں۔'' اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''افسوس کہ میں تمہارا مطالبہ پورا نہیں کر سکتی۔ مجھے لکھنا بالکل نہیں آتا۔''

''اچھا؟ یہ کیسے ممکن ہے؟ تمہارے گروپ میں تو ایک سے ایک لیکھک موجود ہیں۔''

''مجھے گروپ سے مماثل مت کرو۔''

''اچھا۔ تو آپ کا fad یہ ہے کہ آپ انفرادیت پسند ہیں۔ اچھا ہے یہ بھی۔'' بل نے جواب دیا، پھر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا دفتر کی طرف چلا گیا۔ چمپا طعام خانے کی میز پر بیٹھی رہی۔

یہ چوزے کی سرائے تھی جہاں بہت سے جاننے والے دوپہر کے کھانے کے لیے جمع ہوا کرتے تھے۔ قریب ہی بی بی سی کے اسٹوڈیو تھے' وہ ویٹرس کا انتظار کرتی رہی تاکہ پیسے چکائے۔ چند لڑکیاں کمرے میں داخل ہوئیں اور اس کو دیکھے بغیر کاؤنٹر کی طرف چلی گئیں۔ "یہ چمپا احد ہیں۔ دوسروں کے منگیتر پھانسنا ان کا کریز ہے' اگر تم سمجھو کہ میں اکینڈل مونگرنگ کر رہی ہوں تو نرملا سریواستوا سے پوچھو جسے ٹی بی ہوگئی ہے۔" ایک لڑکی نے کاؤنٹر پر سے ٹرے اٹھاتے ہوئے کہا۔

"نرملا کو ٹی بی ہوگئی؟" دوسری نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں' اور وہ مڈ ہرسٹ سینی ٹوریم جانے والی ہے۔" پہلی لڑکی نے جواب دیا۔ دونوں باتیں کرتی ہوئی اپنی اپنی ٹرے اٹھا کر کمرے کے دوسرے سرے پر چلی گئیں۔

تب چمپا نے چاہا کہ دوڑ کر ان کے پاس جائے اور ان سے پوچھے: نرملا کیسی ہے؟ اسے ٹی بی کس طرح ہوئی؟ مگر وہ سکتے کے عالم میں وہیں بیٹھی رہ گئی۔ دریچے کے باہر سڑک پر سے رنگارنگ ہجوم گزر رہا تھا' پھر اسے بہت سی جانی پہچانی شکلیں اپنی اور آتی نظر آئیں۔ بہت سے سفید ماسک جن کے اوپر ان کے نام لکھے تھے: زرینہ' سریکھا' طلعت' نرگیش' کملا' فیروز۔ یہ سب دوسرے دروازے سے طعام خانے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے اسے ہلو ہلو کہا اور دوسری طرف چلے گئے' وہ سب نرملا کی بیماری کا تذکرہ کر رہے تھے اور بے حد پریشان نظر آتے تھے۔

پھر تیسرے دروازے سے عامر رضا داخل ہوئے۔ ان کے ساتھ سرل کی ہم جماعت روشن آرا تھی۔ عامر رضا کو چمپا نے آج اتنے برسوں بعد دیکھا۔ ان میں

کوئی تبدیلی نہ ہوئی تھی سوا اس کے کہ پہلے سے زیادہ قیمتی سوٹ پہنے تھے اور زیادہ اعتماد سے قدم رکھ رہے تھے۔ انہوں نے چمپا کو دیکھا۔ ذرا ٹھٹھک کر بڑے اخلاق سے آداب عرض کیا اور دور کونے کی میز پر جا بیٹھے۔

''یہ دونوں ہم سب سے دور رہنا بہتر سمجھتے ہیں۔''طلعت کی میز پر کسی نے ہنس کر کہا۔

''اچھا ہی ہے۔ ہماری سنگت میں ان کے خیالات خراب ہو جائیں گے۔''کسی اور لڑکی نے جواب دیا۔

''اور ایمان جو خراب ہو گا وہ الگ۔''

''وہ الگ________''

چمپا نے خلاف ارادہ سر اٹھا کر ان کو دیکھا: سید عامر رضا' گل فشاں والے'لا مارٹینئر کالج والے' بھیا صاحب۔ انسان جن لوازمات اور ایسوسی ایشنز کا مرکب ہوتا ہے وہ پل کی پل میں کیسے بدل جاتے ہیں! اور یہ روشن نہ جانے کون تھی۔ بے چاری لڑکی۔ جو ہنس ہنس کر ان سے باتیں کر رہی تھی۔ دنیا کے اندر اور کتنی دنیائیں ہیں۔

چمپا نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ بیگ اٹھا کر طلعت کی میز کی طرف گئی اور ان لوگوں سے نرملا کی خیریت دریافت کرنے کے بعد اپنے دفتر کی طرف روانہ ہو گئی۔

سامنے دیودار کا جنگل ہے۔ سرخ پتوں نے چاروں اور آگ لگا رکھی ہے۔ وادی میں ٹرینیں مکانون کے پیچھے الگنیوں پر پھیلے کپڑوں میں سے لہراتی اتر کی اور جا رہی ہیں۔

پارک میں زرد پتے اڑ رہے ہیں۔ جھیل میں ایک اکیلی کشتی ڈولتی ہے۔ آرام کرسیوں پر عسرت زدہ پنشن یافتہ بوڑھے اپنی بے یارو مددگار آنکھوں سے سامنے کا دھندلکا دیکھتے ہیں اور کانپتے ہاتھوں سے کاغذی لفافوں میں سے بن نکال کر کھا رہے ہیں۔

آج کا دن ایک اور دن ہے۔ پل پر سے انسانوں کے گروہ یونیورسٹی، لاء کورٹس سٹی کی اور جا رہے ہیں۔ میں کون ہوتی ہوں کہ اس اہمیت میں شامل رہنے سے انکار کروں۔ ہاں یہ بالکل صحیح ہے۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔ چوزے کی سرائے میں وہ سب سرخ میزوں کے گرد جمع باتوں میں مصروف ہیں۔ یہ کون لوگ ہیں؟ کیا یہ zero-hour ہے۔ مجھ سے بہت فاصلے پر لڑائیاں لڑی جا رہی ہیں اور سال ختم ہوا جاتا ہے۔ کیا یہ صحیح ہے کہ ایک کرائسس آ کر گزر گیا؟ میں کیوں فکر کروں جبکہ آج کی تہلکہ خیز خبریں کل ردی میں بکتی ہیں۔

گوینٹ سیستیاں اپنے تیر کے انتظار میں کھڑا ہے۔

روشن نے سوچا۔

دیودار کا جنگل شفق کی سرخ روشنی میں چھپ گیا۔ اس جنگل سے میں بھی گزری ہوں۔ ہم سب گزر رہے ہیں۔ میں نے اس میں بیدر کے چھوٹے چھوٹے شگوفے جمع کیے تھے۔ (طلعت نے کہا۔)

کالج میں چھٹیاں ہیں۔صولت روم سے آئی ہوئی ہے اور شگفتہ کے یہاں ٹھہری ہے۔ہم سب کملا کے گھر میں محفوظ بیٹھے ہیں۔گھر ______ نیچے صوفے' فرش پر بکھری ہوئی کتابیں' کھڑکی میں رکھی ہوئی اناس کی ٹوکری تیوشن اور سرل کی بنائی ہوئی کیوبسٹ تصاویر' پرانے ملبوسات۔تم چولہا ساگاؤ' میں پورٹر کو فون کرتی ہوں' دودھ کی بوتلیں کہاں رکھ گیا؟ مسٹر جنکنز _ _ _ _ _ یس مس ______ نو مس۔ایک کمرہ ساری کائنات کا مرکز ہے۔

اوفوہ روشن ڈیئر' آج اتنا کام تھا۔کملا کہہ رہی ہے' چند روز بعد دولت مشترکہ کے وزرائے اعظم کی کانفرنس ہے اور پھر سارا انفرمیشن ڈویژن۔کشمیر کا مسئلہ' کوریا کا امن' کمیونٹی پروجیکٹس' آسام کے لوک ناچ' پبلسٹی ______ پبلسٹی۔

گیلری میں اوپر کی پانچویں منزل سے لفٹ آن کر رکا۔نرگیش اندر آئی' وہ سب مل کر شگفتہ کے یہاں پہنچے جہاں ڈرائنگ روم میں شانتا اور بل موجود تھے اور سیکھا' رام گوپال کی پارٹنر' سیدھی سادی' دلچسپ' خلیق اور ذہین پنجابی لڑکی جو دیکھنے میں مرہٹی نظر آتی تھی اور زرینہ' بلونڈ شفت زبان' آرٹسٹ جو فرانسے سے روسی بول رہی تھی' وہیں ڈلن طامس بھی بیٹھے تھے۔ان سب کا روشن سے تعارف کرایا گیا۔ایک دنیا کے اندر اور کتنی دنیائیں ہیں' اس نے سوچا۔

پیرس میں ایک روز عامر رضا نے اسے مادموزیل دوپاری گا کر سنایا تھا اور اس سے کہا تھا: متیس کی تصویروں کے پیچھے گھوما گھوما پھرتا ہوں۔میں صریحاً متیس پر عاشق ہوں۔آپ کی شکل بھی متیس کی پینٹنگ کی ایسی ہے اور اس نے کہا تھا: "حسین خاتون' میں سکون کی تلاش میں ساری دنیا میں گھومتا ہوں۔جہاں سایہ ملا

وہاں بیٹھ گیا۔ کسی روز میں آپ کو اپنی کہانی سناؤں گا۔'' وہ کہانی کیا ہو گی' کہانی لکھنے والا کون ہے اور سننے والا کون؟ جی ہاں' میں نے پروفیسر رادھا کرشنن کے لیکچر اٹنڈ کیے ہیں۔ جی نہیں ____ میں ہیگل پر مونو گراف لکھ رہی ہوں۔ اس نے مڑ کر بل سے کہا۔ جی نہیں مجھے دیانت سے دلچسپی نہیں۔ مغربی فلسفہ میرا موضوع ہے' وہ باتیں کرتی بالکنی کی طرف چلی گئی جہاں چاند مکانوں کی چمنیوں میں الجھا ہوا تھا۔ نیچے شفاف سڑک پر سے بسیں گزر رہی تھیں۔ تھیٹروں میں تمثیلیں اسٹیج کی جا رہی تھیں۔ دریا پر سے جہاز گزر رہے تھے۔ نیم تاریک اسٹوڈیوز کے دریچوں میں سے بھی یہ چاند اندر جھانک رہا تھا جہاں ناکام مصور اور گمنام ادیب اور دولتمند مصور اور مشہور ادیب اپنی اپنی کائنات میں گھرے بیٹھے تھے۔ حد نظر تک مکان تھے جن میں لوگ رہتے تھے۔ ان کو روشن نہیں جانتی تھی۔ عالیشان مکان اور مڈل کلاس مکان اور غریبوں کے مکان اور قلعے اور محل اور کاٹج۔ ان سب جگہوں میں دکھ اور سکھ اور محبت اور نفرت اور امید اور نا امید اور کامرانی اور شکستہ دلی کے ڈرامے ہو رہے تھے۔ بالکنی سے شہر ڈی نیرو کی ایک پینٹنگ کی طرح نظر آ رہا تھا: سرخ اور زرد اور سیاہ دھبوں اور لکیروں کا ہیبت ناک مجموعہ۔

## ۶۳

جون کارٹر کا مکان ایک تنگ و تاریک گلی میں تھا جس میں وکٹورین عہد میں اصطبل تھا۔ اصطبل کے اوپر کوچمین کے کمروں میں جون اور نیل اور او جیت رہتے

تھے۔ نیل انجینئر ہونے کے علاوہ اس محلے کی اشتمالی جماعت کا سیکرٹری تھا۔
اوجیت قانون پڑھ رہا تھا۔ جون کیمبرج میں سرل سے دو سال سینئر رہ چکی تھی اور
یہاں یونیورسٹی میں ہنگرین زبان پڑھاتی تھی۔ کوچمین کے کمرے بہت خستہ
حالت میں تھے۔ باورچی خانے میں کتابوں کی الماریاں تھیں اور نیل کی ورکشاپ
جس میں وہ گھڑیاں اور بچوں کی موٹریں بنایا کرتا۔ اس کی بیوی نے اسے طلاق
دے کر کسی مشہور ایکٹر سے شادی کر لی تھی بوجہ نیل کی سیاسی مصروفیات کے۔ اس
کے دو بچے تھے جو گاؤں میں اپنی دادی کے پاس رہتے تھے۔ فرصت کے وقت
میں بے حد انہماک اور تندہی سے کوئی میکینکل کھلونا تیار کرتا اور مہینے کے آخر میں
اسے اپنے بچوں کو دے آتا وہ بے حد کم گو انسان تھا۔ باورچی خانے میں ایک ٹوٹا
صوفہ بھی پڑا تھا۔ ایک شکستہ اسٹوو کے اوپر ریڈیو رکھا تھا جو اکثر بند رہتا تھا۔ نیل
اسے ہمیشہ اوورہال کرتا رہتا تھا۔ نعمت خانہ عموماً خالی رہتا۔ برتن دھونے کا حوض
برتنوں سے بھرا رہتا کیونکہ اس مکان کے تینوں مکین بے حد کاہل تھے۔ الماری میں
سے کبھی کبھار ایک آدھ پنیر کا ٹکڑا یا باسی ڈبل روٹی نکل آتی کیونکہ اس گھر کے مکین
بے حد مفلس تھے۔ اوجیت غریب طالب علم تھا اور نیل اور جون اپنی تنخواہوں کا
بیشتر حصہ پارٹی کو دے دیتے تھے۔ اوجیت کے کمرے میں ایک نیچا سا پلنگ پڑا تھا
جو بیک وقت اس کی سنگھار میز، ڈیسک، کپڑوں کی کھونٹی اور ریک شیلف کا کام دیتا۔
بہت سے خیر خواہوں نے کمر ہمت باندھ کر اوجیت کے کمرے میں تھوڑی سی تنظیم
پیدا کرنے کی کوشش کی مگر وہ ان سب کوششوں کو کامیابی سے رائیگاں کرتا رہا۔
غسل خانے کی چھت کے باہر ٹیرس تھا جس پر تمام چینی کے ٹوٹے برتن اور لکڑی کا

صندوق پڑا تھا جس کے پیچھے محلے بھر کی بلیاں رات کو آ کر لڑتی تھیں۔ نیچے گلی میں صبح صبح لمبی ایالوں والے گھوڑوں کی گاڑی آ کر رکتی اور دودھ والا دودھ کی بوتلیں دروازے کی دہلیز پر رکھتا۔ اسی گلی کے نکڑ پر چارلس ڈکنز کا مکان تھا۔

جون کارٹر کا کمرہ اس فلیٹ میں گویا ہر میجسٹی کوئین ایلز بتھ کے کمرے کا درجہ رکھتا تھا۔ الماریوں میں ان گنت کتابیں ٹھنسی تھیں کیونکہ بہن جون کارٹر اللہ کے فضل سے چھ سات یورپین زبانوں کی ماہر تھیں۔ آتشدان پر رنگ برنگی گڑیاں اور مشرقی یورپین ممالک کے نوادر سجے تھے کیونکہ جون ہر سال مشرقی یورپ میں منعقد ہونے والے نوجوانوں کے میلوں میں جایا کرتی تھیں اور وہاں سے تحفوں کے انبار ساتھ لاتی تھیں۔ اس کمرے کے دریچے میں سرخ جرنیم کے پودے تک موجود تھے۔ پلنگ کے برابر ٹیلیفون لگا تھا۔

چمپا احمد چند ہفتے قبل پیرس سے آ کر جون کے یہاں ٹھہری تھی جس سے اس کی ملاقات سرل نے کرائی تھی، وہ پبلشنگ ہاؤس سے لوٹ کر یہاں پہنچی تو اسے جون دروازے میں کھڑی ملیں۔ میں ذرا ایک امن کانگریس کے لیے وارسا تک جا رہی ہوں۔ میرے آنے تک تم یہیں رہو۔ راشنکے کوپن آتشدان پر رکھے ہیں اور اوجیت سے کہے جا رہی ہے کہ وہ ہسٹری آف سوویٹ کمیونسٹ پارٹی تم کو باقاعدگی سے پڑھاتا رہے۔ اتنا کہہ کر وہ غائب ہوگئی۔

صبح سویرے دودھ کی بوتلیں گیلری میں سے اٹھا کر وہ باورچی خانے میں گئی اور ناشتہ کیا اس کا خیال تھا کہ دونوں لڑکے ڈریسنگ گاؤن پہنے اپنے اپنے کمروں میں سے نکل کر گڈ مارننگ کہتے چاء پینے کے لیے آ جائیں گے مگر وہاں کا باوا آدم

ہی نرالا تھا۔ دیر تک انتظار کرنے کے بعد اس نے ان کے دروازوں پر جا کر آوازیں دیں مگر جواب ندارد۔ نو بجے او جیت سو کر اٹھے۔ معلوم ہوا کلاس گول کر دی ہے، ارادہ ہے پلنگ پر لیٹ کر ہی مطالعہ کریں گے۔ نیل تھوڑی دیر بعد برآمد ہوئے۔ ٹھنڈی چاء پی کر بڑے اطمینان سے کوٹ کندھے پر جھلاتے لمبے لمبے ڈگ بھرتے زینے پر سے اتر گئے۔

فرانسیسی انداز میں کندھے اچکا کر چمپا مسکرائی اور برساتی اوڑھ کر اس نے بھی اپنے دفتر کا رخ کیا۔ یہ دستورالعمل اسے ناپسند نہ ہوا۔ جس کی موڈ ہوئی دوسرے سے بات کر لی ورنہ اپنے اپنے کام میں مگن رہے۔ ویک انڈ پر فیروزیا سیکھا کے یہاں محفل جمتی اور رات گئے تک ہنگامہ رہتا۔ چمپا بنارس اور لکھنو اور پیرس کے بعد زندگی کے اس پیٹرن کی بھی عادی ہوگئی۔

گوتم، چمپا سے کہیں نہیں ملا۔ سنا تھا کہ اب وہ بے حد اہم آدمی بن گیا ہے، بے انتہا مسروف رہتا ہے، انڈیا ہاؤس کا سب سے زیادہ کار پرواز افسر ہے۔ کمال کیمبرج میں تھا۔ ہری شنکر امریکہ میں۔

ایک روز وہ اور سب کے ساتھ ہندوستانی طالب علموں کی کانفرنس میں گئی جو ایسکس کے سوبزہ زاروں میں منعقد کی گئی تھی۔ یہاں وہ سب دن بھر ناچتے اور گاتے اور سمپوزیم اور مشاعرے منعقد کرتے۔ ایک رات جب وہ ایک چیری کے درخت کے نیچے کھڑی نوجوانوں کے اس ہنگامے کو دیکھ رہی تھی جو چاند کے تلے سبزے پر بپا تھا، اسے محسوس ہوا کہ وقت پانی کی طرح سرسراتا اب بہت تیزی سے بہہ رہا ہے، جس طرح سنگرام ندی پرخطر پہاڑیوں اور گھاٹیوں میں پہنچ کر تندرو

ہو جاتی ہے اور وہ ایک چٹان پر علیحدہ اور تنہا کھڑی ہے۔ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کا بہت بڑا گروہ انٹرنیشنل گا رہا تھا' بیک وقت اس کے الفاظ انگریزی' اردو اور فرانسیسی میں ادا کیے جا رہے تھے' وہ کان لگا کر سنتی رہی: دنیا بھر سے ایک ہوئے نوجوان ایک آدرش مہمان لیے۔

One great vision unites us, tho} remote be the

l a n d s o f o u r

birth.

Foes may threaten and smite us, still we live to

b r i n g p e a c e

to the earth.

Ev'ry country and nation stirs with youth's

a s p i r a t i o n .

Young folks are singing, happiness bringing,

F r i e n d s h i p t o

all the world.

Ev'ry where the youth is singing freedom's song,

f r e e d o m s

song, freedom'song.

یہ سب یہاں سے جا کر کیا کریں گے' ان کے ساتھ کیا ہو گا' باہر کی دنیا کے

ساتھ ان کو کیسے سمجھوتے کرنے پڑیں گے؟ برابر سے برطانوی لڑکوں اور لڑکیوں کی ایک ٹولی ویلش لوک گیت گاتی گزری۔ دور فارم ہاؤس کے ہال میں ڈرامے کی مشق کی جارہی تھی۔

میں نے یہ سب پہلے بھی دیکھا ہے۔ میں نے یہ سب پہلے بھی دیکھا ہے۔ اس نے ایلیٹ کے کردار کی طرح دہرایا۔ اس کے قریب سے دو لڑکیاں اور ایک بوڑھا آدمی باتیں کرتے گزرے۔ اس نے چاندنی کے دھندلکے میں غور سے دیکھا۔ لڑکیاں فیروزا اور طلعت تھیں جو پروفیسر لیوی سے باتیں کرتی سبزے کی طرف جارہی تھیں اور اس ماحول اور ان فضاؤں میں مکمل طور سے گھلی ملی معلوم ہورہی تھیں۔ میں ہمیشہ، ہر جگہ علیحدہ رہوں گی' اس نے اپنے آپ سے کہا' حالانکہ اوجیت مجھے ساری ہسٹری آف سوویٹ کمیونسٹ پارٹی پڑھا چکا ہے۔ آخر میں وہ سب کیوں نہیں کرسکتی جو دوسرے کرتے ہیں؟ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی جاکر گجراتی لڑکوں اور لڑکیوں کے گربا میں شامل ہوگئی جو باغ کے ایک حصے میں جاری تھا:

ہے گووند راگھو چرن اب تو جیون ہارے
سندھ کے کنارے' سندھ کے کنارے

لڑکیوں نے دہرایا۔

۶۴

الاؤ سرد ہو چلا تھا' وہ سب گھاس پر بیٹھے رہے۔ چاند فارم ہاؤس کی چمنی پر پہنچ گیا۔ بارن میں سے اکارڈین کی آواز آ رہی تھی۔

پروفیسر لیوی باتیں کیا کیے۔ ان کی کتاب "لٹریچر ان دی آف سائنس" ایک گھنٹے سے زیر بحث تھی۔ ان کے برف کے ایسے بال چاندی کی روشنی میں چاندی کی مانند چمک رہے تھے۔ ہوا میں خنکی آ چکی تھی۔

"مجھے کچھ اپنے متعلق بتاؤ۔" انہوں نے سوچتے ہوئے کہا۔

"اپنے متعلق؟" طاعت نے جواب دیا' ہم لوگ ______ ہم لوگوں میں کوئی خاص بات نہیں ______ بالکل ذرا سا بھی کوئی اسرار نہیں۔ قطعاً ____"

پروفیسر لیوی کے اور ان لڑکیوں کے درمیان کتنا بڑا فاصلہ تھا۔ پروفیسر کی اور ان کی عقلوں اور عمروں میں نصف صدی سے زیادہ کا تفاوت تھا لیکن اس کے باوجود ان کی فرشتوں کی ایسی شفقت کی وجہ سے' گرما کی اس خنک رات کو دفعتاً کیسی یگانگت محسوس ہوئی وہ اتنے بڑے مل آ ہی تھے' دنیا کے چوٹی کے دماغوں میں سے ایک' اور کتنے خلوص سے وہ کہہ رہے تھے: "جب تم لوگوں نے مجھے بلایا تو' حالانکہ میرے پاس وقت نہ تھا' پر میں نے سوچا' میری قوم نے اتنی صدیوں تک جو برتاؤ تمہارے ساتھ کیا ہے ذاتی طور پر ایک اکیلے فرد کی حیثیت سے اپنی جگہ اس کا کفارہ اسی طرح ادا کر سکتا ہوں کہ تم لوگ جب بھی کہو میں تمہاری محفل میں آ شمل ہوں۔" طلعت نے ایک خشک ٹہنی آگ میں پھینکی اور اس نے ہائی مین لیوی سے کہا: "ہم تو اتنے ہونہی سے لوگ ہیں اور غالباً سخت خوف زدہ جو طامس

بیکٹ کے کورس کی پجاری عورتوں کی طرح چلا رہے ہیں:

''فضا کو دھوؤ۔ آسمان کو دھوؤ۔ پتھر کو پتھر سے علیحدہ کر کے دھوؤ۔ زمین ناپاک ہے۔ پانی ناپاک ہے۔ ہمارے جانوروں کے گلے، ہم خود خون میں لت پت ہیں۔ خون کی بارش نے میری آنکھیں اندھی کر دی ہیں۔ میں خشک پتھروں کی سر زمین پر گھومتی ہوں اور اگر میں ان پتھروں کو چھولوں تو ان میں سے بھی خوب بہنے لگتا ہے۔ میں ٹھنڈے موسم بہاراں کی طرف کس طرح لوٹوں؟

''فضا کو دھوؤ۔ آسمان کو دھوؤ۔ پتھر کو پتھر سے علیحدہ کر کے دھوؤ۔ ہڈیوں کو دھوؤ۔ دماغوں کو دھوؤ۔ روحوں کو دھوؤ ـــــــــ''

بارن میں یکلخت گٹار کی آواز بلند ہوئی۔ ایوان مک کال کی صاف، گہری آواز سارے میں چھا گئی۔

''اب رات زیادہ آ گئی ہے۔ میں اگر تیز تیز چلوں تو قریب کے کسی اسٹیشن سے شہر کے لیے ٹرین پکڑ لوں گا۔'' پروفیسر لیوی نے پتھر پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''آپ ـــــــ آپ پیدل جائیے گا؟'' فیروز نے گھبرا کر کہا۔

''کیا حرج ہے؟'' انہوں نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''پیدل چلنا کوئی بری بات ہے۔ ابھی تو شاید بس بھی یہاں سے کوئی میل بھر کے فاصلے پر مل جائے گی۔''

لڑکوں اور لڑکیوں کی ٹولیاں مختلف یورپین زبانوں کے کورس گاتے فارم ہاؤس کی طرف جا رہے تھے۔

سامنے سیب کے جھنڈ میں آ یک کار آن کر رکی۔

''الو ـــــــ'' عامر رضا نے آواز دی۔

''الو ______ '' اوجیت نے خالص فرانسیسی لہجے میں نعرہ بلند کیا۔

'' آیئے آیئے بھیا صاحب۔''طلعت نے کہا۔

وہ سب بارن میں داخل ہو گئے۔

''میں جلدی میں ہوں۔ دور سے گانوں کی آوازیں سنیں تو ٹھٹک گیا۔'' انہوں نے طلعت سے کہا' پھر وہ ایک اطالوی لڑکی سے نہایت گی ۹ لنٹ انداز میں جھک کر مخاطب ہوئے: ''مجھے اپنا سیسکوفون دو۔''

''بھیا صاحب' آپ ایوان سے ملے ہیں؟'' فیروز نے لکھنو کے ناطے سے ان سے اخلاق برتنے کی سعی کی۔ ''یہ اس ملک کے سب سے بڑے بیلڈ گانے والے ہیں ______ اور بہترین ڈرامائسٹ۔''

''مجھے اپنا سیسکوفون دو ______ میں تمہیں وینس کی نہروں کا ایک گیت سناؤں گا۔'' عامر رضا نے فرانسیسی انداز میں اطالوی لڑکی سے کہا۔

''لاحول ولاقوۃ ______ ''فیروز نے جھنجھلا کر ان سے سوشل گفتگو کی سعی ترک کر دی۔

'' آیئے یہاں بیٹھئے عامر بھائی۔'' ونود نے ان کے لیے پرال پر جگہ بنائی۔ سب لوگ ان سے طلعت اور کمال کے کزن کی حیثیت سے واقف تھے۔ اطالوی لڑکی بھی اپنا باجہ سنبھال کر ان کے قریب جا بیٹھی۔ ''ترقی پسند عوامی محاذ خطرے میں ہے۔'' سریکھا نے چپکے سے زرینہ کے کان میں کہا۔

''بھائی عامر کی حالت پہلے ہی ناگفتہ بہ ہے۔'' فیروز نے سرگوشی میں تشویش ظاہر کی۔

''اور بہن مریا گرزولی اتنی دور روم سے ڈیلی گیٹ بن کر اس لیے آئی تھیں کہ بھیا صاحب ان کو وینس کے گیت سنائیں! یا اللہ تو ہی رحم کر۔''طاعت نے جل بھن کر کہا۔

''یہ بھی تو اپنے وقت کے رڈولف ویلنٹینو ہیں۔''شیلا نے اظہار خیال کیا۔

لڑکوں نے پر چھتی پر چڑھ کر ایک اسپینش گیت شروع کیا۔

''اچھا بھئی بون نوئی۔'' کچھ دیر بعد عامر رضا نے پرال پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''بون نوئی۔''کورس ہوا۔

بارن سے باہر نکل کر وہ سیبوں کے جھنڈ میں غائب ہو گئے۔

''________؟''ایوان نے مجمعے کی طرف استفسارانہ نظریں اٹھائیں۔

''یہ مک کال صاحب ____ ایک ایسی منزل مقصود ہیں جس کی طرف بہت سی لڑکیاں سفر کر چکی ہیں یا کر رہی ہیں یا کرنا چاہتی ہیں۔''فیروز نے کھڑکی میں سے کہا۔

''ماشاءاللہ سے کس قدر پروفاؤنڈ بات کہی ہے۔''طاعت نے داد دی۔

سب نے مل کر امریکن حبشیوں کا بیلڈ شروع کر دیا:

For if you are white, you're all right;

If you are brown stick around,

But if you are black,

Oh, no! Brother, get back, get back, get

back.

گیت کی آواز دیر تک کھیتوں کے وسیع سناٹے میں گونجتی رہی، پھر سب لوگ اپنے اپنے خیموں اور کیبنوں کی طرف جانے کے لیے اٹھے۔

کوگ کیبن میں ساری لڑکیاں آ چکی تھیں اور سونے کی تیاری کر رہی تھیں۔ یہ ہندوستان کے سارے صوبوں سے آئی تھیں اور بیرسٹری پڑھ رہی تھیں اور ڈاکٹریٹ کے لیے کام کر رہی تھیں اور اخبار نویسی اور ڈاکٹری کی ٹریننگ حاصل کر رہی تھیں۔ سائنس دان تھیں اور آرٹسٹ تھیں اور رگاتی اور رناچتی تھیں اور پچھلے ایک ہفتے سے کانفرنس میں نہایت مدلل تقریریں کر رہی تھیں اور رات کو فارم ہاؤس کے باورچی خانے میں مندوبین کے لیے کھانا تیار کرتی تھیں۔ رفتہ رفتہ رات کا سناٹا آسمانوں سے اتر کر سارے میں پھیل گیا۔ وادی میں کچھ دور پر خانہ بدوشوں کا قافلہ ٹھہرا ہوا تھا۔ ساری کائنات اس برستے ہوئے احساس کے دھارے میں کہیں بہہ گئی۔

## ۶۵

اے ہمارے آسمانی باپ، ہمیں آج کے دن ہماری روزانہ کی خبریں عطا کر۔ طلعت نے کانفرنس سے لوٹ کر شہر کے اسٹیشن میں پہنچتے ہوئے آنکھیں بند کر کے دعا مانگی اور سرپٹ دفتر کی طرف دوڑی۔ آج کل وہ ایک اخبار کے دفتر میں کام کر رہی تھی۔

نیوز روم میں وہی گہما گہمی تھی۔ اس نے اپنی میز پر جا کر کاغذات کو الٹا پلٹا۔
اتنے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔

"ہلو ____ ہلو ______"

"ہاں کون ہے بھائی۔"

دوسرے سرے پر فیروز دھاڑ رہی تھی۔

"ساجدہ آپا کسی بین الاقوامی کانفرنس سے لوٹی ہیں۔ چچا نے کہا ہے فوراً اسٹوڈیو پہنچ کر ان کا انٹرویو کرو ______"

وہ سہ پہر کو اسٹوڈیوز پہنچی۔

بی بی سی کی کنٹین میں حسب معمول شور قیامت مچا تھا۔ یورپین مڈل ایسٹرن اور ایسٹرن سروسز کے لوگ اپنے اپنے دفتروں سے نکل کر لنچ کے لیے آ رہے تھے۔ ہسپانوی ' اسرائیلی عرب' ایرانی 'فرانسیسی 'ہندوستانی ' پاکستانی ________ ان سب کی عجیب وغریب برادری تھی۔ بہت سی میزیں برابر برابر لگا کر ہندوستانی اور پاکستانی کراؤڈ اکٹھا بیٹھا کرتا۔ یہ تقریباً سارے یک سارے اولڈ ٹائمرز تھے: صدیق احمد صدیقی جو علی گڑھ برادری کے جگت چچا اور اپنی ذات سے انجمن تھے' یاور عباس' اعجاز بٹالوی' تقی سید' آل حسن' عطیہ' زرینہ۔

"اور وہ وفد آ گیا جس کا انٹرویو ہے۔" طلعت نے اندر آ کر فیروز سے پوچھا۔ کنٹین میں ایک طرف کو ساجدہ آپا قناعت سے بیٹھی پیالی میں کانٹا بجا رہی تھیں۔ "اب چلو ان کا انٹرویو کرنے۔" زرینہ نے چپکے سے کہا۔

"ان کا ________ ان کا ________"

''اور وہ وفد کہاں گیا جو جانے کہاں سے ہوکر آ رہا ہے؟''

''یہی تو وفد ہیں'' زرینہ نے اس انداز سے کہا گویا اب دنیا کا کوئی رنج وغم اس پر مزید اثر نہیں کرسکتا۔

''______بس ہر وقت ہاتھ ہلا کر اور کندھے اچکاتے ہوئے طرح طرح کی شکلیں بناتے سڑکوں کے کنارے بیٹھے کافی پیتے رہتے ہیں______'' ساجدہ بیگم بیزاری سے فیروزے سے مخاطب تھیں۔

''جی ہاں______بڑے بیہودہ ہوتے ہیں۔ اب یہی دیکھئے' سڑک پر بیٹھ کر کافی پینے کی کون تک ہے۔'' زرینہ نے کامل اتفاق ظاہر کیا۔

''کون؟'' طاعت نے چپکے سے پوچھا۔

''اطالوی یا غالباً فرنچ______ان میں سے ایک قوم سے یہ بہت خفا ہیں۔'' زرینہ نے بتایا۔

''چچ چچ______پور ڈیر ز۔'' طاعت نے کہا۔

''ہش'' ساجدہ آپا نے بات ختم کی'' مجھے ہر دفعہ انگلینڈ دو۔''

اسٹوڈیو میں پہنچ کر ساجدہ بیگم مائیک کے سامنے بیٹھیں: ''جب میں میڈ رڈ میں تھی تو اہلیہ اہرن برگ سے میں نے کہا۔''

''ہش'' ساجدہ آپا نے بات ختم کی' مجھے ہر دفعہ انگلینڈ دو۔

اسٹوڈیو میں پہنچ کر ساجدہ بیگم مائیک کے سامنے بیٹھیں: ''جب میں میڈ رڈ میں تھی تو اہلیہ اہرن برگف سے میں نے کہا۔''

طاعت نے نڈھال ہوکر اسکرپٹ ایک طرف رکھ دیا۔

"دیکھو، ساجدہ آپا، گپ نہ ہانکو۔ مجھے معلوم ہے تم میڈ رڈ کبھی نہیں گئیں۔"

"چلو میڈرڈ کے بجائے اوسلو کر دو۔ فرق کیا پڑتا ہے؟" زرینہ نے اطمینان سے رائے دی۔

"اور اہلیہ اہرن برگ کون ہیں؟" فیروز نے طاعت سے مطالبہ کیا۔

"یہ اہرن برگ صاحب کے گھر میں سے ہیں ______ " زرینہ نے جواب دیا۔

"دوسری بات یہ کہ یہ میڈرڈ میں کر رہے تھے؟" فیروز نے مزید جرح کی۔ "کہاں میڈرڈ کہاں غریب اہلیہ۔"

ساجدہ بیگم نے کھسر پھسر سنی تو اسکرپٹ پر سے سر اٹھا کر ادھر متوجہ ہوئیں اور ایک لمحے کے لیے زرینہ کو دیکھ کر چونکیں کہ یہ سبز فراک میں ملبوس بلونڈ لڑکی یہاں کیا کر رہی ہے۔ پھر غالباً ان کو یاد آ گیا کہ یہ زرینہ ہے۔ "کیا پوچھنا ہے آپ کو؟"

"ہاں پیاری بہن ______ پتہ نہ مارو۔ جو پوچھنا ہے پوچھ لو۔ پھر یہ وقت ہاتھ نہ آئے گا ______ " زرینہ نے طاعت سے کہا۔

ساجدہ بیگم نے، جو مانی ہوئی زمانہ لیڈر تھیں، کہنا شروع کیا: "مجھے یہاں کا طریقہ تعلیم بہت پسند آیا۔"

"کتنی خوشی کی بات ہے۔" فیروز نے کہا۔

"ہالینڈ میں، جہاں میں ابھی گئی تھی، ہر جگہ لالہ کھلا ہوتا ہے اور لوگ لکڑی کے جوتے پہنتے ہیں۔" انہوں نے مزید انکشاف کیا۔

انٹرویو ہوتا رہا۔

چند روز بعد سنا گیا کہ ساجدہ آپا نے طلباء کی انجمن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ جب میں وطن کی نمائندگی کرنے کو پن ہاگن گئی تو ڈنمارک کی بی بی سی سے ایک تقریر کے دوران میں نے بتلایا کہ بائی دی گریس آف اللہ __________

اس کے چند روز بعد اطلاع ملی کے سید عامر رضا نے ساجدہ بیگم کو استانبول کھانے پر مدعو کیا ہے۔

یہ دعوت ساجدہ آپا کہ لیے تباہ کن ثابت ہوئی۔

## ٦٦

وقت کالے بھتنوں کی طرح آگے آگے بھاگ رہا ہے۔ اس کے لرزہ خیز سائے چاروں کھونٹ منڈلاتے ہیں۔ وقت' جو گزرر ہا ہے' آخر مجھے ختم کر دے گا۔

خداوند کی ماں مریبھا۔ جس کا دل سات بار زخمی ہوا۔ مجھ پر رحم کر۔ میرے پرانے دشمن۔ روشن سیبوں کے سائے میں چلتی رہی۔ جیرس لین میں کسی نے ٹرمپٹ پر ایک پرانی دھن بجانا شروع کر دی۔ پتھروں پر سے ندی کا پانی بہتا جا رہا تھا۔ ایک کتا ہنستا ہوا اسے عبور کر رہا تھا۔ پتلی ٹہنیوں والے درخت پانی کی سطح پر جھکے ہوئے تھے۔ ان کی چھاؤں میں ایک بُطخ تیر رہی تھی۔

وہ کواڈ رینگل میں داخ ہوئی۔

''روشن۔'' کسی نے دریچے میں آ کر اسے آواز دی۔

''روشن۔۔۔۔۔۔ اندر آؤ۔۔۔۔۔۔ کیا تم بھی اس کانفرنس سے واپس آ رہی ہو جس میں دنیا کے مستقبل کے بارے میں تجویزیں پاس کی گئی ہیں؟'' سرل نے دروازے میں آ کر کہا۔

''نہیں۔'' اس نے اپنے پیروں کو دیکھا۔ ''نہیں۔ میں محض ہیزل میئر تک گئی تھی۔''

''وہاں کیا ہے؟''

''کچھ نہیں۔''

''ڈینس نے ایک نئی نظم لکھی ہے۔''

''ہلو ڈارلنگ۔'' سریکھا نے آتش دان کے پاس سے اٹھتے ہوئے اس سے کہا۔

''تم کب آئیں۔''

''میں؟ مجھے کیمبرج مجلس نے مدعو کیا تھا۔''

''میں اپنی نئی کتاب تمہارے نام معنون کروں گا۔''

ڈینس سریکھا سے کہہ رہا تھا۔ روشن دریچے میں کھڑے ہو کر ان سب کی گفتگو سنتی رہی۔ (پھر یہ سب لوگ اٹھ کر چلے گئے۔ ان میں سے کچھ ملایا اور کوریا اور کینیا میں مارے گئے۔ کچھ کار کے حادثے میں زخمی ہو گئے یا حلق میں کینسر نکل آنے کی وجہ سے ختم ہوئے۔ چند کو اعلیٰ ملازمتیں مل گئیں۔ کچھ نے کتابیں لکھیں، شہرت پائی اور دنیا ان کے قدموں کے نیچے آ گئی۔ چند ایک یونہی رہ گئے)۔

''ہونہہ ______ خدا۔'' ڈینس کہہ رہا تھا۔

''خدا ______ '' سریکھا نے کہا۔ ''جب میں ناچتی ہوں' مجھے لگتا ہے' واقعی شیو نے تلانا کے سروں پر کائنات تخلیق کی تھی۔ وہی احساس اگر مستقل منجمد کر دیا جائے تو شاید خدا ہوگا ______ تلانا کی دھن کا احساس ______ پتا نہیں۔''

''ابھی شاید دروازے میں داخل ہوگا جس کا کوئی نام نہیں۔ دیکھو باہر ایک منحوس چاند پرانی قندیل کی طرح ڈول رہا ہے۔'' سرل نے کہا۔

''ویک اینڈ کے لیے شہر چلو گی۔ میں رات کی گاڑی سے واپس جا رہی ہوں۔'' سریکھا' روشن سے بات کرنے کے لیے دریچے کی طرف مڑی مگر روشن باہر جا چکی تھی۔

''چلو ہم سب روشن کے ساتھ ہیزل میئر چلیں۔'' سرل نے سگریٹ رول کرتے ہوئے تجویز کیا۔

''کیوں ہیزل میئر کس لیے اور کوئی جگہ کیوں نہیں؟'' مائیکل نے سوال کیا۔

''سب جگہیں ایک سی ہیں۔ کسی بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' ڈینس نے کہا۔

''لہٰذا ہیزل میئر چلو'' سب نے مل کر نعرہ لگایا۔

''روشن۔ ہم تمہارا تعاقب کر رہے ہیں۔ ہم تمہارے دشمن ہیں ہم تمہارے دوست ہیں۔'' سرل نے کہا۔

وہ رات کی مدھم روشنی میں جنگل کی طرف جانے والی سڑک پر آ گئے۔

یہ وسط گرما کی رات ہے۔ چڑیلیں اور بھتنے اور اگیا بیتال درختوں کی چھاؤں

میں دوڑتے پھر رہے ہیں۔

سندیشور؟ روشن بھاگتے بھاگتے تھک کر ایک پگڈنڈی پر بیٹھ گئی۔

تمہاری حقیقت دھندلکے میں چھپی ہے۔ عامر رضا نے انگلی اٹھا کر واضح کیا۔

میں اس کے سفر میں شامل رہوں؟ اس نے کہا اور گھاس پر بیٹھ کر غور وفکر میں ڈوب گیا۔

پہاڑیوں پر روشنیا جل رہی ہیں۔ جنگلوں میں سرخ کوٹ پہنے شکاری ویبر کی دھنیں بجا رہے ہیں۔ اتوار کے دن ہمیں ہیمپٹن کورٹ اور سرل اشلے کے محل میں داخ کیا جاتا ہے۔ مائیکل نے کہا۔

لیکن ہم بھوکے تھے لہذا اپنی کتابیں بیچ کر کھا گئے۔ اس شخص نے کہا جس کا کوئی نام نہیں۔

جنگل میں وہ سب خرگوشوں کی طرح اچھلتے پھر رہے ہیں۔ ڈینس سر کے بل کھڑا کملا کو اپنی نظم سنا رہا ہے۔ سریکھانٹ راج کے ایک انداز میں منجمد ہو گئی ہے۔ ڈلن طامس جھیل کے کنارے بیٹھے گیتا کا پاٹھ کر رہے ہیں۔

''سنو۔ کیا تمہیں بھی کسی دور کے فاصلے کی فون کال کا انتظار ہے؟'' سرل نے قریب آ کر عامر رضا سے دریافت کیا۔

''ہاں۔ نہیں ______'' عامر رضا پھر گھاس پر بیٹھ کر سوچ میں مبتلا ہو گیا۔

ہمارے خواب مختلف ہیں۔ خالص خیال خوفناک ہے۔ ٹھہرو ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ تفصیلات کی دنیا میں ہمارا صیہون کہاں ہے؟ ______ جلد بتاؤ ______ مجھے دیر ہو رہی ہے۔ اس نے ایک لخت

گھبرا کر روشن سے پوچھا۔وہ روشن کے سامنے گھاس پر جھک گیا وہ سمجھ رہا تھا کہ یہ چمپا ہے!

ہمیں دیر ہو رہی ہے _ _ _ _ _ _ _ _ _جلدی کرو _ _ _ _ _ _ جولدی _ _ _ _ _چول _ _ _ _ _

چول ____چول _____چول _____پہاڑیوں پر گھنٹیاں بجنا شروع ہو گئی ہیں۔میرے دماغ کے ویرانے میں جو ہوائیں سنسنا رہی تھیں اب وہ آندھی بن کر سارے میں پھیل گئی ہیں۔ چمپا نے کہا جو دراصل روشن تھی _______میں تمہارے تھکے ہوئے پاؤں دھوؤں گی۔تم گرم قالین پر آگ کے سامنے بیٹھے رہنا _______جلدی ___جلدی ___دیر ہو رہی ہے ____

شور میں اضافہ ہو گیا۔چلو ____چلو ____ہیزل میئر چلو _____دلی چلو ____چرچل کے گھر چلو ____دنیا بھر سے ایک ہوئے نوجوان ۔ایک آدرش مہان لیے ____خطرہ ہو بلیدان کا ________پھر بھی ہم لائیں گے سکھ چین ______لائیں گے سکھ چین _______

_____ان بستیوں کو جگمگانا ہے سدا _______ان کھیتوں کو لہلہانا ہے سدا _ _ _ _ ہم' کیا گورے کیا کالے۔سب ایک ہیں _ _ _ _ _ _ایک ہیں _ _ _ _ہم موت پر ہنسنے والے سب ایک ہیں _ _ _ _ _ _ایک ہیں ______ کہہ رہے ہیں ہم ہیں شکتی مان _____اور وشو مانتا یہ سب گان _ _ _ _ _خطرہ ہو بلیدان کا _ _ _ _ _ _خطر ہو بلیدان

کا ــــــــ جوانیاں ہیں گا رہی ــــــــ ہنسی خوشی منا رہی ــــــــ دنیا بھر سے ایک ہوئے نوجوان ــــــ نوجوان ــــــــ کاروائی تو ہو کو پاٹ بھگ رے ــــــــ بھگ کو ررے لو پاٹ ــــــــ آزاد دلی میں ہیں۔نہر وجنیوا میں ہیں۔ایشیا کا سب سے بڑا اسٹیڈیم بہاول پور میں ہے۔روشن' عامر رضا کے چکر میں ہے۔مسٹر کھنہ یہ ساری سرمایہ داری کی سازشیں ہیں۔معاشرے کی خرابیاں۔کل میں نے ایک نیا کوٹ خریدا۔دماغوں کو دھوؤ۔روحوں کو دھوؤ۔آلو کو دھوؤ۔پتیلی کو دھوؤ ــــــــ

رفتہ رفتہ بھیڑ چھٹی۔خاموشی چھا گئی۔چاند عین اوپر آ گیا۔عامر رضا نے دفعتاً ایک چھلانگ لگائی اور پھولوں کے دھندلکے میں غائب ہو گیا۔

وہ پگڈنڈی پر بیٹھی رہ گئی۔سرل اور ڈینس مائیکل دلدل کے کنارے چلتے ہوئے اس کے پاس آئے اور منہ لٹکا کر ادھر ادھر بیٹھ گئے۔

یہ ٹھنڈے اور اداس دن ــــــــ روشن نے سر اٹھا کر اس سے کہا۔

بھیگے' نم خوردہ' خوفناک دن ــــــــ سرل نے کہا۔

بھاری' گھسٹنے والے' لنگڑے' اپاہج دن ــــــــ ڈینس نے کہا۔

یوں ہماری زندگی بیتتی ہے۔انہوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

ہمارے لیے کٹھن آزمائشیں ہیں۔

تکلیفیں

دل کا رنج

ندامت

پشیمانی

وہ مگن ہیں

ہم روتے ہیں ــــــــــ

ہیزل میئر کا جنگل آہستہ آہستہ دھندلکے میں محو ہو گیا۔

## ٦٧

دن بھر بارش ہوتی رہی۔ وہ سب آگ کے سامنے بیٹھے تھے۔

''ساجدہ آپا نے قوم کو صحرائی چوہے دیکھنے کے لیے مدعو کیا ہے۔'' طاعت نے اطلاع دی۔

''صحرائی چوہے کیوں۔ صحرائی لومڑی کیوں نہیں؟'' سریکھا نے پوچھا۔

''دراصل ساجدہ آپا کو رچرڈ برٹن کی ذات سے بہت عقیدت ہے۔'' طاعت نے کہا۔

''تو پھر کرا دو ان کا انٹرویو رچرڈ برٹن صاحب سے۔ وہ تو اکثر براڈ کاسٹنگ ہاؤس آتے رہتے ہیں۔''

''دراصل ان کی شکل ایک اور بزرگ سے ملتی ہے جو اور یجنل ہیں۔''

''اوہو ــــــ یہ بات ہے۔'' فیروز نے کہا۔ پھر دفعتاً وہ چلائی۔ ''ارے یہ تو واقعی بڑی ایکٹوٹی ہو گئی۔''

اٹھا لاؤ کھنجر ، کرو قتل ہم کو

بڑی دیر سے موڑی جھکائے ہوئے ہیں

طاعت نے کہا۔ (یہ قدیر کا پسندیدہ شعر تھا)۔

"یہ بات ہے تو آؤ میدان میں۔" بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی جگہ ہڑبڑا کر فیروز نے کہا: "السلام علیکم لائیے میم کا۔"

اشعار کس کو یاد تھے لہٰذا پہلے غلط پڑھے گئے، پھر حسب ضرورت ان میں ترمیم کی گئی۔ نہ کر ہم نشین بے وقوفی کی باتیں۔ میں بھولا نہیں ہوں وقوفی کی باتیں۔ خود شعر گھڑے گئے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کی فلمی گانوں کے بول نہایت بے تکلفی سے استعمال کیے جانے لگے۔ "یاد رکھنا چاند تاروں اس سہانی رات کو۔ لاؤ واؤ کا۔" طاعت نے کہا۔

"واہ، کٹ کٹ کر رہی ہیں مرغیاں۔" کملا نے کہا۔

"یہ فاؤل ہے۔" طاعت دہاڑ۔

"ہرگز نہیں۔"

"اٹھو ورنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا۔"

"طاعت نے میز پر مکہ مارا۔"

"آہ کٹ کٹ کر رہی ہیں مرغیاں۔" کملا نے گرج کر جواب دیا۔

جب دوبارہ کملا کی باری آئی تو اس نے اطمینان سے جواب دیا: "ہائے کٹ کٹ کر رہی ہیں مرغیاں۔"

"یہ سب ہو چکا ہے۔" طاعت چلائی۔

"یہ دوسری مرغیاں ہیں۔" کملا نے اطمینان سے جواب دیا۔

دوسرے روز ساجدہ آپا نے طلعت کو ویمنز پریس کلب میں فون کیا۔

''سنو ساجدہ بہن۔ میں صحرائی چوہے دیکھنے سے معذور ہوں۔ میرا سارا دن تو بہت سے اصلی چوہے دیکھنے میں گزر جاتا ہے۔''طلعت نے کہا۔

''نہیں۔ مجھے تم سے رائے لینا ہے۔ ایک نہایت ضروری بات ہے۔''

''اچھا تم سیدھی یہیں آجاؤ اور لنچ بھی یہیں کھاؤ۔ طلعت نے زور سے ریسیور رٖنخ دیا۔ شہر کی ان محبت زدہ خواتین نے اور جان آفت میں کررکھی تھی۔''

آدھ گھنٹے بعد ساجدہ بیگم کھانے کی چھوٹی میز پر طلعت کے سامنے بیٹھی تھیں۔ وہ اینچیوں کی طرح ساجدہ بیگم کو دیکھا کی۔

''کل میں عامر رضا سے ملی۔''انہوں نے کہنا شروع کیا۔

''یہ چوزے کی سرائے کا ذکر ہے جہاں آپ بی بی سی والوں کے ساتھ گئی تھیں؟''طلعت نے دریافت کیا۔

''نہیں۔ ہم دونوں استانبول میں کھانا کھا رہے تھے۔''

''اوہ۔''

''اور پھر انہوں نے بتایا۔''

انہوں نے بتایا کہ وہ مجھ سے کتنا گھبراتے ہیں؟ کہ وہ سائے کی تلاش میں ساری دنیا میں گھومتے ہیں۔ جہاں سایہ ملا وہیں بیٹھ گئے۔ یہ تیز دھوپ ان کی آنکھوں کو بری لگتی ہے؟

''ہاں کہا تو تھا۔ بالکل یہی کہا تھا انہوں نے۔''

''خدایا ______ لو یہ گوبھی کھاؤ۔''بلعت نے پلیٹ ان کی طرف سرکائی۔

''میرا خیال ہے اس ملک کے بارے میں جو میرے تاثرات ہیں ان پر ایک افسانہ لکھوں''ساجدہ بیگم نے سوچ کر کہا۔

''ضرور ______ اس سے عمدہ بات کیا ہوسکتی ہے!''طاعت نے ویٹر س کو بلانے کا اشارہ کیا۔''کافی لوگی ساجدہ''اس نے اونگھتی آواز میں پوچھا'یا آئس کریم؟

برابر کی میزوں پر برطانیہ کی مشہور اخبار و نولیس خواتین ٹوپیوں کے تازہ ترین فیشنوں پر تبادلہ خیالات کررہی تھیں۔

طاعت اداسی سے ساجدہ بیگم کو دیکھتی رہی۔اس کا جی چاہا کہ دھاڑیں مار مار کر روئے۔

## ۶۸

چمپا نے نرگیش کے کمرے میں آکر نظر ڈالی۔'مانوس کمرہ۔صوفہ۔ تصویریں۔نیلے پھول۔میرے لیے ایک ساری نکال دینا۔نرگیش نے غسل خانے میں سے آواز دی۔دوسرے کمرے میں شاہ نتا ایک ہی ریکارڈ بار بار بجائے جارہی تھی۔اسی روز اس کی ایک نئی کتاب چھپ کر آئی تھی۔بل نیچے کورٹ یارڈ میں گلشن کے ساتھ ٹہل رہا تھا۔چمپا نے الماری کھولی۔ایوننگ گاؤں اور ساریاں اور جوتے اور بیگ۔ایک تختے پر ہاتھی دانت کا ایک چھوٹا سا مندر تھا جس میں ایک ننھا سا بت رکھا تھا۔

پارسی کس کا بت پوجتے ہیں؟ وہ سوچتی رہی یا شاید زرتشت یا جانے کیا۔ اسے پارسی مذہب سے واقفیت نہ تھی۔ اسے کسی مذہب سے واقفیت نہیں تھی۔ ہم سب کے نہاں خانوں میں ایک چھوٹا سا شرائن ہے۔ جس میں ایک گمنام بت رکھا ہے۔ اس بت کا نام مجھے معلوم نہیں۔ یسوع۔ سینٹ طامس۔ کرشنا نارائن۔ زرتشت۔ یہ بت آخر وقت تک گمنام رہے گا۔ انت سے جب انسان کی آنکھیں آخری بار ہمیشہ کے لیے بند ہونے لگتی ہیں' اس وقت اسے جانے کیا نظر آتا ہے' وہ گمنام بت کون سی شکل اختیار کرتا ہے ——— یہ کسے معلوم۔

شانتا نے اندر آ کر نرگیش کے لیے ایک سرخ ساری نکالی۔ "الماری بند کر دو۔ الماری بند کر دو۔" چمپا نے با آواز بلند کہا۔

"ہیں؟" شانتا نے کمرے میں آ کر پوچھا۔ "کس سے کہہ رہی ہو۔"

"کچھ نہیں میں سوچ رہی تھی کہ دن میں کتنی بار نرگیش یہ الماری کھولتی ہے۔"

"ہاں؟" شانتا بالکل نہ سمجھی۔

"اور اس میں سے رنگ برنگے کپڑے نکلتے ہیں۔"

"ہاں۔ ہاں ——— تو؟"

"اور نیلی گھاس کا عطر۔ اور پیرس کی ٹوپیاں۔" چمپا کہتی رہی۔ "اس کا بت شرائن میں رکھا رہتا ہے اس کونے میں۔ اس نے یہ الماری بنائی اور اب اسی میں چھپا بیٹھا ہے۔ تمہاری الماری بھی کوئی بت ہے؟"

"میری الماری میں ڈھانچے ہیں" شانتا آتشدان کے قریب آ کر بیٹھ گئی اور اسے غور سے دیکھنے لگی۔ "تم ———" اس نے کہا ——— تم تھوڑی

سی دیوانی ہو۔

''ہاں۔تم نہیں ہو؟''

''تمہاری باتیں معرفت کی حدوں کو چھو رہی ہیں۔اس طرف مت جانا۔بڑی افسوسناک بات ہوگی۔''شانت نے جواب دیا۔

سریکھا سفید ساری پہنے' بال تولیے میں لپیٹے باہر آئی اور دریچے میں کھڑی ہو کر ٹیرس گارڈن کو دیکھنے لگی۔باہر' جدھر پھول ہی پھول تھے اور بہار کا روشن آفتاب جگمگا رہا تھا۔

''زندگی ______ زندگی''سریکھا نے خوشی کا گہرا سانس لے کر ہوا میں بازو پھیلائے۔

''سریکھا میرے لیے زندگی کی علامت ہے۔بشاش۔رقصاں۔تم علامتوں کی رمزیت کی قائل ہو؟''

چمپا نے مڑ کر شانتا سے پوچھا۔

شانتا آتشدان میں بجلی کے مصنوعی سرخ انگاروں کو دیکھا کی۔

زندگی میرے سامنے بھی کھڑی ہے۔ سفید ساری میں ملبوس۔ ہنستی' گنگناتی' خوفزدہ' نڈر' باہمت' بزدل' ہر لفظ کے دو مختلف متضاد معنی ہیں۔زندگی ۔اس نے شانتا کو دیکھا۔میں نے ایک مرتبہ گوتم سے کہا تھا ______ میں اور تم' ہمیشہ مختلف رہیں گے۔

کئی سال قبل گلفشاں کے باورچی خانے میں ترکاری بناتے ہوئے' طلعت نے کہا تھا۔چمپا باجی گوتم ہر وقت ہر چیز کا تجزیہ کرنے پر تلا رہتا ہے۔اس بات

بے خبر اور رہے گا۔ وہ کسی کو بخشنے والا نہیں چاہے آپ ہی کیوں نہ ہوں۔

''مجھے ایسے لوگوں سے سخت چڑ ہے جو بات بے بات' ہر فقرے' ہر لفظ' ہر لکھے ہوئے جملے میں نفسیاتی الجھنوں کے اشارے تلاش کرتے ہیں۔ لاحول ولا۔'' اس نے جواب دیا تھا۔''

''گوتم بھی یہی سب کرتا ہے؟'' نرملا نے تجاہل عارفانہ سے پوچھا تھا۔

''بالکل'' طلعت نے جواب دیا تھا۔

''تب تو گوتم بہت برا آدمی ہے۔ ہم اسے منع کر دیں گے کہ لوگوں کی باتوں میں نفسیاتی الجھنوں کے اشارے نہ تلاش کیا کرے' خصوصاً آپ کی باتوں میں۔'' نرملا نے کہا تھا۔ یہ لڑکیاں اب صریحاً بدتمیزی پر اتر آئی تھیں۔ نرملا مجھ سے جلتی ہے ـــــ کس قدر واہیات بات ـــــ تہمینہ کی طرح ـــــ لا حول ولا ـــــ میری باتوں سے اسے مطلب! اس نے غصے سے سرخ ہو کر با آواز بلند کہا تین چار بار تو اس سے ملاقات ہی ہوئی ہے۔ دوسرے لمحے اس نے اپنے غصے کو چھپا کر گفتگو کو مزاحی رنگ دینا چاہا: ''اور وہاں اس نے باتوں کو ایسی ٹو چھوڑ رکھی تھی کہ کسی کو بولنے ہی نہ دے۔ ہر سوال کا جواب اسے آتا ہے' ہر علم میں وہ ماہر ہے۔ توبہ۔ آدمی نہ ہوا راکھشش ہو گیا' دس سر والا۔''

''ہے ـــــ ہے ـــــ '' تہمینہ نے بڑی مہارت سے پیٹر کاٹتے ہوئے باورچی خانے دوسرے کونے سے کہا تھا' گوتم نے تم پر بہت رعب ڈالا ہے اور آ گئیں تم اس کے رعب میں۔''

''میں نہیں آئی اس کے رعب میں۔'' اس نے بگڑ کر کہا اور اس کی آنکھوں میں

آنسو آ گئے اور وہ جلدی سے پیازوں کے ڈھیر پر جھک گئی۔

''پھر اس کا اس قدر لمبا چوڑا ذکر کیوں ض کر رہی ہو؟ ہم لوگ تو بے چارے گوتم کو ایسا قابل ذکر نہیں سمجھتے۔نہ راکھشش نہ دیوتا۔تم نے اس چکر میں چاء بھی ٹھنڈی کر دی۔اے لو مصالحہ جلا جا رہا ہے۔بھن گیا مصالحہ' لے اب گوشت ڈال دو بی طاعت۔''

آوازیں ماضی کے آبشار کے شور میں ڈوب گئیں۔یہ نرگیش کا فلیٹ تھا اور سر یکھا پھولوں میں کھڑی بال سکھا رہی تھی اور شانتا صوفے پر ٹانگیں رکھے بیٹھی تھی۔ چہرے وہی تھے' ماسک نئے تھے۔

''گوتم اب تک سرکولیشن میں ہے۔'' شانتا نے باواز بلند پوچھا۔

کیا؟ وہ چونکی

میرا مطلب ہے'' شانتا نے سگریٹ جلاتے ہوئے اس طرح پوچھا گویا چمپا ایک کھلی کتاب کی طرح سامنے رکھی تھی جسے وہ پچھلے چند منٹوں سے پڑھ رہی تھی'''

وہ اب بھی سرکولیشن میں ہے یا اسے لائبریری کے بک شیلف پر واپس رکھ دیا گیا۔

''پتا نہیں۔''

''تمہاری ممبر شپ کی میعاد ختم ہو چکی؟''

شانتا کریگ علاوہ مغرور ہونے کے' کمینی بھی تھی۔

''یہی سوال غالباً میں تم سے کر سکتی ہوں۔''

شانتا اداسی سے مسکرائی ______ اس کا پرغرور تبسم' اس کا انداز' اس کا طرز لباس ______ چمپا کس دھیان سے ان دنوں اس کی تقلید میں مصروف تھی۔

خوبصورت، کامیاب، ہردلعزیز، کریرومن ۔وہ بھی شانتا نیلمبر کی طرح کیوں نہیں بن سکتی؟ شانتا نے اطمینان سے اسے دیکھا: ''میں اس کے الوژن تباہ نہیں کرنا چاہتی تھی ۔مصیبت یہ ہے کہ وہ شاعر ہے ۔''

''واقعی یہ مجھے معلوم نہ تھا۔'' چمپا نے طنز سے کہا۔

''تمہیں یہ معلوم نہیں ہوسکتا۔تم خود اپنے تصورات میں ضرورت سے زیادہ مبتلا ہو۔آدمی قربانی چاہتے ہیں بغیر اپنی قربانی دیئے ۔تم ان کو حاصل نہیں کرسکتیں ۔تم پیرس سے یہاں کیوں آگئیں' اپنا اکیڈیمک سال ادھورا چھوڑ کر؟ اس لیے کہ وہ یہاں ہے ۔''

''بکومت ـــــ یہ تم سے کس نے کہہ دیا؟'' چمپا کو بے حد غصہ آیا۔ اب وہ اپنی مزید توہین نہیں کروائے گی ۔

''لیکن یہ جنگلی بطخ کا تعاقب ہے'' شانتا اپنی سریلی آواز میں کہتی رہی ۔(وہ احمد آباد اور بمبئی سے مرہٹی گانے براڈ کاسٹ کیا کرتی تھی )۔

''تم افسانہ نگار ہونا اسی لیے میرے متعلق تم نے اپنے تخیل کو بے لگام چھوڑ رکھا ہے ۔''

''ـــــــ اب بل تم کو بلڈ اپ کرنا چاہتا ہے ۔'' شانتا نے اپنی سریلی آواز میں بات ختم کی اور پھر اطمینان سے آتش دان پر رکھی ہوئی تصویروں کو دیکھنے لگی ۔

تہمینہ رضا' نرملا سریواستوا' شانتا کریگ ۔

''چھا' یہ بات ہے ۔'' چمپا نے اپنا کوٹ اور دستانے اٹھائے ۔''میں قابل

نفرت ہوں ۔ میں قابل نفرت ہوں۔ اچھا بھئی اب چلا جائے۔
نرگیش______سریکھا______شانتا____خدا حافظ۔"

"کل دفتر آؤ تو وہ نیلی اون لیتی آنا جو ہم لوگوں نے اس دکان پر دیکھی تھی۔
"شانتا نے اسی اطمینان سے کہا۔

"میں شاید کل دفتر نہ آؤں۔" دروازے تک پہنچ کر اس نے دوبارہ پلٹ کر کہا۔ "کل کیا معنی، میں شاید کبھی تمہارے دفتر نہ آؤں۔ زشب بخیر______"

باہر چیلسی کی سڑک پر آ کر اس نے دیکھا مکانوں کے دریچے بارش کے سہانے دھند لکے میں چھپ گئے تھے۔ نکڑ کی بوڑھی عورت، جو پھول بیچتی تھی، بارش سے بچنے کے لیے برساتی اوڑھے، کرسی پر، دیوار کی طرف منہ کیے بیٹھی جانے کیا سوچ رہی تھی۔ دریچوں میں سے موسیقی کی آواز آ رہی تھی۔ وہ اپنے گھر پہنچی جو بہت دور مضافات میں تھا۔ اپنے کمرے کی دہلیز میں اسے سرل کا خط ملا۔ اس نے لکھا تھا: "نیو ہم میں تمہارا داخلہ ہو گیا ہے۔ ستمبر میں تم یہاں آ رہی ہو۔ یہ گرمیوں کے چند مہینے کسی اداس اور رومینٹک اطالوی یا ہسپانوی شہر میں گزار آؤ۔ میں شمال جا رہا۔ روز ماری بیمار ہے۔"

روز ماری؟؟

## ۶۹

کوہ نور کی ایک میز پر، جو دریچے کے پاس بچھی تھی، گوتم، نرملا کے مقابل

بیٹھا باہر برستی ہوئی بارش کو دیکھتا رہا۔لڑکوں اور لڑکیوں کی ٹولیاں آ آ کر بیٹھ رہی تھیں یا اٹھ اٹھ کر باہر جا رہی تھیں۔کمال معاف کرنا' کہہ کر کسی دوست سے بات کرنے کے لیے ایک دوسری میز کی طرف جا چکا تھا اور بڑے جوش وخروشد سے کسی بحث میں مصروف تھا جس میں بار بار ماؤ اور پیپلز چائنا کا نام دہرایا جا رہا تھا۔ گوتم نے اداس سی مسکراہٹ کے ساتھ اس پر نظر ڈالی۔

''کمال کتنا پیارا لڑکا ہے۔'' اس نے کہا۔

''ہاں۔کمن بھیا کے ہونے سے مجھے یہی لگتا ہے کہ بھین یہاں موجود ہیں۔ اگر کمن بھیا اور طلعت نہ آ رہے ہوتے تو اماں مجھے ہرگز اکیلا ولایت نہ بھیجتیں۔'' نرملا نے کہا۔

''تم نے مجھے جو باتیں چمپا کے متعلق بتائیں مجھے سن کر بڑا دکھ ہوا____'' گوتم نے کہا۔وہ ابھی تک چمپا کے متعلق سوچ رہا تھا۔نرملا نے اپنے آنسو پینے کی کوشش کی۔چند منٹ قبل اس شخص نے پروپوز کیا تھا______وہ چپ بیٹھی رہی۔

''تم سب نے'ہم سب نے ان کے ساتھ انصاف نہیں برتا۔ہم نے ان کو برا بر غلط سمجھا ہے____ مثال کے طور پر____'' اس نے ذرا جوش سے دہرایا اور کانٹا اٹھا کر نرملا کو سمجھانا شروع کیا'' انہوں نے کبھی بھیا صاحب کو اپنے سے'یعنی کہ'چھیننا نہیں چاہا تھا۔''

''بہر حال'میرا خیال ہے اب ہم چمپا باجی پر مزید بحث نہیں کریں گے۔'' نرملا نے کہا اور مصروف نظر آنے کے لیے بیگ میں کوئی چیز تلاش کرنے لگی۔

''تمہارے نزدیک چمپا باجی مکمل ہیں مگر شاید تم بھولتے ہو کہ ہم چمپا باجی کو اپنے بچپنے سے جانتے ہیں۔''

''یہ بچپنے سے جاننے کی دھونس اچھی ہے!'' گوتم نے کہا۔ ''تمہارے یہاں ہر سے بچپنے کا راگ کیوں الاپا جاتا ہے۔ جو لوگ تم کو یا چمپا احمد کو بچپنے سے نہیں جانتے' وہ گدھے ہیں؟''

اب گوتم پر چاروں طرف سے بڑی تیز روشنی پڑ رہی تھی جس طرح وہ خود گوتم کے سامنے تیز روشنی کی زد میں تھی لیکن دیکھو کیا ہوا کہ گوتم نے ہاتھ بڑھا کر دفعتا سوئچ بند کر دیا۔

گوتم: انسانی کردار کا بے رحم نقاد' دیانت کا گرو' چمپا جیسی فراڈ کو مکمل سمجھتا ہے۔ بھگوان تیری لیلا نیاری ہے۔ لیکن وہ کہہ رہا تھا:

''نرمل۔ میں تمہاری غلط فہمی دور کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے چمپا سے کیا مطلب ! میں بہت پھٹیچر ہوں' تم نے ٹھیک کہا' مگر میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''نعم البدل؟ نہیں' سوری گوتم۔''

''نرمل ــ ــ ــ ــ ــ ــ مجھے سمجھنے کی کوشش کرو ـــــــ او نرمل ـــــــ '' اب وہ پھر اندھیرے میں چلا گیا۔ وہ بہت قابل رحم تھا۔ اسکول کے لڑکوں کی مانند۔ کون کہتا ہے مرد سمجھ دار ہوتے ہیں۔ ارے ان سے زیادہ مورکھ کون ہوگا۔ میز پر بیٹھے بیٹھے نرملا کو احساس ہوا۔ وہ بیل کی طرح' درختوں کی طرح' بیرومیٹر کے پارے کی طرح اونچی ہوتی جا رہی ہے۔ اس میں گیان آ رہا ہے۔ اب مصنوعی روشنیاں بجھا کر وہ بھی اس اندھیرے میں چلی جائے

گی جو سب کیفیتوں سے اتم ہے۔اس میں بیٹھی وہ باہر جھانکا کرے گی۔اب وہ سلیمانی ٹوپی پہن لے گی جس کی کہانی بچپن میں اسے گلفشاں کے شاگرد پیشے میں قدیر ڈرائیور نے سنائی تھی۔

یہ سلیمانی ٹوپی ہر ایک کو دستیاب تھوڑا ہی ہوتی ہے۔میں تمہاری شکرگزار رہوں شری نیلمبر' کہ تم نے میرے بڑے ہونے میں میری مدد کی اور سلیمانی ٹوپی پہننے کا راستہ دکھایا۔کاش میں تم سے بیاہ کر سکتی۔مگر مجھ میں بہت زیادہ گیان آ گیا ہے ______ چمپا احمد کی پرستش کیے جاؤ گوتم جی۔شاید تم کو بھی راہ نجات مل جائے۔

اسی رات نرملا کی ایکسرے رپورٹ میں معلوم ہوا کہ اسے پھیپھڑوں کی دق ہے۔

اختتام ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ حصہ دوئم

آگ کا دریا
جلد دوئم
قرۃ العین حیدر
KURF
FlamingText.com
جامعہ کراچی دارالتحقیق برائے علم دانش